جلد ۲ — رجسٹری شدہ سرکار عالی نمبر ۴ — نمبر ۱

شہریور ۱۳۳۶ ف

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

دائرہ ادارت :۔

سید علی اکبر۔ ایم۔ اے۔ (کنٹب) مدیر مسئول

سید فخر الحسن۔ ملا۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر

عبد النور صدیقی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتمم تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۳ روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
۲۔ " " " ۱۲ر علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (")
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہوا کرے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	۳ر	سے
نصف صفحہ	ـہ	۱۲ر	۸ر
ربع صفحہ	۸ر	۶ر	۱۲ر
	۱۰ر	۸ر	۶ر

فہرست مضامین

جلد ۳ بابتہ ماہ شہریور ۱۳۳۷ف م جولائی ۱۹۲۸ء نمبر ۱

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	نظم فارسی "مادر و بچہ" از ایرج میرزا جلال الممالک مع تصویر	ترجمہ مولوی ابوالمحاسن محسن خانصاحب منتین مددگار مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج	
۲	شذرات	———	۱
۳	روداد کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ منعقدہ ۲۶ شہریور ۱۳۳۷ف	"	۲
۴	کارگزاری انجمن اساتذہ بابتہ ۱۳۳۵ف تا امرداد ۱۳۳۶ف	مولوی سید محمد شریف مشہدی معتمد عمومی انجمن بلدہ	۱۳
۵	افتتاحیہ تقریر	ہز ایکسلنسی جی الیجنٹ مہاراجہ ابایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی۔سی۔آئی۔ای، صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی	۱۷
۶	خطبہ صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن) معتمد سیاسیات	ترجمہ مولوی اللہ بخش صاحب فوقانیہ دار العلوم بلدہ	۱۹
۷	ڈنمارک میں تعلیم بالغان	مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے (آکسن) ناظم تعلیمات	۳۰
۸	فرائض مدرسین	مولوی حسام الدین صاحب مولوی فاضل مددگار مدرسہ فوقانیہ دار العلوم	۴۶
۹	مدارس میں اردو کی تعلیم	مولوی ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج	۵۱
۱۰	دور مسعود	مولوی غلام محمود صاحب ناظر مدارس	۵۹
۱۱	جلسہ الوداعی نواب مسعود جنگ بہادر	———	۶۴
	(ا) تقریر سر یمین السلطنت بہادر	"	۶۹
	(ب) سپاسنامہ	"	۶۶
	(ج) جواب سپاسنامہ	"	۶۹
۱۲	نمایش تعلیمی متعلقہ کانفرنس انجمن اساتذہ بلدہ بابت ۱۳۳۷ف	نظیر حسین شریف معتمد سب کمیٹی نمایش تعلیمی۔	۷۲

"مادر و بچہ"

فارسی نظم

گویند مرا چوں زاد مادر
پستاں بدہن گرفتن آموخت
شبہا بر گاہوارۂ من
بیدار نشست وخفتن آموخت
لبخند نہاد بر لب من
بر غنچۂ گل شگفتن آموخت
دستم بگرفت و پا بپا برد
تا شیوۂ راہ رفتن آموخت
یک حرف و دو حرف بر دہانم
الفاظ نہاد گفتن آموخت
پس ہستی من ز ہستی اوست
تا ہستم وہست دارمش دوست

ایرج میرزا جلال الممالک

"ماں اور بچّہ"

منظوم ترجمہ

بیاں کرتے ہیں جب تولد ہوا میں
مجھے دودھ اماں نے پینا سکھایا
وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے جھولے میں مجھکو
جھلاتی رہیں اور سونا سکھایا
بڑے پیار سے چوم کر میرے لب کو
مثال گل و غنچہ ہنسنا سکھایا
مرا ہاتھ تھامے ہوئے ہر قدم پہ
سہارے سے یوں پاؤں چلنا سکھایا
ہے احسان اُن کا اک اک حرف کر کے
یونہی باتوں باتوں میں کہنا سکھایا
ہوئی زیست حاصل اُنہیں کی بدولت
رکھوں گا میں اُن سے ہمیشہ محبت

ابوالمحاسن محسن خاں صاحب تسکین

مادر و بچہ

ضمیمہ حیدرآباد ٹیچر

مولوی وحیدالدین صاحب سلیم پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا انتقال جو پچھلے ہفتہ ہوا' دنیائے ادب میں ایک عظیم حادثہ ہے۔ مرحوم نے جو گراں مایہ خدمات علمی انجام دی ہیں وہ یادگار رہیں گی۔ وضع اصطلاحات کا معرکتہ الآرا مسئلہ آپ نے حسن خوبی سے سلجھایا اور ایک مستقل تالیف پیش کرکے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب کردئے۔ اردو ادب کی جو کچھ خدمت آپ نے کی ہے وہ ہمیشہ نہایت احسان و احترام کی نظر سے دیکھی جائے گی جو بقائے دوام حاصل کرنے کے لئے کم نہیں ہے۔

دنیا ایک اور عظیم الشان ہستی سے خالی ہو چکی ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی سی۔ آئی۔ ای۔ مصنف "اسپرٹ آف اسلام" نے ۹، سال کے سن میں موضع برکشائر (انگلستان) میں انتقال کیا۔

مرحوم کی زبردست شخصیت بحیثیت ادیب' ماہر قانون اور مورخ کے مسلمانوں کے لئے مائہ صد فخر و ناز تھی۔ اُن کا علم و فضل ان کی زندگی ہی میں تمام یورپ سے خراج تحسین حاصل کرچکا تھا اور اس کے اعتراف میں آپ کو کئی یونیورسٹیوں نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی تھی اس قحط الرجال کے زمانے میں آپ کی ہستی مسلمانوں کے لئے بہت ہی غنیمت اور تقویت کا باعث تھی۔ مرحوم کے زرین کارنامے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

آل انڈیا ٹیچرس فیڈریشن کانپور کی تحریک پر انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد دکن کے الحاق کی منظوری سرکار عالی سے دی گئی ہے۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ حیدرآباد دکن کی

دوسری سالانہ کانفرنس

منعقدہ ۶ و ۷ شہریور ۱۳۳۷ف

پہلا جلسہ۔

انجمن مذکور کا دوسرا سالانہ اجلاس زیر صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن) معتمد سیاسیات ممالک محروسہ سرکار عالی سٹی کالج کی عمارت میں ۶ و ۷ شہریور ۱۳۳۷ف کو منعقد ہوا۔ دستور کے موافق کانفرنس کے ساتھ تعلیمی نمایش کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر۔ صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے نمایش تعلیمی اور کانفرنس کا افتتاح فرماکر شرکائے انجمن کو ممتاز و مفتخر فرمایا۔

جلسہ کی کارروائی قرأت اور بھجن سے شروع ہوئی۔ ریورنڈ ایف۔ سی۔ فلپ ایم اے صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں انجمن کی مساعی اور مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جس قدر بھی اہم اغراض اس سے متعلق تھے اُن میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ مدرسین میں اتحاد بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ورزش جسمانی پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے بازی گاہ کا انتظام اور تدابیر حفظ ماتقدم ناگزیر ہیں۔ معلمین کی حیثیت جو عوام کی نظر میں کسی قدر گری ہوئی سمجھی جاتی تھی اب باوقعت سمجھی جانے لگی ہے۔ اختتام پر انھوں نے ہز اکسلنسی مہاراجہ بہادر کا جن کی رونق افروزی نے اراکین انجمن کے کام میں ایک نئی روح پھونک دی تھی پُر تپاک الفاظ میں خیر مقدم ادا کیا۔

مسٹر سید علی اکبر ایم۔ اے کینٹب نے انجمن کی کارگزاری کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہا کہ انجمن ہذا کا قیام محض نواب مسعود جنگ بہادر کی مساعی اور دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

نواب صاحب ممدوح کی بدولت مدرسی باوقعت اور بہترین پیشہ تصور کیا جارہا ہے ایسی متعدد نظیریں ملیں گی کہ وہ امیدوار جنہیں اور سررشتوں میں ملازمت مل سکتی ہے۔ تعلیمات کی ملازمت کے لئے نہ صرف خواہش مند بلکہ عرض مند ہیں۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ نواب صاحب کی جدائی کا اراکین انجمن کو سخت صدمہ ہے وہ موصوف کی ہمدردی، انصاف پسندی اور اخلاق کو کبھی نہ بھولیں گے۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ سر یمین السلطنت بالقابہم کی کانفرنس میں تشریف آوری اراکین انجمن کے لئے باعث صد فخر و ناز ہے مہاراجہ بہادر کو تعلیم سے جیسی گہری دلچسپی ہے اس کی نظیر تاریخ دکن میں شاید ہی ملے۔

اس کے بعد ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر تالیوں کی آواز کے درمیان اپنی افتتاحی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے دوران تقریر میں انجمن اساتذہ کے کام پر اطمینان ظاہر فرماتے ہوئے نواب مسعود جنگ بہادر کے عہد میں جو تعلیمی ترقی ملک میں ہوئی اس کا ذکر فرمایا۔ ہم کسی اور جگہ سر یمین السلطنت بالقابہم کی تقریر بجنسہ شائع کرتے ہیں اس کے بعد ہی نواب مہدی یار جنگ بہادر نے انگریزی میں صدارتی تقریر فرمائی، جس کا ترجمہ کسی اور جگہ درج ہے۔ ہز اکسلنسی مہاراجہ بہادر کے شکریہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے نواب مسعود جنگ بہادر نے فرمایا کہ مہاراجہ بہادر ان کی تجاویز کو عاجلانہ شرف قبولیت بخشتے اور ان کی ہر طرح ہمت افزائی فرماتے رہے۔ آپ نے فرمایا کہ ملک کی یہ خوش قسمتی ہے کہ مہاراجہ جیسی شخصیت کے ہاتھ میں اس وقت عنان حکومت ہے جن کی ممتاز شخصیت نہ صرف اپنی ذاتی قابلیت تک محدود ہے بلکہ آپ کی داد و دہش اور علم پروری شہرۂ آفاق ہے۔ نواب صدر اعظم بہادر کے اجلاس سے رخصت ہونے کے بعد مسٹر محمد اعظم۔ ایم۔ اے، بی۔ ایس۔ سی۔ پرنسپال سٹی کالج نے یہ تجویز پیش کی کہ انجمن کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ اس فرق کو جو فوقانی تعلیم میں عثمانیہ اور اسکول لیونگ

سارٹیفکٹ کے نام سے جاری ہے اٹھا دیا جائے اور اس امر کی کوشش کی جائے کہ یہ دو مختلف نظام تعلیم مل کر ایک ہو جائیں دوران تقریر میں مسٹر اعظم نے فرمایا کہ مالی اعتبار سے یہ دو مختلف نظام تعلیم غیر مناسب اور انتظام تعلیم کے نقطہ نظر سے بھی قابل اعتراض ہیں اس میں شک نہیں کہ جب تک نظام کالج کا وجود باقی ہے اُس وقت تک اس کے امداد کے لئے چند مدرسوں کی ضرورت رہے گی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عثمانیہ میٹریکولیشن کی تعلیم، اسکول لیونگ سرٹیفکٹ سے بالکل علیحدہ رکھی جائے البتہ یہ ممکن ہے کہ غور فکر کرکے ایک ایسا نصاب تعلیم مقرر کیا جائے جو نظام کالج اور عثمانیہ کالج دونوں کی ضروریات کو پورا کرے بعض مدرسوں کے لئے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم باقی رکھنا ضروری ہو گا لیکن طلبہ کی اکثریت کا لحاظ کرتے ہوئے عام طور پر اردو ہی کو ذریعہ تعلیم گردانا جائے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مدراس یونیورسٹی نے آمادگی ظاہر کی تھی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اس کا نصاب تعلیم تین سال پر مشتمل ہو۔ فوقانی تعلیم میں ایک سال کا اضافہ، مدرسہ کی تعلیم کی پوری مدت تین بغیر کسی توسیع کے ممکن ہے۔ آپ کی رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ امتحان وسطانیہ موقوف کیا جائے خصوصاً اُن طلبہ کے لئے جو مدارس فوقانیہ میں تعلیم پانے کا ارادہ رکھتے ہیں اگر ایسا کیا جائے تو فوقانی تعلیم کے ابتدائی حصہ کے لئے چار سال اچھی طرح کفایت کریں گے۔ آخر میں آپ نے مشورۃً کہا کہ جو تجویز دو مختلف نظام تعلیم کو ایک کرنے کے لئے پیش کی گئی ہے اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک بورڈ جس کا نام عثمانیہ ہائی اسکول لیونگ سارٹیفکٹ بورڈ ہو ترتیب دیا جائے جس کے اراکین جامعہ عثمانیہ، نظام کالج، سررشتہ تعلیمات اور عوام سے منتخب کئے جائیں۔ اس تجویز کی تائید مولوی غلام محمود صاحب سابق صدر مدرس ستعد پورہ نے اردو میں کی جس کے بعد ایک خوش گوار مباحثہ چھڑ گیا۔ مولوی محمد سلطان صاحب مددگار مدرسۂ فوقانیہ نام پلی اور مولوی عبدالسلام صاحب

معتمد انجمن اساتذہ گلبرگہ نے مخالفت کی۔ اوّل الذکر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مجوزہ
مشترک نظام تعلیم سے عثمانیہ یونیورسٹی پر بُرا اثر پڑے گا دوسرے صاحب نے
کہا کہ بظاہر کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہم خواہ مخواہ مدراس یونیورسٹی کے
غلام بنے رہیں۔ مولوی عبدالمجید صاحب اور مولوی سید محمد شریف صاحب شہابی نے بھی
اس بحث پر تقریر کی۔ مسٹر سید علی اکبر نے نہایت گرم جوشی سے تائید کی اور بتلایا کہ
مولوی محمد سلطان صاحب اور مولوی عبدالسلام صاحب کو اس مجوزہ مشترکہ نظام تعلیم سے
جو اندیشہ پیدا ہوا ہے وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے' جو انہیں اس تجویز سے پیدا ہوا ہے
تجویز کا منشاء اردو کو بجائے انگریزی ان طلبہ کے لئے ذریعۂ تعلیم قرار دینا ہے جن کی
زبان اُردو ہے اور جو نظام کالج یا دوسرے باہر کے جامعات سے الحاق رکھنے والے
مدارس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ اس تجویز کا مقصد
جامعۂ عثمانیہ کے اصول کو تقویت پہنچانا ہے نہ کہ نقصان۔ مسٹر اعظم نے اپنے
جواب میں کہا کہ ایک کمیٹی جس کے اراکین جامعۂ عثمانیہ اور محکمۂ تعلیمات سے منتخب
کئے گئے ہیں مشترکہ نظام کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور آئندہ امید ہے کہ ان کا
فیصلہ اس تجویز کی موافقت میں ہوگا۔ مباحثہ پر نظر ڈالتے ہوئے صدر نے کہا کہ
اب تک ہماری قوت مختلف نظام تعلیم پر بٹی ہوئی تھی لیکن اب ایک مرکز پر
جمع ہو جائے گی جس سے یقین ہے کہ عمدہ نتائج پیدا ہوں گے۔ جب تجویز پر رائے
لی گئی تو یہ غلبہ آرا منظور ہوئی۔ صرف چار آراکین نے مخالفت میں رائے دی

دوسرا جلسہ۔

سہ پہر کا اجلاس حاجی مارماڈیوک پکتھال پرنسپال مدرسۂ فوقانیہ چادرگھاٹ کی
فاضلانہ اور فصیح تقریر سے شروع ہوا جس کا عنوان سزائے جسمانی تھا۔ اس تقریر کا
خلاصہ آئندہ اشاعت میں درج کیا جائے گا۔ اس کے بعد مسٹر سید علی اکبر نے جرمن مدارس کے

آثرات پر ایک تقریر کی مُقرِر کی رائے میں جرمنی مدارس کے تعلیمی نظام کے نمایاں خط و خال حسب ذیل ہیں۔

(۱) معلمین کا فنِ تعلیم اور پیشۂ تعلیم کے صفات سے بوجہ اعلیٰ متصف ہونا۔

(۲) نصاب کے مختلف مضامین میں توازن ہونا اور ایک ہی جماعت کے مختلف مضامین کے مدرسوں میں اتحادِ عمل کا ہونا۔

(۳) جرمنی میں تعلیم کی غرض طلبہ کو علم سکھانا اتنا نہیں ہے جتنا کہ معلومات سے ضروریاتِ دنیا میں کام لینا ہے اور اسی وجہ سے لڑکوں کی ذاتی کوشش پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

(۴) مدرسہ کے مشاغل، طلبہ کی زندگی اور اس کے ماحول میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بچوں سے تجربہ کرایا جاتا ہے اور جو کچھ انہوں نے پڑھا ہے اُس سے عملاً کام لیا جاتا ہے۔ عملی کام اور مدرسہ کی تمرین اُن کے تعلیم کا جزو غالب ہے۔

(۵) والدین اور اساتذہ میں اتحادِ عمل ہے۔

(۶) کمزور طلبہ پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اوائل عمر ہی میں ان کی خامی کو معلوم کرنے کے لئے پوری کوشش کی جاتی ہے اور ان کی اصلاح کے نئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

(۷) اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر طالب علم کو وہی تعلیم دی جائے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ اکثر علماء نفسیات اس مقصد کے لئے رکھے جاتے ہیں تعلیم ثانوی کے لئے ایسے ہی طلبہ چنے جاتے ہیں، جو اساتذہ کے نزدیک اس تعلیم سے مستفید ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(۸) جرمنی میں مدرسہ کی آبادی کے حفظانِ صحت و اصلاح کا اہتمام اور طبی معائنہ کا انتظام دنیا کے ہر ملک سے بہتر ہے۔ نحیف اور کمزور اعصاب کے بچوں کے لئے خاص مدرسہ رکھے گئے ہیں۔ جہاں کھلی ہوا میں تعلیم دی جاتی ہے غسل ہوائی اور غسل شمسی کا انتظام کیا گیا ہے۔ کام کے اوقات زیادہ طول طویل نہیں رکھے گئے ہیں جسمانی تعلیم

ہر مدرسہ میں لازمی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہو جس میں پورے ساز و سامان کے کھیل کا اکھاڑا نہ ہو اور جہاں کی نگرانی ایک تربیت یافتہ منتظم ورزش جسمانی کے ذمہ نہ ہو۔

اس کے بعد ذیل کی تجویز بحث کے لئے پیش ہوئی۔

دکن کے موسمی حالات کے نظر کرتے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدارس میں تعلیم کے اوقات نو بجے صبح سے تین بجے شام تک (جون تا فروری) اور ساڑھے سات سے بارہ بجے تک تعلیمی سال کے اور مہینوں میں رکھے جائیں۔ اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے مسٹر احمد حسین خاں بی۔ اے پرنسپال مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم نے کہا کہ موجودہ اوقات کی وجہ سے کھیل کے مشاغل میں سہولت پیدا کرنا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ مدرسہ کے برخاست کے بعد لڑکے کھیل کے میدان میں حاضر نہیں ہوتے ہیں بلکہ اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں پہلے تین مہینوں میں شام کے وقت بہ مشکل ایک گھنٹہ ان کو کھیل کے لئے ملتا ہے اور نومبر و ڈسمبر و جنوری میں تو یہ ایک گھنٹہ بھی نہیں ملتا۔ بعض کاہل الوجود لوگوں کی رائے ہے کہ نو بجے بہت جلد ہوگا۔

دیگر معترضین یہ کہتے ہیں کہ اس سے لڑکوں کی ایک خاص جماعت خصوصاً ہندو طلبہ پر اثر پڑے گا۔ لیکن اکثر ہندو لڑکوں کے کھانے کا وقت وہی ہوتا ہے جو مسلمان لڑکوں کا مقررین نے گرما کے موسم کے بارہ میں کہا کہ سات بجے صبح کا وقت بہت سویرا ہوگا خصوصاً چھوٹے بچوں کے لئے۔ یہ تجربہ ہے کہ جب کبھی وقت پر آنے کی سختی کی جاتی ہے تو طلبہ اکثر نہار منھ آجاتے ہیں۔ اسی کا لحاظ رکھتے ہوئے ساڑھے سات کے وقت کی تجویز پیش کی گئی۔ مولوی حسام الدین صاحب مددگار مدرس مدرسہ دارالعلوم فوقانیہ نے اس تجویز کی تائید کی اس پر ایک گرم مباحثہ چھڑ گیا لیکن تجویز کے صرف پہلے حصہ ہی تک محدود رہا۔ مسٹر ابوظفر عبدالواحد ایم اے لکچرار سٹی کالج اور مسٹر باقر محی الدین بی اے لکچرار تجارت

(کامرس) نے اس تجویز کے خلاف میں تقریر کی۔ موخرالذکر نے اس بات پر زور دیا کہ غیر مستطیع طلبہ میں سے سیکڑوں کی تعداد کو نو بجے سے پہلے کھانا نہیں ملتا۔ اگر ان کو جلد آنے پر مجبور کیا گیا تو وہ صرف رات کا بچا ہوا باسی کھانا کھا کر آئیں گے اور اس کا اثر ان کی صحت اور تعلیم دونوں پر پڑے گا۔ ان کے نزدیک یہ تجویز صرف اُمرائے کے بچوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے لیکن اس سے غریب طلبہ پر بہت مضر اثر پڑے گا۔ مسٹر راگھون بی۔ اے لکچرار نظام کالج نے تجویز کے موافقت میں تقریر کی اور بتلایا کہ یہ تغیر ہندو طلبہ کے حق میں بھی ضروری ہے کیونکہ اُن طلبہ کو گھر سے لوٹ کر کھیلنے کا موقع ملے گا۔ مسٹر قادر محی الدین مددگار مدرسۂ فوقانیہ چادر گھاٹ نے اس تجویز کی تائید کی اور جب رائے لی گئی تو یہ تجویز بہ غلبہ آرا منظور ہوئی۔ مولوی عبدالسلام صاحب ناظر مدارس گلبرگہ نے گشتی کتب خانہ کے حالات اور حلقہ گلبرگہ میں اس کی ترویج پر اردو میں تقریر کی اور کتابوں کا ایک صندوق بلدہ کے تحتانیہ مدارس کے استعمال کے لئے اپنی طرف سے ہدیۃً پیش کیا۔ مسٹر محمد عثمان بی۔ اے ٹی ڈی (لندن) نائب صدر عثمانیہ ٹریننگ کالج نے اردو میں بہ عنوان توارث اور ماحول تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ تیس سال ہوئے کہ توارث علمی پر شد و مد سے زور دیا جاتا تھا اور اس کے متعلق عام خیال تھا کہ انسان کی سیرت کے بنانے میں یہ ایک اہم شئے ہے لیکن موجودہ زمانے کے اہل فکر ماحول کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن آپ حق بات کو افراط و تفریط کے درمیان پائیں گے۔ انسان کی سیرت کی بنیاد جس حد تک ماحول پر ہے اُسی حد تک توارث پر بھی ہے۔ بچے بہت سی عادتیں اپنے والدین سے وراثتہً حاصل کرتے ہیں کمزور والدین کی اولاد کمزور ہوتی ہے لیکن ماحول کا اثر ان کے جسمانی قویٰ کے درست کرنے اور سیرت کے بنانے میں ضرور پڑتا ہے۔ توارث کے ساتھ ساتھ ماحول کے ذریعہ سے سیرت میں اصلاح و ترقی اچھی خاصی حد تک کی جا سکتی ہے یہی وہ اصول ہے جس پر اصلاح سیرت کے

مدارس قائم کئے گئے ہیں۔

توارثِ علمی کا مسئلہ ہمارے دست قدرت سے باہر ضرور ہے لیکن مناسب ماحول کی مدد سے اچھے نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ انسان کے ذہنی استعداد کے متعلق مختلف نظریوں کی تشریح کے بعد مسٹر عثمان نے بتلایا کہ کس طرح لڑکوں کے فہم کا اندازہ پیمائش ذہنی سے کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ استاد کا فرض ہے کہ طلبہ کے استعداد کا صحیح اندازہ کرے اور ہر طالب علم کو اُس کام پر لگائے جس کا وہ اہل ہے اور جس میں اپنی استعداد ٹھیک طور پر استعمال کر سکتا ہو۔ پہلے دن کی دوسری نشست اس تقریر کے ساتھ ختم ہوئی۔

تیسرا جلسہ

کارروائی کی ابتدا مولوی حسام الدین صاحب کی تقریر سے ہوئی جس کا اقتباس علٰحدہ درج کیا گیا ہے۔ مسٹر سید محمد حسین نائب ناظم تعلیمات نے دلچسپ چشم دید حالات ڈنمارک کی تعلیم بالغان پر بیان فرمائے جس کا اقتباس اس رسالہ کی اشاعت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر تجمل حسین صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج نے بہ عنوان "تعلیم کے متعلق نئے خیالات" تقریر کی۔ جس کے بعد مسٹر ابو ظفر عبد الواحد ایم اے لکچرار سٹی کالج کی تقریر "مدارس میں اردو تعلیم" کے عنوان پر ہوئی۔ جس کا کچھ حصہ شائع کیا گیا ہے۔

چوتھا جلسہ

مسٹر کے پی شاستری بی۔ اے بی ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ مفید الانام کی تجویز سے شروع ہوا جس کا منشا خانگی مدرسوں کے مدرسین کی فلاح میں ہاتھ بٹانا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خانگی مدرسین کے حالات ناقابل اطمینان اور اُن کی تنخواہیں قلیل ہیں اس لئے آپ نے درخواست کی کہ پراویڈنٹ فنڈ کے معاملہ کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے جس سے مدرسین کی فلاح کے علاوہ نونہالان ملک کی بہبودی بھی مقصود ہے۔ مسٹر ہنمنت راؤ

صدر مدرس مدرسہ محبوبیہ کالج سکندر آباد نے اس تجویز کی تائید میں فرمایا کہ خانگی مدرسین کو تنخواہ اور رخصت کے معاملہ میں بہت دشواریاں اٹھانی پڑتی ہیں اور وہ اُن مراعات سے محروم ہیں، جو سرکاری مدارس کے مدرسین کو حاصل ہیں ریورنڈ ایف سی فلپ نے مزید تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر پراویڈنٹ فنڈ قائم کردیا جائے تو امدادی مدرسوں کی بقا کا مسئلہ طے ہوجائے گا۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور کرلی گئی۔

مسٹر سید محمد ہادی ناظم تعلیم جسمانی نے اردو میں ایک تحریر اسکوٹنگ کے عنوان پر پڑھی آپ نے فرمایا کہ قومی زندگی میں اسکوٹنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے اور مدارس میں اس کے ترتیب دینے کے امکان موجود ہیں اسکوٹنگ کی عالمگیر تحریک اور روزافزوں اہمیت کو دیکھتے ہوئے آپ نے تمام معلّمین کو اس میں دلچسپی لینے کی رغبت دلائی۔

ڈاکٹر محمد قریشی پروفیسر کیمیا جامعہ عثمانیہ نے بہ عنوان "مدارس میں سائنس کی تعلیم" تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ تعلیم کا کوئی نظام اس وقت تک کامل قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اس میں سائنس کی تعلیم کا کافی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ اگر ہم یورپی اقوام کے دوش بدوش رہنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ سائنس کو اور مضامین کی طرح لازمی قرار دیں۔ آپ نے بطور مشورہ کہا کہ مدارس سرکاری میں تعلیم سائنس کی نگرانی کے لئے ایک خاص مہتمم کا تقرر کیا جائے اور ہیورسٹک طریقہ تعلیم پر زور دیا جائے اس کے بعد مسٹر بھاراؤ نے اس تحریک کو "ابتدائی سائنس امتحانات عثمانیہ میٹرک اور ہائی اسکول لیونگ میں لازمی قرار دی جائے" پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ امر قابل افسوس ہے کہ میٹرک کامیاب طلبہ کو خود اپنے جسم کی کچھ خبر نہ ہو اور وہ سائنس کی موٹی موٹی بنیادی چیزوں سے نابلد رہیں مسٹر عبدالنور صدیقی بی۔اے۔بی ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل نے اس تجویز کی تائید کی مسٹر باقر محی الدین بی۔اے لکچرار صنعت وتجارت نے بھی مباحثہ میں حصہ لیا۔ آپ نے افسوس ظاہر کیا کہ یہ ایک لازمی مضمون تھا مگر افسوس اس سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ یہ تحریک باتفاق آرا منظور کرلی گئی۔

اس کے بعد پچھلے اجلاس کانفرنس کے تجاویز کی توثیق کی گئی۔ اور مستحقین کو نمایش کے انعامات تقسیم کرنے کے بعد معزز صدر اختتامی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اجلاس کامیاب رہا میں ان لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں جن کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی اس سلسلہ میں ریورنڈ فلپ، مسٹر خیرات علی اور مولوی سید شریف صاحب مشہدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پھر ہزاکسلنسی مہاراجہ بہادر کی تعلیمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس اجلاس میں جتنی تقریریں ہوئیں، وہ سب کی سب نئی باتوں کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ مسٹر سید علی اکبر کی دلچسپ تقریر سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ زندہ اقوام آج دنیا میں کیا کر رہی ہیں اور انہوں نے دماغی اور جسمانی تعلیم کے متحد کرنے کے مسٔلہ کو کس کامیابی کے ساتھ حل کر دیا۔ مسٹر محمد حسین کی پر از معلومات تقریر سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ حب وطن کیا چیز ہے قوم کس طرح رہنماؤں کی جانفشانی اور قربانی سے بنائی جاسکتی ہے۔ مسٹر کپھال کی فاضلانہ تقریر پر نظر ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس سے ہم پر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ اخلاقی تربیت میں بہتر نتائج محبت، ہمدردی اور حکمت سے حاصل کئے جاسکتے ہیں نہ کہ سزائے جسمانی ہے جس سے بہت آخر میں کام لینا چاہئے۔ معزز صدر نے بیان کیا کہ دس سال پہلے صاحب ممدوح کو ناظم تعلیمات کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا لیکن جب سے اب تک تعلیم میں سرعت کے ساتھ ترقی ہو چکی ہے طلبہ کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور مدارس کی تعلیم میں خوش اسلوبی کے ساتھ ساتھ پبلک کو تعلیمی مسائل سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے آپ نے فرمایا کہ ساری ترقی ہمارے سبکدوش ہونے والے ناظم اور ان کے ماتحت عہدہ داروں کی بدولت ہوئی ہے لیکن اس پر بھی ابھی بہت کچھ باقی ہے اب تک تعلیم جسمانی پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ایسے مدرسے جن کے ساتھ بازیگاہ بھی ہوں تعداد میں بہت کم ہیں سائنس کی تعلیم سے غفلت برتی جا رہی ہے موجودہ زمانہ کی روزمرہ کی زندگی میں سائنس کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے اعتبار سے اس کا لازمی قرار دینا ضروری ہے۔ ایک اور

نقص یہ نظر آتا ہے کہ علمی زبان سنسکرت اور عربی کی تحصیل پر مدارس کے نصاب تعلیم میں کافی اہمیت نہیں دی جارہی ہے آپ نے فرمایا کہ ہماری آبائی مادی وراثت اُس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتی جب تک ہم اِن زبانوں کے مطالعہ پر بھی پوری توجہ نہ کریں اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی طرف اب سے بڑھ کر اعتنا کریں۔ اس معاملہ میں عموماً حکومت سے کچھ اُمید نہیں کی جاسکتی ہے تاوقتیکہ رائے عامہ اس مسئلہ کو نہ اٹھائے اور حکومت پر زور نہ ڈالے۔ پس ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک متحدہ نظام العمل مرتب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ حکومت ساری تجویزوں کو منظور کرے آخر میں آپ نے اساتذہ کو نصیحت کی کہ وہ اپنے کام کو ایک قومی فرض سمجھیں اور اس کو پورے انہماک اور جوش سے بجالائیں۔ مسٹر راڈیوک کیتھال نے معزز صدر کے شکریہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے آپ کے محاسن کا ذکر کیا۔ اجلاس کی کارروائی مسٹر سید علی اکبر کی مختصر تقریر کے ساتھ ختم ہوئی۔

بچوں میں دلچسپی پیدا کرنا سبق کا جزو اعظم ہے

(ڈکری)

دماغ ایسا ظرف نہیں ہے جسے محض معلومات سے بھرا جائے بلکہ اس کی مثال ایک آتش دان کی ہے جسے منور اور روشن کرنا کافی ہے

(پلوٹارک)

ضبط کی بنیاد محض محبت پر ہونی چاہیئے۔

(پستالوزی)

کارگزاری انجمن اساتذۂ متفرقہ بلدہ

بابتہ سنہ ۱۳۳۵ تا سنہ ۳۷ ف

خدا کا شکر ہے کہ انجمن ہذا نے اپنی زندگی کے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے ابتدائے قیام انجمن سے امرداد ۱۳۳۵ف تک کی رپورٹ پہلی سالانہ کانفرنس میں پیش کی جا چکی ہے۔ اب اس وقت گزشتہ دو سال یعنے امرداد ۱۳۳۵ف لغایتہ امرداد ۱۳۳۷ف کی کیفیت عرض کی جاتی ہے۔

حضرات! یہاں پر یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ۱۳۳۶ف میں کانفرنس کا اجلاس بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ ہو سکا اور جب اوائل ۱۳۳۷ف میں سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے تو مرض طاعون پھیل گیا اور اس طرح یہ دوسرا اجلاس ایک سال کے بجائے پورے دو سال کے بعد منعقد ہو رہا ہے۔

شاخہائے انجمن۔ ٹریننگ کالج بلدہ کا تعلق چونکہ دفتر صدر مہتممی بلدہ کے بجائے راست صدر دفتر نظامت عالیہ تعلیمات سے ہو گیا اس لئے وہاں کی شاخ بند ہو کر اب صرف (۱۴) مرکز ہیں۔ مگر اس ایک شاخ کے بند ہو جانے کی وجہ سے اراکین کی تعداد میں جہاں ایک سو سے زیادہ کی کمی ہوئی ہے اس کے ساتھ ہی نظام کالج، سٹی کالج اور ٹریننگ کالج بلدہ کے پروفیسر و لکچرار صاحبان اور اضلاع کے متعدد مدرس صاحبان و دیگر حضرات نے حسب دفعہ (۴) ضمن (ب) قواعد انجمن رکنیت کو قبول فرما لیا ہے اور ممکن ہے کہ اس کانفرنس کے دوران میں ایسے اراکین کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہو جائے۔ مگر ابھی تک کسی بزرگ نے لائف ممبری قبول فرما کر انجمن ہذا کو سرفراز نہیں فرمایا۔ گو چادر گھاٹ ہائی اسکول بلدہ کا تعلق اب دفتر صدر مہتممی تعلیمات بلدہ سے

نہیں رہا لیکن مدرسہ مذکور کی شاخ بدستور قائم ہے۔

معمولی جلسہ ہائے ماہانہ۔ زمانہ زیر رپورٹ میں انجمن کے ہر مرکز میں (۱۱) معمولی ماہانہ جلسے ہوئے اور حسب ذیل مضامین پر تقریریں ہوئیں۔

(۱) اسکول ہائی جین۔ (۲) تعلیم ڈرائنگ (۳) مدرسین اور اولیا طلبہ سے اتحاد (۴) تعلیمی تفریحیں (۵) طریقۂ سوال از طلبہ (۶) جوابات کے پرچوں کی جانچ اور ان کی اصلاح۔ (۷) اسکول لائبریری (۸) بلاک بورڈ کا استعمال (۹) کنڈرگارٹن (۱۰) تعلیم دستکاری (۱۱) السنہ ملکی کی تعلیم۔

حسب موقعہ نمونہ کے سبق بھی ہوئے کیونکہ انجمن کا مطمح نظر یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے علمی کام کیا جائے ان تمام جلسوں کی کارروائیوں کا خلاصہ وقتاً فوقتاً انجمن کے سہ ماہی رسالہ "دی حیدرآباد ٹیچر" میں جو گزشتہ کانفرنس کے بعد ہی سے برابر شائع ہو رہا ہے درج ہوتا رہا ہے۔

جلسۂ عام۔ زمانہ زیر رپورٹ میں ایک جلسۂ عام نظام کالج میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر شیشادری صاحب (بنارس یونیورسٹی) میر مجلس آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشنز نے "ہندوستان کے مدارس ثانوی میں انگریزی تعلیم" پر تقریر کی جو پوری رسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔

قیام انجمن اتحادی۔ مرکزی انتظامی کمیٹی نے انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کے تحت ایک صدر انجمن اتحادی قائم کرنے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی قائم کی ہے کمیٹی مذکور کی تجاویز رسالہ میں شائع ہو چکی ہیں اور عنقریب مرکزی انتظامی کمیٹی میں منظور ہونے کے بعد ان پر عمل کیا جائے گا۔

رسالہ حیدرآباد ٹیچر۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے انجمن ہذا کا سہ ماہی رسالہ "حیدرآباد ٹیچر" امرداد ۱۳۳۵ف سے برابر شائع ہو رہا ہے اور اس کے خریداروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ امید افزا ہے گو رسالہ کے معیار کو بلند رکھنے میں صدر حلقہ ادارت مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے۔ صدر مہتمم تعلیمات و میر مجلس اور اُن کے معاونین ریورنڈ فلپ مولوی احمد حسین خاں صاحب بی۔ اے فخر الحسن صاحب ملا بی۔ اے۔ بی ٹی۔ اور مولوی عبدالنور صاحب صدیقی بی۔ اے

بی ٹی ۔ جیسے محنتی حضرات پوری کوشش فرماتے ہیں نیز رسالہ کی عمدہ چھپائی وغیرہ کے متعلق بھی خاص توجہ کی جاتی ہے ۔ مگر ابھی رسالہ کے خریداروں کی تعداد ایسی نہیں ہے کہ وہ انجمن ہذا کی مالی امداد سے مستغنی ہو جائے مگر امید ہے کہ عنقریب اس کی مالی حالت ایسی ہو جائے گی کہ وہ اپنی آمدنی سے خود چلنے لگے گا ۔ آمدنی انجمن سے رسالہ کو (۱۶۸) روپیہ سالانہ بطور امداد دئے جاتے ہیں اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۔

دیگر امور ۔ (۱) انجمن ہذا کے میر مجلس صاحب جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کینٹب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کرسمس ۱۹۲۶ء میں منجانب سرکار آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز انجمن ہذا کی طرف سے آل انڈیا ٹیچرز کانفرنس میں بمقام پٹنہ شریک ہوئے اور کرسمس ۱۹۲۷ء میں کانفرنس مذکور کے اجلاس میں جو بمقام کلکتہ منعقد ہوا تھا جناب مولوی احمد حسین خاں صاحب بی اے ۔ صدر دارالعلوم بلدہ و نائب میر مجلس انجمن ہذا اور جناب ہری ہر ایر صاحب بی اے ۔ اول مددگار مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادر گھاٹ انجمن ہذا کی طرف سے بطور نمایندہ شریک ہوئے ان کی آمد و رفت کے مصارف کا نصف سرکار نے مرحمت فرمایا ہے ۔

(۲) میر مجلس صاحب انجمن ہذا سال گزشتہ منجانب سرکار بطور نمایندہ امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے ۔ صاحب موصوف ۴ ابان ۱۳۳۶ف کو واپس فائز بلدہ ہوئے ۔ امپیریل کانفرنس مذکور میں جناب مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی اے نائب ناظم تعلیمات نے بھی بطور نمائندہ سرکار شرکت فرمائی تھی ۔ لہذا دونو حضرات کی واپسی کے وقت انجمن ہذا کی طرف سے اسٹیشن پر استقبال کیا گیا اور اس تقریب میں دونو اصحاب کو ایک شاندار ایٹ ہوم دینے کا انتظام کیا گیا تھا مگر چونکہ ان حضرات نے رقم مجتمعہ کو خورد و نوش میں صرف کرنے کو پسند نہ فرمایا ۔ لہذا انجمن نے اس رقم سے جو چھ سو روپیہ کے قریب ہے ایک کتب خانہ قائم کرنے کا تصفیہ کیا ہے ۔ اور امید ہے کہ کمیٹی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے ۔ بہت جلد اس کی تکمیل کر دے گی ۔ بہر حال اراکین انجمن نے دونو حضرات کو ایک جلسۂ عام میں خوش آمدید کہا ۔ جہاں ان حضرات نے اپنے سفر کے مختصر حالات بیان فرمائے اور تفصیلی معلومات سے حسب وعدہ

اس کانفرنس میں مستفید فرمائیں گے۔

(۳) انجمن ہذا کے جلسہ عام میں جو نظام کالج میں منعقد ہوا تھا جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم کی تعزیت کا رزولیوشن پاس ہوا تھا۔

(۴) آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشنز کی تحریک پر انجمن ہذا کو اس فیڈریشن سے ملحق کرنے کا تصفیہ کیا گیا ہے اور اس بارہ میں سرکار عالی سے حسب ضابطہ اجازت چاہی گئی ہے۔

حضرات - جو تحریکیں انجمن ہذا کی گزشتہ کانفرنس میں منظور ہوئی تھیں۔ ان کے متعلق ارباب حل و عقد کی خدمت میں جناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات مستقر بلدہ کے توسط سے تحریک کی گئی ہے اور ان میں سے بعض کے متعلق جوابات بھی آچکے ہیں۔ کہ سرکار اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔ بقیہ کے متعلق بھی امید ہے کہ مناسب نتیجہ برآمد ہوگا۔

حضرات مجھے اس واقعہ کے عرض کرنے سے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ ہماری انجمن کے ایک نہایت ہونہار نوجوان اور رکن انجمن مولوی سید ولایت علی صاحب بی اے۔ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ جو رسالہ جدید آیا تجربہ حصہ اردو کی اڈیٹری کا کام بھی کرتے تھے، چند روز کی علالت کے بعد عین عالم شباب میں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔
(انا للہ وانا الیہ راجعون)

حضرات عالی جناب نواب مسعود جنگ بہادر سرپرست انجمن ہذا نے انجمن کی جو حقیقی سرپرستی فرمائی ہے اس کا ذکر خود میر مجلس صاحب انجمن نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا ہے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ اگر نواب صاحب ممدوح کا نام نامی ملک کے طول و عرض میں سررشتہ تعلیمات کی ترقی، اصلاح اور دیگر کارگزاریوں کے لحاظ سے مدت مدید تک یاد رہے گا تو بلدہ کے مدرسین بلحاظ سرپرستی انجمن بطور خاص ہمیشہ کے لئے نواب صاحب معزکا ذکر خیر کریں گے۔

حضرات میں یہ عرض کرنے کے بعد کہ انجمن ہذا کے قیام سے مدرسین مدارس بلدہ کی معلومات میں اضافہ اور ان میں باہمی اتحاد و موالات و اجرائی رسالہ علمی وغیرہ جیسے جن اغراض کی تکمیل مقصود تھی وہ ایک حد تک پوری ہو رہی ہے اپنی رپورٹ کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنے آقائے ولی نعمت مدظلہ العالی کے سایۂ عاطفت میں تا مدت مدید تک اسی طرح ترقی کرتے رہیں۔ آمین۔

سید محمد شریف مشہدی (معتمد عمومی انجمن اساتذہ)

خطبہ افتتاحیہ

عالی جناب راجہ راجایان سر کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ

جی۔ سی۔ آئی۔ ای

صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

معزز حاضرین و بانیان کانفرنس،

اس جلسے میں افتتاح کانفرنس و نمایش کے لئے نواب مسعود جنگ بہادر کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے مجھ کو دلی خوشی حاصل ہوئی۔ جن اعلیٰ اور شریفانہ مقاصد کے تحت انجمن اساتذہ بلدہ و اطراف بلدہ قائم ہے اور اپنے مقاصد کے پیش رفت میں، انجمن کے جو کچھ مساعی اس وقت تک ایک قلیل مدت میں ظہور پذیر ہوئے، وہ واقعی مشکور ہیں۔

اچھے مدارس ابنائے وطن کے حق میں علم و عمل اور اخلاق حسنہ کے مخزن ہیں، جہاں سے ملک کی علمی، اخلاقی، ذہنی، جسمانی اور معاشی ضروریات کی مبصرانہ نظر سے تکمیل ہو سکتی ہے۔ مدرسین کے اچھے عمل طلبا کے حق میں رحمت اور ملک کے حق میں باعث برکت ہیں۔ مدرسین کے عمل کو منظم کرنے کے لئے ایسی تنظیم، جو انجمن اساتذہ کے مقاصد پر حاوی ہو، بڑی ذمہ داری، ایثار، کافی واقفیت، نیک نیتی اور رواداری کی محتاج ہے اور ایسی تنظیم کے نظام العمل ایک قوم کے اخلاقی، معاشی، سیاسی اور جسمانی ترقی سے بالواسطہ اور قریبی تعلق رکھتے ہیں، جس کا گہرا احساس یقیناً آپ سب کو ہے۔ فرصت حاصلہ کے لحاظ سے تعلیمی رسالہ کی اجرائی اور کانفرنسوں کا انعقاد جس سرگرمی اور زرپاشی سے کیا گیا ہے، ضرور ایک حد تک مفید مقصد ثابت ہوا ہے اور یقین ہے کہ مزید کامیابی

اور وسعت عمل بھی حاصل ہو رہے گی۔ اس کانفرنس کو ترتیب دینے اور دیگر اغراض انجمن کے
پورا کرنے میں سیّد علی اکبر صاحب اور ان کے رفقاء کار کی کوشش اور مسعود جنگ بہادر کی
علمی دلچسپی قابل ستائش ہے۔

اس جلسے میں میری شرکت کا پہلا رخ' اساتذہ کی کوششوں میں میری دلی ہمدردی
اور دلچسپی کا ثبوت ہے اور نواب مسعود جنگ بہادر کی روانگی سے قبل ایک ایسی
مجلس میں جو ان کی گہری دلچسپیوں کا نتیجہ ہے' میری حاضری ذاتی طور پر لطفِ شرکت کا
دوسرا خوش گوار رُخ ہے۔ نواب مسعود جنگ بہادر کے حیدرآباد سے جانے پر اُن کی
بے بہا خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف ایک امر معترفہ ہے۔ قطع نظر اِن ذمہ داریوں کے
جو ادائی فرائض اور فرائض شناسی میں نواب مسعود جنگ نے پوری کی ہیں' اُن کی پسندیدہ
شخصیت' عالمانہ اہلیت' دیدہ زیب وجاہت اور ہر دلعزیزی کی خداداد صلاحیت
عموماً اپنا خاص اثر اور ان کے ہر ملنے جلنے والے اور دوست کے خیال میں ایک اچھا
اور گہرا نقش رکھتی ہے۔ جن توقعات کے ساتھ انجمن اساتذہ کے قیام میں نواب مسعود جنگ بہادر نے
دلچسپی لی ہے ان کی تکمیل' آپ صاحبوں کے اُن سے خلوص اور آپ کی اپنی فرائض شناسی
ان کی علمی کامیابی اور اُن کی آپ سے خیر خواہی کی' ایک یادگار رہے گی۔ اب آپ کو
اصلی کام کی طرف رجوع ہونا ہے' اس لئے جلسے کے فاضل صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر سے
س ملک کے علم وعمل کے ایک لائق تقلید نمونہ ہیں اور جو سیرت و اخلاق میں بزرگوں سے
حصہ پائے ہوئے ہیں' خواہش کرتا ہوں کہ کانفرنس کی ابتدا کریں۔ اُن کی رہنمائی میں
مجھ کو امید ہے کہ آپ اس اجلاس کانفرنس میں آئندہ کے لئے ایک علمی اور کامیاب
پروگرام تیار کرلیں گے' جس کے اچھے نتائج کا دیکھنا اہل ملک کے لئے دلچسپی کا سبب ہوگا۔
میں دل سے آپ کی ہر کامیابی کا خواہاں ہوں۔

خطبۂ صدارت

عالی جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن) معتمد سیاسیات سرکار عالی

یور اکسلنسی، معزز خواتین و حضرات!

غالباً آپ سب حضرات حیدرآباد کی اس عام انسٹیٹیوشن سے واقف ہوں گے، جو حقیقتاً ایک مضرت رساں اور تکلیف دہ چیز بن گئی ہے۔ اس سے میری مراد اُن سفارشی رقعوں سے ہے جن سے آج کل ہر شخص کا دم ناک میں آگیا ہے۔ ایسے رقعوں کے پیش کرنے والے وہی اصحاب ہوتے ہیں، جو چھوٹی چھوٹی جائدادوں کے حاصل کرنے کی تلاش میں رہا کرتے ہیں؛ لیکن عموماً ان رقعوں کا اثر سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان رقعوں کے موجودہ خبط کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ خصوصاً وہ لوگ جن کے پاس سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے جائز وسائل موجود نہیں ہیں، انہی رقعوں کے ذریعہ سے ملازمت حاصل کرنے کی اُمید رکھتے ہیں۔

اب یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض لوگ جن کی طبیعت میں کافی طور پر عیب چینی کا مادہ ہے، ہماری تمام برائیوں کو تعلیم پر محمول کرنے میں ذرا بھی نہیں چوکتے اور فوراً اپنے دعوے کے ثبوت میں اسی مذموم طریقۂ سفارش کو پیش کردیتے ہیں جس کے متعلق میں ابھی ابھی شکایت کرچکا ہوں۔ لیکن ذرا سا غور کرنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا یہ گمان کس قدر غلطی پر مبنی ہے کیونکہ تعلیم اگر روشن خیالی پیدا کرتی ہے تو اس کا یہی فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس قسم کی برائیوں کو پیدا ہی نہ ہونے دے اور ان کی اصلاح کردے۔ وہ چیز جس کو ہم

اپنی مشکلات کی ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں فی الحقیقت فقدان تعلیم یا تعلیم کا غلط اصول پر دیا جانا ہے۔ لہٰذا وہ خیال جس سے سفارشی رقعوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے یعنے یہ کہ تعلیم یافتہ شخص سوائے قلم کے کسی اور اوزار کو ہاتھ نہ لگائے' اُس زمانے کی یادگار ہے جب کہ اہل حرفہ اور مزارعین کا علم سے قطعاً نابلد رہنا اور صرف تعلیم یافتہ اشخاص ہی کا علمی پیشوں کو اختیار کرنا ضروری فرض کر لیا گیا تھا۔ لیکن اب وہ تمام خیالات تبدیل ہو چکے ہیں اور وہ وقت آ پہونچا ہے کہ ہم لوگوں کے دماغوں کی اسی طریقے پر تعلیم و تربیت کریں کہ ان میں یہ سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے کہ تعلیم جہاں سرکاری ملازمت کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے' وہاں دستکاری اور صنعت و حرفت کے راستے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کو چاہیئے کہ ابتدائی مدارس کو دیہی اور شہری دو حصوں میں منقسم کرنے کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں اور دیہی مدارس کا نصاب تعلیم ایسے طریقے پر مرتب کرنا چاہیئے جس سے زراعت میں مدد مل سکے اور لوگوں کو کاشت کاری کی جانب ترغیب و تحریص ہو۔ تاکہ ملک کے اس پیشے میں جس پر ما یحتاج کا دار و مدار ہے خاطر خواہ ترقی ہو ان دیہی مدارس کی تنظیم اس طریقے پر ہونی چاہیئے کہ طلبہ آلات زراعت کا استعمال کرنا سیکھ جائیں اور فصلوں' اراضی اور موسموں کے متعلق کل معلومات حاصل کر لیں تاکہ مدرسہ چھوڑتے ہی وہ پیشۂ زراعت کے اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن دیگر مدارس کے متعلق کیا ہو گا جو حدود شہر میں واقع ہیں۔ وہ وقت گذر چکا ہے جب کہ تعلیم محض متعلم کے دماغ میں مباحث کو اس طرح ٹھونس ٹھونس کر بھرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی جیسا کہ ایک ربڑ کے ٹائر میں ہوا بھری جاتی ہے۔ اب اس خیال کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تعلیم کار آمد اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ اس کے ذریعے سے تمام دماغی اور جسمانی قوی میں ترقی اور نشو و نما ہو تاکہ انسان دماغی اور جسمانی حیثیت سے زندگی کے ہر ایک شعبے میں کام کرنے کے قابل ہو جائے۔ لہٰذا اسی اصول کو

مدنظر رکھ کر شہری مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاح ہونی چاہئے۔ وہ بڑے قوائے مدرکہ
جن کے ذریعہ سے ہم علم کو جذب کر سکتے ہیں "حواس خمسہ" ہیں اور ضرورت اسی امر کی ہے کہ
نوجوان طلبہ میں انہیں حواس خمسہ کو تربیت اور ترقی دی جائے۔ بچوں کو مشاہدے اور ساتھ ہی ساتھ
اپنے ہاتھ سے بھی کام لینے کی تعلیم دینی چاہئے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مطالعہ فطرت،
کنڈرگارٹن کے کھیل اور دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ کسی قدر نیچرل سائنس کی بھی ضرورت ہے
کیونکہ سائنس سے مشاہدے کی اصلاح اور تجربات سے صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد ملتی ہے
اس کے ساتھ ہی فوقانیہ جماعتوں میں کسی نہ کسی دستکاری کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اگر اس طرح ابتدائی
تعلیم کی تنظیم کی جائے تو ایسی تعلیم طالب علم کی آیندہ زندگی کی فلاح و بہبود میں اس کی بہترین
مؤید بن سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے موزوں اساتذہ کی ضرورت ہے اور یہ انجمن اساتذہ کا
فریضہ ہے کہ اس قسم کے معلمین کی فراہمی میں سررشتہ کی مدد کرے۔ ہم کو اساتذہ کی تربیت کے
ذرائع بھی بہم پہونچانے چاہئیں، جو نہ صرف بچوں کو مشاہدے کی قوتوں کو کام میں لانے ہی کی
تعلیم دیں بلکہ ان کو ہاتھ سے کام کرنا بھی سکھائیں تاکہ ان کے دماغی اور جسمانی قویٰ ترقی کریں
اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ اساتذہ ایسے منتخب کئے جائیں، جن کے عادات واطوار اور
اصول زندگی بہترین ہوں۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچے کے عادات واطوار اپنے استاد کے
عادات واطوار کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کسی کہنے والے نے کیا سچ کہا ہے کہ ایک رتی تاثیر صحبت
ایک من پند ونصیحت سے بہتر ہے۔ چونکہ جسم اور دماغ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور
بغیر ایک صحت مند اور طاقتور جسم کے ایک نتیجہ خیز دماغ کا حاصل کرنا ناممکن ہے لہذا میں
جسمانی قوت کی نشوونما پر زیادہ زور دیتا ہوں۔ میں ہر ایک مدرسے کے تحت کھیل کے لئے
قطعات زمین مہیا کرنا اور سوائے معذور اور بیمار لڑکوں کے ہر ایک لڑکے پر اس امر کو
فرض گردانا کہ وہ کسی نہ کسی مردانہ کھیل میں حصہ لے، ضروری اور لابدی قرار دوں گا۔ ہر
مدرسے میں ہر ممکنہ ذریعے سے لڑکوں اور لڑکیوں میں ورزشوں اور کھیلوں کی ترغیب و تحریص

پیدا کرنی چاہئے۔ مثال کے طور پر ہاکی کو لیجئے۔ ہندوستانی ٹیم نے یورپ میں ایک شاندار کامیابی حاصل کی ہے یہ خود ایک ایسی مثال ہے جو ہمارے شوق کو دوبالا کر سکتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے نوجوان کھلاڑی کے دل میں اس امر کی ریس نہ پیدا ہو کہ ایک روز اس کا بھی شمار بین الاقوامی کھلاڑیوں میں ہونے والا ہے۔ اب ہمارے ہر دلعزیز کھیل کرکٹ کو لیجئے حیدرآباد میں اس کھیل کے متعلق بہت کچھ صلاحیت پیدا ہو چلی ہے جس کو ترقی دینے کے لئے محض ایک مناسب تربیت کی ضرورت ہے ہماری ریاست کو بچوں کی جسمانی اور ورزشی تعلیم کے لئے ایک تربیت یافتہ معلم ورزش کے تقرر کی نسبت غور کرنا چاہئے۔ آخر میں ہم فٹ بال کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کو حال ہی میں حیدرآباد کی ایک غیر مطبوع جماعت نے پیشہ کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے جس کے انسداد کے لئے مدارس اور کالج اس امر کی پابندی کریں کہ یہ کھیل صرف انہیں کے حلقوں میں کھیلا جائے اور پیشہ وار یا کلب کی ٹیموں کو وہ ہرگز اپنے ٹورنمنٹ میں شریک نہ کریں۔ اب ورزشی کرتبوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو بچوں میں چستی و چالاکی اور پھرتی پیدا کرتے اور ان کے جسم کو مضبوط اور توانا بناتے ہیں۔ مجھے اس امر پر کامل یقین ہے کہ کوئی چیز کیرکٹر کے بنانے میں اس قدر معین و موید ثابت نہیں ہو سکتی جس قدر کہ مردانہ کھیل اور ورزشیں ہو سکتی ہیں۔ کمزوروں کی مدد و معاونت کرنے کا خیال، کھیل میں سچائی اور راستی برتنے کا احساس اور باہمی امداد کا جوش سچے "مرد میدان" (اسپورٹسمین) کی فطری خصوصیات ہیں۔ مختصر یہ کہ "اسپورٹ" ہی ایک ایسی چیز ہے، جو ہم کو جوان مرد بناتی اور ذلیل و بزدلانہ حرکات اور مکر و فریب سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ فی الحقیقت ہمارا تمام دنیوی مفاد اسی میں ہے کہ ہم اپنے آپ کو جسمانی حیثیت سے قابل بنائیں بلکہ سچ پوچھو تو خود ہماری زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو جہاں تک ترقی گنجایش اجازت دیتی اس شعبہ تعلیم کو ترقی دینے کی ضرورت پر حکام مقتدر کو لگاتار توجہ دلاتا رہتا۔

مدرسہ فوقانیہ کا نصاب تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکے میں اتنی قابلیت پیدا ہو جانی چاہئے کہ وہ یونیورسٹی میں داخل ہو سکے اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ یونیورسٹی کا طالب علم کس قسم کا ہونا چاہئے اس امر کے ذکر کی تو ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی کہ اس کو ایک معزز شخص ہونے کے ساتھ ساتھ ورزشی کھیلوں کا بھی ماہر ہونا چاہئے اُس میں معلومات عامہ کا ذخیرہ بھی اس قدر ہو کہ وہ اپنے آپ کو یونیورسٹی کے بلند ترین زینوں پر قدم رکھنے کے قابل بنا سکے۔ اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بعض طلبہ ایسی حالت میں یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں کہ اُن میں اُس تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہیں پائی جاتی جوان کو ملی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے اور بہتر طلبہ پر بھی ان کا برا اثر پڑتا ہے اور وہ خصوصاً انگریزی کے معیار تعلیم کو گھٹانے کا باعث ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ طبقہ فوقانیہ کے کل نظام تعلیم پر نظر ثانی اور تنظیم جدید کی ضرورت ہے تاکہ وہ ابتدا ہی سے اس قابل بن جائے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم سے موافقت پیدا کر سکے۔ یہ امتیاز کہ درجہ سوم میں کامیاب شدہ طلبہ جامعہ عثمانیہ میں اور درجہ اول و دوم میں کامیاب شدہ نظام کالج میں شریک کئے جاتے ہیں، اٹھا دیا جائے۔ صرف ایک ہی طریقہ تعلیم اور ایک ہی امتحان رکھا جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ طلبہ بدرجہ اولیٰ خاص اپنی ہی یونیورسٹی کے لئے تیار کئے جائیں۔ اگر کسی خاص صورت سے مجبور ہو کر وہ کسی دوسری یونیورسٹی میں چلے جاتے ہیں تو اس کا مضائقہ نہیں جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بیان کیا ہے بعض نقادان فن تعلیم کی کل برائیوں کو سرسری تفہیم و تشریح پر محمول کرتے ہیں اور خاص کر اُس تعلیم پر الزام لگاتے ہیں جو ملکی زبان میں دی جاتی ہے بحیثیت ایک اردو درس گاہ ہونے کے وہ عثمانیہ یونیورسٹی کو ناقابل معافی تصور کرتے ہیں لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ علم حاصل کرنے کا صرف وہی طریقہ فطرت کے موافق ہو سکتا ہے جس میں اپنی مادری زبان کی وساطت سے تعلیم دی جاتی ہو۔ لہذا یہ اعتراض غیر زبان کی تعلیم پر عاید ہو سکتا ہے نہ کہ ہماری یونیورسٹی پر۔ غیر زبان میں تعلیم دینے کا طریقہ کم و بیش

سو سال سے رائج ہے اور نہایت ہی ناکامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ اگر اس کو کچھ کامیابی ہوئی بھی ہے تو صرف اسی قدر کہ اس سے چند ہی اعلیٰ قابلیت رکھنے والے اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی طبیعت میں جدت کا مادہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مشکل اجنبی زبان میں علمی مباحث کی تعلیم پانے سے ایک اوسط درجے کے ہندوستانی طالب علم کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑتی ہے اس کو بجائے اپنے مضمون پر عبور حاصل کرنے کے اپنے وقت اور دماغی قوت کا بہت بڑا حصہ انگریزی زبان کی مشکلات کے حل کرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس فطرتی طریقہ تعلیم کی جانب رجوع کرنے کا خیال سب سے پہلے نواب حیدر نواز جنگ بہادر کو پیدا ہوا یہ ایک احسن خیال تھا جس کو نواب صاحب موصوف نے اپنے عقیدے کی ہمت پر عملیت کا جامہ پہنانے کی طرف توجہ کی اور یہ اسی کے نتائج ہیں جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو نے اپنے لکھنؤ کے جلسہ تقسیم اسناد کے خطبہ صدارت میں بیان کیا ہے " یہ ہمارے طلبہ کے لئے نہایت ہی ناکامی کا باعث ہے کہ اُن کو ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ جرأت اور جدت خیال کا سہرا نمایاں عثمانیہ یونیورسٹی کے سر ہے جنہوں نے ابتدا ہی سے اردو زبان کو تعلیم کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کر لیا"۔ اس لیڈر نے پیش قدمی کا نتیجہ کیا ہوا؟ جیسے ہی تعلیم طالب علم کی اپنی مادری زبان میں دی جانے لگی اس کے قدرتی نتیجے کا ظہور ہونے لگا اور ایک ہی سال بعد ہندوستان کے کل حصوں سے وہ ممتحنین جن کو ہمارے طلبہ کا امتحان لینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا یہ رائے ظاہر کرنے لگے کہ ہمارے طلبہ دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کی نسبت بدرجہا بڑھ چڑھ کر رہے ہیں۔ ان ممتحنین میں سے بعض افراد کی رائیں قابل ذکر ہیں۔ ایک صاحب علیگڈھ سے لکھتے ہیں " آپ کے لڑکوں کی جدت طرازی قابل مسرت ہے انہوں نے اپنی جدت تخیل کی قوت کا کامل طور پر اظہار کیا ہے لندن کے ایک بی۔ ایس۔ سی کا بیان ہے "عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کی قوت بیان یقیناً دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ سے بڑھی ہوئی ہے"۔ مسٹر سید علی اکبر کہتے ہیں

"نتائج شاندار ہیں طلبہ نے اپنے مضمون کا مطالعہ اچھی طرح سمجھ کر کیا ہے اور ضروری امور کو ضبط و ذہن کر لیا ہے" ان رایوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلا نتیجہ جو ظہور پذیر ہوا وہ یہ ہے کہ ہمارے لڑکوں نے اپنے مباحث کو بہ نسبت ان لڑکوں کے جنہوں نے غیر زبان میں تعلیم پائی ہے بہتر طریقہ پر سمجھا ہے۔

یہاں لوگوں کی ایک ایسی جماعت بھی ہے، جو یہ کہتی ہے کہ ہم طیلسانوں کی بھی اسی طرح کثیر تعداد پیدا کر رہے ہیں جس طرح فورڈ کے کارخانے سے موٹر تیار ہو ہو کر نکلتے ہیں لیکن میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ خیال اطمینان بخش نہیں ہے کہ ہم نے ایک ایسی قیمتی جنس کا جیسی کہ تعلیم ہے ایک فراواں ذخیرہ حاصل کر لیا ہے میں اسی فورڈ کار کے خیال کو مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں کہ کیا امریکہ نے حمل و نقل کے ارزاں ذرائع بہم پہونچا کر کوئی بدترین کام انجام دیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ جو چیز کثرت سے پیدا ہوتی ہے اس کی قیمت بھی گھٹ جاتی ہے لیکن جو ذخیرہ فورڈ موٹر کی شکل میں یہاں پہنچ رہا ہے وہ کم خرچ اور بالانشین ہے۔ رفتہ رفتہ معیار میں ترقی ہوتی جائے گی اور آئندہ نسل موجودہ نسل سے بھی کہیں بڑھ کر قیمت حاصل کرے گی۔ جب کہ خود ممتحنین نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے کہ ہماری پیداوار جدت و ذہانت کے لحاظ سے خود ان کی یونیورسٹیوں کی پیداوار سے بڑھی ہوئی ہے تو پھر ہم کو ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

بعض اشخاص کہتے ہیں "یہ کل ادبی تعلیم کس غرض کے لئے ہے"۔ یہ کہنے سے اُن کا مطلب یہ ہے کہ وہ ڈگریوں کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ تجارتی اور صنعتی تعلیم کے خواہش مند ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کی ضرورت کو موجودہ زمانہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے لیکن بے علم دماغوں کی ہوا میں صنعت و حرفت کی تعلیم کا پودا نشو و نما نہیں پا سکتا۔ ماہرین صنعت و حرفت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ مبادیات تعلیم سے بہرہ ور ہوں، کل پرزوں کے سمجھنے کے لئے بھی کسی قدر ابتدائی

تعلیم کی ضرورت ہے۔ صنعت و حرفت کی تعلیم دینے کے لئے دماغی تربیت ایک لابدی چیز ہے۔ عملی صنعت مبادیات سائنس ہی پر منحصر ہے۔ طیلسانوں کو تیار کرکے ہم صرف ایک ایسی جنس خام مہیا کر رہے ہیں جو آئندہ چل کر اہل صنعت و حرفت کی شکل میں ڈھالی جا سکتی ہے۔

بعض اشخاص کا یہ خیال ہے کہ "اس قدر کثیر تعداد میں طیلسانوں کو مہیا کرکے ہم صرف ایک بے اطمینانی اور بدعلمی پیدا کر رہے ہیں اور ایک ایسے بے روزگاروں کی جماعت میں اضافہ کر رہے ہیں جو بالآخر موجودہ نظام کو تہ و بالا کر دے گی۔ اگرچہ میں بے روزگاری کے موجودہ اقتصادی مسئلہ کو تسلیم کرتا ہوں لیکن تعلیم کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ اگر یونیورسٹی قائم بھی نہ ہوتی، تو ایسے بے روزگار نوجوان اسی طرح موجودہ رہتے بلکہ اس وقت ان کے روزگار کا مسئلہ علم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اور بھی مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا اس حد تک بے روزگاری کا مسئلہ پیدا کرکے (جو ان اقتصادی اسباب پر مبنی ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں) ہم نے اس کو حل کرنے میں قابل تعریف آسانی پیدا کر دی ہے۔

بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ اس یونیورسٹی میں کوئی جدت نہیں ہے اس بیان کا ماحصل یہ ہے کہ ہم نے کوئی جدت آفریں اعلیٰ خیال اشخاص یا محققین پیدا نہیں کئے۔ ہم کو یہ بیان کسی قدر قابل غور معلوم ہوتا ہے اگر یہی خیال ہے کہ یونیورسٹی ایک ایسی جگہ کا نام ہے جہاں کا ہر شخص ڈارون یا نیوٹن ہی ہو تو یہ خیال بالکل بے سروپا ہے۔ قدیم سے قدیم یونیورسٹیاں بھی جن کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ جدت آفریں مفکرین اور جدید تحقیقات کرنے والوں سے بھری پڑی ہیں ایسے ایک درجن اشخاص کو ایک صدی میں بھی بمشکل پیش کر سکتی ہیں۔ مجھے اس امر میں بھی شک ہے کہ وہ کل اشخاص جو سال بھر میں بدرجۂ اول آنرز کی ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں، انسانی علم میں ایک شمہ بھر بھی اضافہ کرتے ہوں وہ لوگ جن کی ذات سے انسانی علم میں کوئی نیا اضافہ ہوتا ہو فی الحقیقت بہت ہی شاذ ہیں

تمام یورپ میں ایک ہی آئنسٹین اور تمام ہندوستان میں ایک ہی بوس ہے لیکن آپ کو سُن کر تعجب ہوگا کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی کم عمری میں بھی ایک ایسے شخص کو پیدا کیا ہے جس کی ذات سے انسانی علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوا ہے۔ اگر میں آپ کو ایک سرکاری رپورٹ میں سے چند فقرے سناؤں گا تو آپ پر ایک نئی چیز کا انکشاف ہوگا مسٹر بٹین سید حسین نامی طالب علم کا ذکر کرتے ہوئے جو انگلستان میں محققانہ اصول پر تعلیم پا رہا ہے یہ لکھتے ہیں "لوگ اُس کو اس امر پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنی بعض نو ایجاد چیزوں کو محفوظ (پٹینٹ) کرالے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے طلبہ میں سے کم سے کم ایک تو ایسا نکلا ہے جس نے جدید اکتشافات کئے ہیں۔ یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو پرانے اصول تعلیم کے زیر تعلیم چالیس سال میں بھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ پرانے اصول تعلیم کے دلدادہ ہیں ان کو منوانے کے لئے اتنی ہی مثالیں کافی ہیں۔ اسی یونیورسٹی کا ایک طیلسان مسمی صلاح الدین جو ڈھاکہ یونیورسٹی سے بہ درجۂ اول آنرز کی ڈگری حاصل کر کے انگلستان گیا ہوا ہے فلسفہ کے شعبہ میں جدید تحقیقات کرنے میں مصروف ہے۔ لہٰذا آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ عثمانیہ یونیورسٹی ایک ایسی درس گاہ ہے جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں بجا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس امر کا نہایت جوش کے ساتھ اقرار کریں کہ آپ اس یونیورسٹی کے اعزاز کو قائم رکھیں گے اور ہر طرح اس کی ناموری اور شہرت کی محافظت کریں گے۔ اگر آپ اس طریقہ پر عمل کریں تو آپ کی یہ خدمت ملک کے حق میں اس سے کہیں زیادہ قابل قدر ہوگی کہ آپ اس کو کم نگاہی سے دیکھیں۔ اگر آپ اس درس گاہ کی اعانت کریں اور اس کو یہاں تک ترقی دیں کہ وہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے سب پر تفوق حاصل کرلے تو اس میں خود آپ کی بھلائی ہے۔

آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ دوسرے مقامات مثلاً خواتین پونہ کی کارروے یونیورسٹی اور بنارس کی ہندو یونیورسٹی میں حیدرآباد کی مثال کو پیش نظر رکھ کر ملکی زبان میں

تعلیم دینے کی ابتدا کی جارہی ہے۔

تعلیم ایک ایسی چیز ہے جس میں ترقی ہمیشہ ممکن ہے لیکن ترقی پر زور دینے کے ساتھ ہم کو یہ بھی جاننا چاہئیے کہ کونسی چیز ہم کو حقیقی طور پر حاصل ہوئی ہے اور ہم کو ان لوگوں کا شکرگزار ہونا چاہئیے جنہوں نے مہتم بالشان نتائج کے حاصل کرنے میں ہماری مدد کی ہے۔

اب جب کہ نواب مسعود جنگ بہادر ہم سے رخصت ہونے والے ہیں میں پبلک کے روبرو ان کی شاندار خدمات اور سررشتہ تعلیم سے متعلق ان مہتم بالشان ترقیوں کا جو ان کے زمانہ نظامت کی قلیل مدت میں ظہور پذیر ہوئی ہیں نہایت مسرت کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

ان کی نظامت کے ابتدائی زمانے میں صرف دو کالج تھے جن میں تین سو طلبہ تعلیم پاتے تھے برخلاف اس کے اب سات کالج ہیں جن میں بارہ سو طلبہ تعلیم پا رہے ہیں پہلے (۲۴) مدارس فوقانیہ تھے لیکن اب (۴۳) ہیں اور طلبہ کی تعداد دونی ہوگئی ہے مدارس وسطانیہ کی تعداد (۸۷) تھی مگر اب (۱۰۸) ہے تحتانیہ مدارس کی تعداد (۱۱۲۴) سے (۳۶۷۹) تک پہونچ گئی ہے مدارس اور طلبہ کی تعداد میں یہ سہ چند اضافہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کے ناظم تعلیمات کا ان کی ناقابل معاوضہ محنتوں پر شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ بتلائیے اب اُن کے اِن تمام کارہائے نمایاں کا کیا صلہ ہوسکتا ہے؟ تنخواہ اور وظیفہ ایک عہدہ دار کے حسن خدمت کا صرف مالی معاوضہ ہے لیکن اس کا حقیقی صلہ ان لوگوں کی شکرگزاری ہے جن کے لئے اس نے اس قدر محنت و مشقت اٹھائی ہے لہذا ہم ان کو اس امر کا احساس دلانا چاہتے ہیں کہ وہ ہم سے رخصت ہوتے ہوئے اس ریاست ابد مدت کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگوں کا دلی اور مخلصانہ شکریہ اپنے ساتھ لے جارہے ہیں۔ لیکن پھر بھی شکریہ محض ایک جذبہ کی حیثیت رکھتا ہے زیادہ عملی طریقہ جس کے ذریعہ ہم نواب صاحب پر یہ ظاہر کرسکتے ہیں کہ ہم ان کے کس قدر ممنون احسان اور

شکر گزار رہیں ہمارے لئے یہی ہوگا کہ ہم ان کے تشریف لے جانے کے بعد بجائے ان کے قائم کردہ مدارس کو ایک ردی اور گری ہوئی حالت میں چھوڑ دینے کے ہر طرح ان کی حفاظت اور غور و پرداخت کریں تاکہ اگر وہ پھر کبھی ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائیں اور مجھے امید ہے کہ وہ ضرور آئیں گے تو ہم ان کے سامنے یہ کہہ سکیں "دیکھئے جس پودے کو آپ نے لگایا تھا اب وہ بلند و بالا درخت کی شکل میں پھل پھول رہا ہے"۔

خاتمہ پر میں یہ الفاظ کہہ کر کل حاضرین کے جذبات کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم کو ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی تشریف آوری اور شرکت سے جن کی تعلیمی دلچسپی مشہور آفاق ہے کس قدر شرف اور عزت حاصل ہوئی ہے۔

معتمد کی پیش کردہ رپورٹ نہایت اطمینان بخش ہے اور انجمن کی آیندہ ترقی و سرسبزی کا پتہ دے رہی ہے جس کو کارآمد بنانے کے لئے بہت سی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ میں اور اس کا ہر رکن اس کی کامیابی اور فلاح و بہبود کا دل سے خواہاں ہے۔

آخر میں ہم بارگاہ خسروی میں اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ و دولتہ کی ان کل عنایات خسروانہ اور شاہانہ فیاضیوں کا جو تعلیمی معاملات کے متعلق ظاہر فرمائی گئی ہیں اور نیز اس علمی سرپرستی اور ان تمام تجاویز کی منظوریوں کا جو اپنی رعایا کی ترقی و بہبود کے متعلق شرف صدور لائی ہیں خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ڈنمارک میں تعلیم بالغان

جناب سید محمد حسین صاحب بی۔ اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

تعلیم ایسی چیز نہیں، جو بنی نوع انسان پر کسی خاص وقت اور مقام کے لئے لازمی قرار دی گئی ہو بلکہ اس کی ضرورت ابتدائے عالم سے رہی اور انتہائے عالم تک رہے گی اور اس کا وجود، خلقت عالم سے اس وقت تک کسی نہ کسی نہج اور طریقے سے رہا اور رہے گا۔ البتہ یہ ہوا کہ مختلف ازمنہ اور ممالک میں نظام تعلیم بھی مختلف رہے اور پھر یہ نظام تعلیم بہ طور خود مرتب نہیں ہوئے، بلکہ ملک کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالات پر ان کی ترتیب کا انحصار رہا۔ تعلیم تمدن کا بڑا جزو ہے اور اس کی ترقی دوسرے شعبہ جات تمدنی کے ارتقاء پر منحصر ہے تعلیمی ترقی کہیں تنہا نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ جس ملک کے نظام تعلیم کو کمال حاصل ہوا تو دوسرے اسباب اور حالات کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے یعنی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کے ساتھ ساتھ ہوا۔ پس کسی ملک کے تعلیمی حالات اور تاریخ کو کما حقہ سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ اس ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے اگر میں ڈنمارک کے محض تعلیمی حالات آپ کو سنا دوں اور سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات پر مطلق روشنی نہ ڈالوں تو مضمون بے ربط اور بے سلسلہ ہو جائے گا۔

"ملک ڈنمارک"، جو جزیرہ نمائے جٹلینڈ اور متعدد دیگر جزائر کا مجموعہ ہے، ایک چھوٹا سا زراعتی ملک ہے۔ اس کا مجموعی رقبہ ۱۶ ہزار مربع میل ہے یعنی صوبہ اورنگ آباد کے رقبے سے ۳ ہزار مربع میل کم ہے۔ اس کی مردم شماری ۳½ ملیون ہے، جو ممالک محروسہ سرکار عالی کی مردم شماری کا ربع ہے۔ آمدنی تقریباً ۴۴ کروڑ کرونر ہے۔ اس ملک کے

جغرافیائی حالات یہ ہیں کہ ملک کا زیادہ تر حصہ سطح اور سمندر کی سطح سے صرف ۷۵ فیٹ بلند ہے۔ زمین کمزور ہے اور صدہا میل ریت کے چٹیل میدان ہیں۔ ملک چاروں طرف سمندر سے گھرا اور کھلا ہوا ہے۔ سمندر کی ہوائیں کاشت کو خراب کرتی ہیں۔ قدرتی ذرائع آب پاشی مفقود ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا دریا گوونیا ہے جس کا طول صرف ۸۰ میل ہے۔ موسم بھی ناموافق ہے، جو سمندر کی ہواؤں کی وجہ سے اکثر سرد اور مرطوب رہا کرتا ہے۔ سال میں ۹۹ دن کہر رہتا ہے اور ۵۰ دن سے زیادہ دھوپ نظر نہیں آتی۔ غرض کہ قدرتی مشکلات کافی موجود ہیں۔

ان قدرتی مشکلات کے علاوہ آج سے ایک سو سال قبل سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات بھی نہایت ہی یاس انگیز تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک سیاسی قوت بادشاہ، امرا اور زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ کسانوں اور عام رعایا کی حالت ناقابل بیان تھی۔ امور مملکت میں عوام یا کاشت کاروں کو مطلق دخل نہ تھا۔ حکومت کی جانب سے جو قوانین نافذ کئے جاتے تھے، وہ عوام اور کاشت کاروں کی فلاح و بہبود کے عوض زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفید مطلب ہوتے تھے۔

ان اندرونی مصائب کے علاوہ بیرونی آفتیں بھی، لڑائیوں وغیرہ کی شکل میں، ملک پر نازل ہوئیں، جن سے ملک کی حالت اور بھی تباہ و برباد ہوگئی۔ سیاسی حالت کی ابتری اور ذرائع آمدنی کے فقدان کی وجہ سے ملک میں بے کاری اور افلاس کا عام مرض شائع ہوگیا، جن کے باعث جو سماجی خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں، اور بھی نمایاں ہوگئیں۔ الغرض آج سے ایک صدی قبل ڈنمارک کی حالت یہ تھی کہ تمام ملک سیاسی، اقتصادی اور سماجی خرابیوں کا آماج گاہ بنا ہوا تھا اور قوم قریب قریب مردہ ہو چکی تھی۔

ڈنمارک میں سیاسی اصلاحات کی ابتدا ۱۷۸۴ء سے ہوئی اور اس کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ بالآخر یہ ہوا کہ کاشت کاروں اور عوام کو مساوی حقوق ملے، جن کی رو سے

کاشت کاروں کو بھی پارلیمنٹ میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ چنانچہ اب ڈنمارک میں سیاسی قوت بالکلیہ کاشت کاروں کے ہاتھ میں ہے اور پارلیمنٹ میں ۷۵ فی صد ان کی تعداد ہے۔

اقتصادی حالت کی اصلاح یوں عمل میں آئی کہ ملک میں چند افراد ایسے پیدا ہوئے جو زراعتی اصلاحات کی جانب متوجہ ہو گئے اور اپنی اَن تھک کوششوں سے ملک کی ویران زمینوں کو آباد کیا، چٹیل میدانوں میں درخت لگائے، اُفتادہ اور کمزور زمینوں کو مختلف طریقوں سے قابل کاشت بنایا، آب پاشی کے ذرائع پیدا کئے، ملک میں تحریک امداد باہمی کو جاری کر کے اہل ملک کو ملکی پیداوار متفقہ طور پر پیدا اور فروخت کرنے کے طریقے بتلائے۔ اور بھی اسی قسم کی تدابیر اختیار کی گئیں، جن سے ملک کی اقتصادی حالت درست اور رو بہ ترقی ہوئی۔ ان کی ساری جدوجہد اور جگر کاوی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ملک جو آج سے چند سال پیشتر نہایت ہی مفلس سمجھا جاتا تھا، اب تمام یورپ خصوصاً انگلستان کے ایکماج کی منڈی بن گیا ہے اور باوجود اتنے چھوٹے رقبے، کم مردم شماری اور صنعت و حرفت کے نہ ہونے کے، صرف زراعت کے ذریعہ ۴۴ کروڑ کروڑ کی آمدنی پیدا کرتا ہے۔

سیاسی اور اقتصادی حالات کا سنبھلنا ہی تھا کہ سماجی حالت خود بہ خود سنبھلنے لگی اور آج ایسی حالت ہے کہ یورپ اور امریکہ کو اس پر رشک آتا ہے اور ان ممالک کے ہزاروں باشندے ہر سال اس ملک کی حالت دیکھنے اور سبق لینے آتے ہیں۔ جیسے کہ بعض ہی خواہانِ قوم ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالت کے سنبھالنے میں منہمک تھے اور انہیں اِن امور میں سخت دشواریاں پیش آ رہی تھیں تو ایک ہستی ایسی پیدا ہوئی جس نے بتایا کہ تعلیمی حالت کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ جب تک قوم تعلیم یافتہ نہ ہو گی ممکن نہیں کہ اس میں اپنے اقتصادی اور سیاسی حالات کو درست کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ یہ ہستی کون تھی؟ بشپ گرونڈوک، وہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے سب سے پہلے اپنی قوم کو مطلع کیا کہ

جب تک ملک تعلیم یافتہ نہ ہو شاہ راہ ترقی پر گام زن نہیں ہو سکتا اور یہ کہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیئے بہتر ذریعہ یہ ہے کہ تعلیم بالغان کا انتظام ملک میں عام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ تم نے ابتدائی تعلیم کو جبری کر لیا ہے، لیکن بچوں کی کثیر تعداد اوائل عمر ہی میں تعلیم ترک کر کے زندگی کی کشمکش میں پڑ جاتی ہے اور تھوڑی ہی مدت میں سب پڑھا لکھا نسیاً منسیا ہو جاتا ہے اور وہ نرے جاہل کے جاہل اور بے شعور رہ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ تمام روپیہ جو ان کی ابتدائی تعلیم میں صرف ہوا بے کار اور برباد جاتا ہے۔ دوسری طرف ان کے آئینہ قلب پر جہالت کا زنگ چڑھ جانے سے وہ اپنی سابقہ حالت پر عود کر آتے ہیں اور ان میں اور ملک کے ان پڑھ افراد میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ گرونڈوگ نے ان لوگوں سے جو سیاسی حقوق کے حاصل کرنے کی جد و جہد میں سرگرم تھے، یوں مخاطب کیا کہ جب تک ملک کے کاشت کار، مزدور اور عوام تعلیم یافتہ نہ ہوں، اگر سیاسی حقوق مل بھی جائیں تو کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ جہلا، نہ تو انتخاب کے قابل ہوں گے اور نہ پارلیمنٹ اور دیگر قومی مجلسوں میں نمایندگی کر سکیں گے۔ پس اے برادران وطن اس چیز کو سمجھو اور ایسی تدابیر اختیار کرو کہ تمہارے ملک کے بالغ عمر افراد کو ایسے مواقع مل سکیں کہ جن کے ذریعے وہ پھر ایک دفعہ تعلیم کے زیر اثر آ سکیں اور بھولے ہوئے معلومات کو تازہ اور اپنے قلوب کو علم کی روشنی سے منور کر سکیں۔

بشپ گرونڈوگ کی اس نصیحت نے، جو سچے اور دردمند دل سے نکلی تھی، قوم پر اثر کیا۔ قوم نے اس صدا پر لبیک کہا اور اس ہادی کی شاہ راہ ہدایت پر چلنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ڈنمارک میں تعلیم بالغان کا نصاب اس قدر مکمل اور اعلیٰ ہے کہ کوئی ملک اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا، بلکہ اس خاص شعبے کی حد تک دوسرے ملک ڈنمارک کو اپنا استاد اور رہنما مانتے ہیں۔ کوئی سال ایسا نہیں گزرتا ہو گا کہ ممالک یورپ

اور امریکہ سے ہزار ہا افراد اس ملک کو محض اس غرض و غایت سے نہ آتے ہوں کہ یہاں کی تعلیم بالغان اور زراعتی تعلیم کے انتظامات کا معائنہ اور مطالعہ کریں۔

جب بشپ گرونڈوگ نے دیکھا کہ اُن کی نصیحت نے پبلک پر اثر کیا تو انہوں نے فوراً تعلیم بالغان کی اشاعت کے لئے تحریک پیش کی کہ ایسے مدارس قائم کئے جائیں، جن میں امیر سے لے کر غریب تک کو بلا امتیاز طبقہ شریک اور تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو چنانچہ ایسے مدارس قائم ہوئے، جو اب تک جاری ہیں اور "فوک ہائی اسکول" یا پیپل اسکولس کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر دیہات اور اضلاع میں قائم کئے گئے ہیں جن میں تقریباً دیہات کے باشندے اور خصوصاً کاشت کار شریک ہوتے ہیں اس تحریک کا منشار یہ تھا کہ ملک میں ایسے مدارس کھولے جائیں، جن میں ملک کے نوجوان مرد او عورتیں بلا امتیاز درجہ و طبقہ شریک ہوسکیں اور جہاں مادری زبان میں "زندہ لفظ" یعنے گفتگو اور لکچر وغیرہ کے ذریعہ ایسی تعلیم دی جائے، جو روح پرور ہو اور نوجوانوں کو اس قابل کردے کہ بصداق من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اپنے آپ کو پہچانیں اور پھر خدا کو پہچان سکیں اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کردی جائے کہ جسمانی محنت اور مشقت کو ننگ و عار نہ سمجھیں اور امیرانہ عیش پرستی اور لہو و لعب کی زندگی پر غربت کی سادہ زندگی کو نہ صرف ترجیح دیں، بلکہ اس کے عادی بنیں اور اُن میں وطن کی محبت، قومیت اور ایثار کا مادہ پیدا ہو۔ بشپ گرونڈوگ کی تحریک اور ان کے خیالات رفتہ رفتہ بادشاہ کرسچین ہشتم کے کان تک پہنچے اور دربار میں رسائی ہوئی۔ بادشاہ اور ملکہ ان کے اس قدر ہم خیال اور معتقد ہوئے کہ تاریخی مقام سورؔ میں ایک فوک ہائی اسکول قائم کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا لیکن موت نے بادشاہ کو مہلت نہ دی اور وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے قبل انتقال کرگیا۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد ملکہ نے اس کام کی تکمیل کا ارادہ کرلیا، لیکن گورنمنٹ نے اس کی بے حد مخالفت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری طور سے مدرسہ قائم نہ ہوسکا۔ یہ بات

قابل ذکر ہے کہ گو بشپ گرونڈگ فوک ہائی اسکول کے بانی اور موجد تھے، لیکن وہ خود کوئی اسکول قائم کرسکے اور نہ انہوں نے تفصیلی اسکیم یا نصاب مرتب کیا۔ قسام ازل نے اُن کی تحریک کو عملی صورت میں لانے کا کام اُن کے مریدان خاص کے سپرد کیا جن میں سب سے ممتاز کرسٹن کولڈ ہیں۔ گرونڈوگ نے صرف تحریک قوم کے سامنے پیش کی اور سالہا سال اس کی تبلیغ میں مصروف رہے اور جب دیکھا کہ دوسرے نوجوان جوشیلے بہت لوگ ان کے ہم خیال ہوگئے ہیں اور اُن کا نہال تحریک پھل پھول رہا ہے تو خود شہر واٹو میں پادری ہوگئے اور باقی عمر وعظ و نصیحت میں گزار دی یہاں تک کہ ۱۸۷۲ء میں ۹۰ سال کی عمر میں اس دارفانی سے چل بسے۔ اُن کی موت پر سارے ملک نے ماتم کیا اور محسوس کیا کہ اُن کا روحانی رہبر جاتا رہا۔ قوم نے اس عظیم الشان ہستی کی وہ قدر و منزلت کی کہ آج تک اُن کا نام زندہ ہے اور ملک کا ایک ایک بچہ جانتا ہے کہ یہ کون تھے اور اُنہوں نے قوم کے لئے کیا کیا۔ بشپ صاحب تو گذر گئے، لیکن اپنے معتقدین کی ایسی فوج چھوڑ گئے، جو اُن کے اعتقادات سے مسلح ہو کر مخالفین کے ساتھ برابر جنگ کرتی رہی اور کر رہی ہے۔ اُن کی حکمرانی تمام قوم پر ہے اور پورا تسلط اور اثر ہے۔

گرونڈگ کے خیال کے مطابق تعلیم بالغان کے لئے پہلا فوک ہائی اسکول ۱۸۴۴ء میں قصبہ ریوڈنگ، جو شمالی سلیوگ میں ڈنمارک اور جرمنی کے حدود پر واقع ہے، قائم ہوا۔ چند محبان وطن اس کے بانی ہوئے اور اہل شہر اور کاشت کاروں نے اُس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور فراخ دلی سے مالی امداد کی۔ یہ مدرسہ جاری تھا کہ ۱۸۶۴ء میں ڈینو جرمن جنگ شروع ہوئی اور جرمنی گولہ باری کی ڈنمارک تاب نہ لا سکا اور شکست کھائی اور شکست کے بعد جرمنوں نے مدرسہ بجبر برخاست کر دیا۔ یہ شکست اور مدرسے کی بربادی نے ڈینس کو پست نہیں کیا بلکہ الٹے تعلیم بالغان کے لئے ایک فوک ہائی اسکول قائم کرنے کا عزم بالجزم کرلیا۔ مدرسہ کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی، اور کولڈ کا کل اثاثہ زندگی ۵۵ پونڈ تھا،

جو اُس نے سمرنا کے قیام کے زمانہ میں بچائے تھے یہ رقم مدرسے کے قیام کے لئے کافی نہ تھی اس لئے وہ فوراً کوپن ہیگن پہنچا اور بشپ گرونڈوگ سے اظہار مدعا کیا۔ گرونڈوگ کے مدرسے سے ۰۰، ۲ پونڈ چندہ جمع ہوا اور یہ رقم لے کر کولڈ اٹھ کھڑا ہوا۔ بشپ صاحب حیرت سے اس سے کہتے رہے کہ بھائی کہیں ۱۲۵ پونڈ میں فوک ہائی اسکول قائم ہو سکتا ہے اس نے ایک نہ سنا اور یہ کہتے ہوے کہ ”خدا ناداروں اور بیکسوں کا حامی و مددگار رہا کرتا ہے“ اپنا راستہ لیا اور جزیرۂ فیون میں پہنچ کر مقام رسلنگ میں مدرسہ قائم کر دیا اور ۱۴ و ۱۵ سال کی عمر کے ۱۵ طلبہ جمع کئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کولڈ نے جب اپنی اسکیم گرونڈوگ کو بتلائی تھی تو طلبہ کی عمر کے متعلق دونوں میں بڑی بحث ہوئی۔ کولڈ نے اپنی اسکیم میں داخلہ کی عمر ۱۴ اور ۱۵ سال رکھی تھی۔ لیکن گرونڈوگ کا اصرار تھا کہ ۱۸ سال سے کم نہ ہو۔

کولڈ اپنی رائے پر قائم رہا اور ۱۴ و ۱۵ سال کے طلبہ شریک کئے، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے محسوس کیا کہ گرونڈوگ کا خیال صحیح تھا۔ اِس قدر کم سن طلبہ اُس کے خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اِس کے برعکس ۱۸ و ۲۰ برس کے نوجوان نہایت مسرت اور شوق کے ساتھ اس کے لکچر سنتے اور سمجھتے تھے۔ پس دوسرے سال سے اس نے شرکت کی عمر ۱۸ سال قرار دی اور اب تک یہی عمل جاری ہے۔

مدرسے کی عمارت کے لئے چند ایکڑ زمین، اُس نے خریدی اور اُس میں ایک معمولی گھاس پھوس کی چھت کا مکان تعمیر کیا۔ جس میں جماعت کا ایک کمرہ، سونے رہنے کا ایک کمرہ اور باورچیخانہ تھا۔ کولڈ اور اس کا مددگار دونوں موجود ہونے سے طلبہ ساتھ ہی مدرسے میں رہا کرتے اور سوتے بیٹھتے تھے۔ کھانے پکانے اور مدرسہ کی صفائی کا کام کولڈ کی بہن انجام دیا کرتی تھی۔ طلبہ سے صرف ۱۲ شلنگ ماہانہ خوراک کی فیس لی جاتی تھی۔ غذا بالکل سادہ اور معمولی ہوا کرتی تھی۔ نصاب تعلیم حسب ذیل مضامین پر مشتمل تھا۔

(۱) تاریخ ڈنمارک (۲) انجیل کے تاریخی حالات و واقعات (۳) جغرافیہ (۴) ڈینش زبان

(۵) موسیقی۔ یعنے فوک سانگس، گانا، رزم خوانی۔

ان مضامین کی تعلیم بالکل زبانی ہوا کرتی تھی۔ کولڈ تاریخ ڈنمارک اور انجیل کے سبق دیا کرتا تھا۔ اُس کی تقریر کی روانی اور طلاقت لسانی کی یہ حالت تھی کہ جب یہ لکچر دیتا تو معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کا دریا بہہ رہا ہے۔ اس کا خود قول ہے کہ "جب میں تقریر کرتا ہوں تو مجھ پر الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ میرا لفظ لفظ نوجوانوں کے قلوب میں اثر کر رہا ہے اور وہ سمجھ کر مزے لے رہے ہیں"۔ بہر حال تمام دن تعلیم و تعلّم میں گزرتا' بلکہ رات میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے طلبہ اساتذہ روحانی اور علمی مسائل پر بحث کرتے کرتے سو جاتے ہیں اس مدرسے کے قیام کی غرض و غایت یہی تھی کہ "زندہ الفاظ" کے ذریعے نوجوانوں میں ایسی روح پھونک دی جائے' جو اُنہیں اپنے نفس' اپنے خالق اور اپنے ماحول کو کما حقہٗ پہچاننے کے قابل کردے۔ چنانچہ کولڈ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ میرا مقصد اس درسگاہ کے قیام سے محض نوجوانوں کی تعلیم نہیں بلکہ روحانی ارتقا ہے۔ بہر حال نصاب میں کسی خاص طریقہ تعلیم کی جکڑ بندیاں نہ تھیں۔ مدرسے کے قیام کے چند روز بعد ایک قابل معلّم مدرسے میں بحیثیت مددگار شریک ہوا اور کولڈ سے دریافت کیا کہ کن مضامین کی تعلیم دے۔ کولڈ نے نہایت بے پروائی کے ساتھ جواب دیا کہ "میں خود صبح میں ایک گھنٹہ نوجوانوں کو لکچر دیتا ہوں اور پھر شام کو اپنی زندگی کے تجربے اور مشاہدات بیان کرتا ہوں۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ درمیانی وقت میں تم نوجوانوں کو شرارت نہ کرنے دو اور کسی نہ کسی طرح مصروف رکھو اور جو چاہو پڑھاؤ"۔ کولڈ خود بہت سادہ غذا اور معمولی لباس کا عادی تھا۔ اس کا لباس اس قدر ارزاں اور معمولی ہوا کرتا تھا کہ ناواقف اس کو ایک غریب کسان سمجھتے تھے۔ جو نوجوان اس کے زیر اثر ہوتے انہیں یہ ہمیشہ کفایت شعاری اور محنت کی تاکید کیا کرتا تھا اور کہا کرتا کہ محنت مزدوری کرنے والے' دودھ دوہنے اور گوبر اٹھانے والے بھی شریف النفس و بلند خیال ہو سکتے ہیں۔ کولڈ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل ڈنمارک کے کئی ملیون گروہ

بچ گئے، جو وہ لباس و خوراک میں بے کار صرف کرتے تھے اور نہر اہا آرام طلب کاشت کار جو مزدوروں سے کام لیا کرتے تھے، اپنی کھیتیوں میں خود کام کرنے لگ گئے۔ کولڈ اپنا مدرسہ قائم کر کے خاموش نہ بیٹھا بلکہ اطراف واکناف کے سرکاری مدارس پر حملے شروع کئے اور پبلک میں ان کی سخت مخالفت شروع کی۔ یہ دیکھ کر حکومت نے پھر اس کا پیچھا کیا اور قریب تھا کہ یہ مدرسہ بند کر دیا جائے۔ لیکن گرونڈوگ کے اثر اور ملک کی ہمدردی نے اُسے بچا لیا۔ حکومت نے ایک بورڈ مقرر کیا اور حکم دیا کہ مدرسے کا معائنہ کر کے رپورٹ پیش کرے۔ بورڈ کے ارکین نے بڑی سختی کے ساتھ معائنہ کیا اور نوجوانوں کا امتحان لے کر بہت خوش ہوئے۔ زوردار الفاظ میں مدرسے کے مفید مطلب رپورٹ پیش کر کے امداد کی تحریک کی۔

اس واقعہ کے بعد کولڈ کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ اُس نے مختلف مقامات کے دورے کئے اور مدارس قائم کرنے شروع کئے چنانچہ اپنی موت سے قبل تک کئی مقامات پر فوک ہائی اسکولس اُس نے قائم کر دئے۔

کولڈ کے بعد شروڈر وغیرہ اس کے قائم مقام ہوئے اور کثرت سے مدارس قائم ہوئے۔ اس وقت ڈنمارک میں تقریباً ۶۰ فوک ہائی اسکولس ہیں اگرچہ ان مدارس کے اصول اور مطمح نظر وہی امور ہیں جو گرونڈوگ اور کرسٹن کولڈ وغیرہ بتا گئے تھے لیکن جزئیات میں تھوڑی تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ مقصد وہی ہے لیکن تمدن کے بڑھتے ہوئے ضروریات نے مجبور کیا کہ ذرائع حصول مقصد بدل دئے جائیں۔ مثلاً بعض مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ طریقہ تعلیم بدل گیا۔ طلبہ کو کتب بینی کا شوق دلایا جاتا ہے، مضامین پر طبع آزمائی کی اجازت دی جاتی ہے۔ ڈنمارک کے قدیم افسانوں کے بجائے ڈنمارک کی تاریخ اور ادب پر زور دیا جاتا ہے۔ معاشیات اور ملک کی سماجی تاریخ نصاب کا اہم جز بن گئے اور تمام مدارس کے حالات کم و بیش ایک ہی ہیں مثلاً

(۱) فوک ہائی اسکولس اضلاع میں واقع ہیں کوپن ہیگن یا کسی اور بڑے شہر میں اُن کا وجود نہیں

تقریباً سب مدارس پُر فضا مقامات پر آبادی سے دور تعمیر کئے گئے ہیں۔ سب مدارس ذاتی امکنہ میں ہیں جو مختلف حیثیت اور مکانیت کے ہیں لیکن سب وسیع، ہوادار، صاف، پاک ہیں اور ہر مدرسے میں جمنازیم بھی ہے۔

(۲) تمام مدارس اقامتی یعنے (RESIDENTIAL.) ہیں۔ تعداد طلبہ بالعموم ۷۰ یا ۸۰ ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے مدارس میں ۵۰ طلبہ ہوتے ہیں۔ دو تین بڑے مدارس میں تعداد طلبہ، ۵۰۰ تک ہے۔

(۳) ان مدارس میں ذکور وانات دونوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ موسم سرما میں ستمبر سے اپریل تک ذکور تعلیم پاتے ہیں اور موسم گرما میں ۳ ماہ کے لئے طالبات آتی ہیں۔ ذکور وانات جو ان مدارس میں تعلیم پاکر نکلتی ہیں، اُن کی مجموعی تعداد تقریباً نو ہزار ہوتی ہے جن کی عمریں ۱۸ سے لے کر ۳۰ سال تک ہوتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً طلبہ اور طالبات زراعت پیشہ ہوتے ہیں اور تعلیم ختم کرنے کے بعد پھر اسی پیشے پر قائم رہتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد جو طلبہ تعلیم ثانوی جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں امتحان تحریری اور تقریری کے ذریعہ ان کی استعداد۔ قابلیت اور آئندہ تعلیم پانے کی صلاحیت کی خوب جانچ کی جاتی ہے اور اس کے بعد جنہیں آئندہ تعلیم پانے کے قابل سمجھا جاتا ہے، مڈل اسکولس میں شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ تعداد قلیل ہوتی ہے جو ۱۰ فی صدی سے زائد نہیں۔ باقی کو سختی کے ساتھ روک دیا جاتا ہے۔ ان میں سے جو زراعت پیشہ ہوتے ہیں وہ واپس جاکر زراعت کے کام میں مشغول ہوجاتے ہیں، مزدور پیشہ محنت مزدوری میں لگ جاتے ہیں اور پھر اکثر ان میں سے رواجاً ورسماً ۱۸ سال کی عمر میں مدارس تعلیم بالغان یعنے فوک اسکولس میں شریک ہوتے ہیں۔ سالانہ جو طلبہ ان مدارس میں شریک ہوتے ہیں اُن میں ۵۵ فی صدی ایسے متوسط درجے کے کسانوں کی اولاد ہوتے ہیں، جن کے پاس ۱۵ سے ۱۰۰ ایکر تک زمین اور ۴ سے ۳۰ تک گائے ہوتی ہیں

۷ فی صدی ان چھوٹے کسانوں کی اولاد ہوتی ہے جو ۸ سے ۵ آٹھ ایکڑ زمین اور ایک سے چار تک گائے رکھتی ہے۔ باقی ۲۱ فی صدی مزدور پیشہ۔ صناعین اور خوش باش لوگوں کی اولاد ہوتی ہے۔

(۴) سب مدارس خانگی ہیں حکومت سالانہ امداد دیتی ہے جس کی تعداد تمام مدارس کے لئے تقریباً ایک ملیون کرونز سالانہ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ طلبہ سے قلیل فیس لی جاتی ہے جو تقریباً ۷ کرونز ماہانہ ہوتی ہے۔ اس میں کھانا، کمرہ کا کرایہ اور ٹیوشن فیس سب شامل ہیں۔ بعض بڑے مدارس میں فیس اس سے کچھ زیادہ ہے لیکن کہیں بھی ۸ کرونز سے زاید نہیں۔ سرکار بھی ان کی مالی مدد کرتی ہے۔

(۵) نصاب تعلیم کوئی خاص نہیں ہے اور نہ سررشتۂ تعلیمات کی جانب سے مقرر ہوتا ہے۔ بلکہ ہر مدرسہ اپنا نصاب آپ مرتب کرتا ہے۔ اہل ڈنمارک کا خیال ہے کہ دماغی نشو ونما اور روحانی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ "کلچرل" علوم کی تعلیم دی جائے۔ اس کے علاوہ بعض مضامین ایسے ہیں کہ جو ہر فرد کے لئے، چاہے وہ شہری ہو یا دیہاتی مزدور ہو یا کاشتکار، مناسب اور مفید ہیں جیسے جغرافیہ، تاریخ اور زبان مادری۔ پس ان دو اصول کو مدنظر رکھ کر نصاب کی ترتیب دی جاتی ہے، جو کم وبیش سب مدارس کا ایک ہے اور مضامین ذیل پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) ڈنیش ادب — (۶) حساب اور بک کیپنگ
(۲) تاریخ — (۷) ڈرائنگ۔
(۳) جغرافیہ — (۸) موسیقی
(۴) باٹنی (علم نباتات) زوالوجی (حیوانات) — (۹) جمناسٹک
(۵) مبادیات کیمیا وطبعیات — (۱۰) پکوان (اناث کے لئے)

اس کے علاوہ دلچسپ مضامین پر بحث ہوتی ہے اور دور حالیہ کے اہم مسائل پر

گفتگو ہوتی ہے، جیسے لیگ آف نیشن، بولشیوزم وغیرہ۔ ہر مدرسے میں مضامین بالا پورے پورے نہیں پڑھائے جاتے بعض چھوٹے مدارس میں صرف ڈینش ادب، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور ورزش پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اب میں مدرسین کا حال بیان کرتا ہوں۔ ان مدارس کی کامیابی کا بڑا راز ان کے اساتذہ کی علمی قابلیت، اپنے کام سے عشق اور ایثار ہے۔ اس وقت تقریباً ایک ہزار اساتذہ مختلف فوک ہائی اسکول میں مامور ہیں اکثر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور ٹرینڈ ہیں۔ بعض فوک ہائی اسکول کے کامیاب شدہ بھی ہیں، جو غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے مامور کرلئے گئے۔ ان مدارس میں جگہ پانے کے لئے صرف ڈگریوں اور علمی قابلیت کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اصل چیز جو دیکھی جاتی ہے، وہ تعلیم سے دل چسپی اُن کا ذاتی شغف اور ایثار ہے۔ ابتدًا بطور امیدوار کے مامور کیا جاتا ہے اور جب چند روز کے تجربے سے ان صفات کی کمی معلوم ہوجاتی ہے تو چاہے وہ امیدوار کتنی ہی قابلیت کیوں نہ رکھتا ہو، اُس کی علیحدگی کا نوٹس دے دیا جاتا ہے۔ ہر مدرس کو گرونڈوگ کے فلسفۂ تعلیم کا معتقد ہونا پڑتا ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والا فوک ہائی اسکول کا مدرس نہیں ہوسکتا۔ صدر مدرس کے فرائض نہایت اہم ہیں۔ سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جملہ طلبہ سے فرداً فرداً واقف ہو۔ اس کا دروازہ ان کے لئے ہمیشہ کھلا رہے تاکہ جس وقت طلبہ چاہیں، اُس کے پاس آئیں اور اپنے مشکلات حل کریں۔

پرنسپل اور مددگار سب کے لئے لازم ہے کہ شب و روز مدرسے میں مقیم رہیں شادی شدہ مدرسین بھی اہل وعیال کے ساتھ رہتے ہیں۔ اُن کی عورتیں مدرسے کے کاموں میں خصوصاً سوشل محفلوں اور جلسوں میں حصہ لیتی اور اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتی ہیں بہرحال پرنسپل، مددگار اور طلبہ سب اس طرح خلا ملا رکھتے اور ایسے شیر و شکر ہیں کہ ان سب پر ایک خاندان کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

اب میں چند مدارس کے تختہ اوقات کا ذکر کرتا ہوں جنہیں میں نے بچشم خود دیکھا ہے
صبح کے ۶ بجے بڑے زور وشور سے مدرسے کی گھنٹی بجتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی طلبہ اپنے بستروں سے اٹھ کر کمروں کے دروازہ اور کھڑکیاں کھول کر بستر اور کمروں کی صفائی کر لیتے ہیں پھر منہ ہاتھ دھو کپڑے پہن لیتے ہیں۔ ½۶ بجے دوسری گھنٹی ہوتی ہے۔ سب لکڑی کے جوتے پہنے ہوئے کھٹ کھٹ آواز کرتے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ قہوہ نوشی کے بعد جو ۵ یا ۱۰ منٹ میں ختم ہو جاتی ہے نماز ہوتی ہے۔ اس میں شرکت لازمی نہیں جس کا جی چاہے شریک ہو سکتا ہے۔ ۸ بجے سے ۹ تک پہلا لکچر ہوتا ہے جس کی ابتدا اور انتہا گرونڈوگ کے کسی نظم کے گانے سے ہوتی ہے۔ ۹ بجے طلبہ اپنے کمروں کو واپس ہوتے اور جمناسٹک کے لئے لباس بدل کر جمنازیم ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں نصف گھنٹہ ان سے ایسی سخت ورزش لی جاتی ہے کہ پسینہ میں نہا جاتے ہیں۔ جمناسٹک ختم ہونے پر نہا دھو اور لباس پہن کر ۱۰ بجے تک کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں جمع ہو جاتے ہیں کھانا ۱۵ یا ۲۰ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو برابر ۲ بجے تک جاری رہتا ہے۔ ۲ بجے دوپہر کا کھانا جسے وہاں ڈنر کہتے ہیں دیا جاتا یہ بہت ہی سادہ اور زود ہضم ہوتا ہے یعنی شوربا گوشت ترکاری کے ساتھ اور میوہ ڈنر کے بعد ½۳ تک وقفہ ہوتا ہے جو طلبہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں اور پھر ½۳ سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو ½۶ بجے تک جاری رہتا ہے۔ ۷ بجے شام کے رات کا کھانا ہوتا ہے جس کو یہ لوگ سپر کہتے ہیں۔ سپر کے بعد طلبہ "کامن روم" میں جمع ہو کر کچھ دیر خوش گپی کرتے اور گاتے بجاتے ہیں۔ پھر ۸ بجے سے ۱۰ بجے تک کتب خانہ میں کتب بینی اور مطالعہ کرتے ہیں۔ ۱۰ یا ۱۱ بجے روشنی بند ہو جاتی ہے اور سب سو جاتے ہیں۔ فوک ہائی اسکول کے یہ اوقات ہیں جن سے آپ کو ظاہر ہوگا کہ طلبہ سے کس قدر کام لیا جاتا ہے اور خود مدرسین کس قدر محنت کرتے ہیں۔ ان سب حالات کے

سننے کے بعد ممکن ہے آپ کو یہ خیال گزرے کہ ۶ یا ۸ مہینے کی تعلیم سے کیا حاصل جب یہ اپنے گھروں کو واپس ہو کر کاروبار میں مشغول ہوتے ہوں گے تو سب بھول جاتے ہوں گے ایسا نہیں ہے بلکہ ایک دفعہ فوک ہائی اسکول سے نکلنے کے بعد مدت العمر اُن کا مطالعہ جاری رہتا ہے اور ان کے علمی مشاغل جاری رہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر قصبے اور ہر مقام پر فوک ہائی اسکول اور دیگر مدارس تعلیم بالغان کے لٹریری یونین ہیں۔ جب کبھی کوئی اس قصبے کا باشندہ فوک ہائی اسکول سے تعلیم پاکر واپس ہوتا ہے تو فوراً اس کو اس کلب اور یونین کا ممبر ہو جانا پڑتا ہے جن کے اراکین کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہفتہ وار جلسہ کریں اور اُن سب اہل قصبہ کو جمع کریں۔ جو فوک ہائی اسکول نہ جا سکتے تھے اور مختلف مفید مضامین پر انہیں لکچر دیں۔ اس طرح سے اُس نوجوان کو جو فوک ہائی اسکول سے واپس آتا ہے تقریر کرنی پڑتی ہے اور اس کے لئے ہمیشہ مطالعہ جاری رکھنا لازم ہو جاتا ہے۔ ان لکچروں کی شان بھی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے وقت مقررہ پر گاؤں کے پبلک ہال میں سب مرد عورت، جوان بوڑھے جمع ہو جاتے ہیں اور بڑی توجہ اور شوق کے ساتھ لکچر سنتے، سوالات پوچھتے اور بعض وقت مناظرہ کرتے ہیں

فوک ہائی اسکول کے علاوہ تعلیم بالغان کے لئے زراعتی مدارس بھی قائم ہیں۔ یہ حال میں قائم ہوئے انہیں فوک ہائی اسکول کے بچے کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ فوک ہائی اسکول میں زیادہ تر کلچرل مضامین کی تعلیم ہوتی ہے اور زراعت کی تعلیم کم۔ اس لئے ان مدارس کا افتتاح کیا گیا یہ مدارس بھی بالکل فوک ہائی اسکول کے اصول پر کام کرتے ہیں۔ مضامین تعلیمی بھی تقریباً وہی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان مدارس میں سائنٹیفک زراعت کی تعلیم زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹے کسانوں کے مدارس (SMALL HOLDER'S SCHOOL) بھی قائم ہو گئے ہیں جو فوک ہائی اسکولس اور زراعتی اسکولس کے بین بین ہیں۔ ان میں کچھ تو کلچرل مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے اور کچھ زراعتی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ مدارس چھوٹے کسانوں کے لئے ہیں جو فوک ہائی اسکولس یا اگریکلچرل اسکول میں

تعلیم پانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ان کا کورس ذکور کے لئے ۵ ماہ اور اناث کے لئے
۳ ماہ کا ہے۔ طریقہ تعلیم، مدرسہ کے اوقات وغیرہ ان کے بھی کم و بیش فوک ہائی اسکولس کے
موافق ہیں۔ حال میں شہروں میں مزدور پیشہ بالغان کے لئے علحدہ مدارس قائم کئے گئے ہیں
جو کارگیروں کے مدارس (WORKES SCHOOL.) کہے جاتے ہیں۔ فوک ہائی اسکولس،
زراعتی اسکول اور چھوٹے کسانوں کے اسکول تمام اضلاع پر واقع ہیں اور کاشت کاروں اور
اہل دہ کی تعلیم ان میں ہوا کرتی ہے۔ اب چونکہ شہروں میں صنعت و حرفت میں ترقی ہونے لگی
اور کارخانے کھلنے لگے، تو ضرورت اس کی محسوس ہوئی کہ مزدوروں کے لئے شہروں میں
مدارس قائم کئے جائیں چنانچہ اس لئے ورکرس اسکول قائم کئے گئے۔ یہ مدارس بھی انہیں
اصول کے تحت جاری ہیں اور مضامین بھی وہی ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کلچرل
مضامین کے ساتھ یہاں زراعت کی تعلیم کے بدلے معاشیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

العرض یہ ہیں مختصر حالات ڈنمارک کی تعلیم بالغان کے اور یہ ہیں مدارس جہاں
سالانہ ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوتے ہیں۔

میرا دل تو چاہتا تھا کہ میں ان خدمات کا، جو ان مدارس کے طلبہ نے ادا کی ہیں
اور ان مدارس کے برکات کا جو قوم کو پہنچی ہیں ذکر کروں۔ لیکن یہ کیفیات اتنی طولانی ہیں کہ
بجائے خود ایک مضمون ہو سکتی ہیں۔ میں صرف ایک دو جملے عرض کرتا ہوں۔

ڈنمارک میں ایک انسائیکلوپیڈیا آف بیاگرفیز شائع ہوئی ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے
مجھے ایک ڈنمارک کے مدرس نے بتایا کہ اس میں ۱۰۹ ایسے کسانوں کے نام اور حالات
درج ہیں جنہوں نے فوک ہائی اسکول میں تعلیم پائی اور ملک کی زراعت کی اصلاح میں
کارنمایاں کئے۔ اس طرح ڈنمارک کی موجودہ نیلی کتاب میں تقریباً ۱۵۰ ایسے نام
پائے جاتے ہیں، جو اس وقت زراعتی، تجارتی، سیاسی اور سماجی معاملات کی رہنمائی
اور رہبری کر رہے ہیں اور یہ سب زراعت پیشہ اور فوک ہائی اسکول یا اگریکلچرل اسکولس کے

تعلیم یافتہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ڈنمارک کی زراعتی ترقی، امداد باہمی کی تحریک کا رواج اور سیاسی آزادی کا ملنا، یہ سب انہیں مدارس کا فیض ہے۔

حضرات اس قسم کے مدارس خصوصاً فوک ہائی اسکولس ڈنمارک تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ فنلینڈ، سویڈن، ناروے اور امریکہ نے بھی تقلید کی ہے اور کئے مدارس قائم کئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ پر کیا موقوف ہے ایسے مدارس ہمارے ملک میں بھی کامیابی کے ساتھ قائم ہو سکتے اور اس ملک کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ یہاں بھی قومی اتفاق اور اتحاد قائم ہو جائے۔ مذہب و ملت ذات پات کے جھگڑے مٹ جائیں، امیر و غریب کا فرق نہ رہے، خود غرضی، تن پروری، عیش پرستی کا مرض دفع ہو جائے اور ملک کے خوش قسمت ارباب دولت و حکومت کے دلوں میں ملکی اور قومی درد، حب الوطنی، حریت و مساوات کا جوش پیدا ہو اور مصرف خیرات کا صحیح مفہوم سمجھیں اور اپنی ثروت و لیاقت اور دماغ و قلم اور علم و عمل سے اپنے بدنصیب، مفلس، جاہل برادران وطن کی مدد کریں۔

طلبہ پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ معلم پہلے خود پر قابو پائے

(فرنیک لیس)

اگر ہم بنی نوع انسان کی بہبودی اور ترقی چاہتے ہیں تو اُس سے جسمانی ریاضت

(فروبل)

بچوں کی تعلیم کھیل کود کے ساتھ ساتھ بلاکسی روک تھام کے ہونا چاہیئے۔

(بقراط)

فرائض مدرسین

جناب مولوی حسام الدین صاحب فاضل

معزز صدر نشین صاحب اور محترم حضرات ۔

مدرسین کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنا وقار اپنی عظمت قائم رکھیں انکساری اچھی چیز ہے مگر مدرس کو زیبا نہیں کہ عہدے داروں کو جھک جھک کر خوشامدانہ سلام کیا کرے اس کے یہ معنے نہیں کہ مغرورانہ طریقہ برتا جائے ۔ نہیں ۔ بلکہ ادب واحترام کے ساتھ سلام و کلام کیا کرے اور مخلصانہ تعظیم وتکریم میں کمی نہ ہونے دے ۔ صدر مدرس صاحبین کو بھی چاہئیے کہ اپنے مددگاروں کے ساتھ نہایت خوش خلقی و ہمدردی سے پیش آیا کریں اور دوستانہ و برادرانہ میل جول رکھیں کہ یہ بھی فضل ایزدی ہے کہ اہل علم اُن کے ماتحت ہیں اور مصلحانِ قوم پر حکومت کرنے کا انہیں موقع ملا ۔ مدرسین کو چاہئیے کہ طلبہ کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کریں ۔ امیر وغریب سب پر ایک ہی نظر شفقت رہے ۔ امتیاز بھی ہو تو ذکی وغبی طلباء کے لحاظ سے مگر کند ذہن لڑکوں کو بالکل نظر انداز بھی نہ کر دینا چاہئیے طلبہ کی حق بات پر خفا نہ ہوں نہ کسی طالب علم کی اتفاقی بدزبانی کی وجہ سے اپنے دل میں ملال رکھیں ۔ ع

جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

یہ زیبا نہیں کہ کسی طالب علم نے کچھ بے ادبی کر دی تھی ۔ کوتاہ بیں استاد لے وقتیہ سزا کے علاوہ دو سال کے بعد اپنا مدفونہ غصہ اس طرح نکالا کہ یا تو امتحان سالانہ میں اس کو ناکام کر دیا یا نمبر کم دیئے ۔ استاد کو شفیق باپ کی طرح رہنا چاہئیے ۔ معصوم بچوں اور طالب علموں سے

غم وغصہ کیا اور دلی دشمنی کیسی ؎

بفرمان براں برشہ داد گر | پدر وار خشم آورد بر پسر
گہش می زند تا شود دردناک | گہے می کند آبش از دیدہ پاک

طلبہ کے ساتھ فیاضی وخوش خلقی سے پیش آنا بھی مدرس کا فرض ہے۔ حضرت امام اعظم رح کے شاگرد رشید امام ابو یوسف رح کو ان کے والد بوجہ غربت تحصیل علم سے روکتے اور محنت ومزدوری سے پیسہ کمالانے پر مجبور کرتے۔ یہاں تک کہ امام صاحب کے حلقہ درس میں سے اپنے بچے کو زبردستی اُٹھالے جاتے مگر امام اعظم وقتاً فوقتاً ابو یوسف کو آہستہ سے سو سو روپیوں کی تھیلیاں دیا کرتے کہ اپنے ابا کو دے دو اور تم بے فکری سے تحصیل علم میں مشغول رہو اسی فیاضی کا اثر تھا کہ ابو یوسف نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا اور استاد وقت بن گئے ان ہی فیاضیوں وہمدردیوں کے نتائج تھے کہ پہلے زمانے کے تلامذہ اپنے اساتذہ پر ان جان قربان رہا کرتے تھے۔ آج ہمارے شاگرد مدرسے سے خارج ہوجانے کے بعد ہمیں سلام کرنے تک کسر شان خیال کرتے ہیں۔ امام تقی الدین رح جب اپنے استاد کے گھر حاضر ہوتے تو اپنے رخسار زمین پر ملتے اور فرماتے کہ میں اُس زمین سے برکت حاصل کرنا چاہتا ہوں جس پر میرے استاد نے قدم رکھے ہوں۔ اُستادانہ فیاضی کا تذکرہ کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ سب صاحبین طلبہ کو روپیہ پیسہ دیا کریں بلکہ غرض یہ ہے کہ کم از کم خوش خلقی اور تا بہ مقدور ہمدردی سے آپ دریغ نہ کریں۔ مدرسین کو اپنی زبان کی اصلاح کی بھی سخت ضرورت ہے۔ بچوں کے ساتھ مدرس کی گفتگو نہایت مہذب ہونی چاہئے طالب علم استاد سے نہ صرف علم حاصل کرتا ہے بلکہ طرز گفتگو بھی سیکھتا ہے۔ ہمارے حیدرآباد کے ایک امیر کبیر کا حال مشہور ہے کہ معمولی خدمت گار سے بھی وہ آپ آپ سے خطاب کیا کرتے اور فرماتے کہ میں اپنی زبان کو درست رکھنا چاہتا ہوں۔

مدرسین کا فرض ہے کہ اپنی معلومات میں ترقی کرتے رہیں۔ مطالعہ جاری رکھیں

خصوصاً اپنے مفوضہ فن سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ بھی کہ جو بات انہیں معلوم نہ ہو طالب علم سے صاف صاف کہہ دیں کہ بعد تحقیق تبلا دی جائے گی ایک بڑے امام سے جب کہ وہ برسر منبر خطبہ دے رہے تھے، ایک شخص نے چالیس مسئلے پوچھے۔ امام نے چار کا تو جواب دیا چھبیس مسئلوں کے متعلق کہہ دیا کہ پھر جواب دوں گا۔ پوچھنے والے نے کہا کہ جب تمام مسائل یاد نہیں تو آپ منبر پر کیوں کھڑے ہیں۔ جواب دیا کہ اسی لئے منبر پر کھڑا ہوں۔ اگر تمام مسائل سے واقف ہوتا تو عرش اعلیٰ پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتا۔ ائمہ کرام کا تو یہ حال اور مدرسین کی یہ کیفیت کہ اپنی ہمہ دانی ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کسی بات میں بھی اپنی عدم واقفیت کے اظہار کو ذلت خیال کرتے ہیں حالانکہ بڑی رسوائی تو یہ ہے کہ کسی لفظ یا فقرے کے معنے یا کسی شعر کا مطلب طالب علم کو سمجھا دیا جائے اور وہ صحیح تصور کرے مگر بعد میں وہ غلط ثابت ہو۔

جسمانی سزا کے متعلق چونکہ مفصل تقریر کل آپ ایک بلند پایہ مقرر سے سن چکے ہیں اس لئے میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مدرس کو چاہیئے کہ طلبہ کو قابل بنانے کے لئے سزا دیا کرے نہ کہ اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اساتذہ اس شدت و بے رحمی سے مارتے ہیں گویا سخت مجرمین کو سزا دے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ میں بے حیائی اور استاد سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق لڑکے بے باکانہ طور سے زبان درازی کرنے لگ جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مدرس تنبیہ کرے ہی نہیں بلکہ اس طرح مارے کہ جو چھڑی کسی طالب علم کے مارنے کو اٹھائی گئی ہے اگر اس وقت اس کے نیچے اس مدرس کے لخت جگر صاحبزادے کا ہاتھ لایا جائے تو یہ بید اسی شدت سے پڑے جتنی طالب علم پر پڑتی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یہ سزا محبت کی سزا نہیں بلکہ غصہ اور بے دردی کی ہے جن مدرس صاحب کے عوض دار العلوم میں میرا تبادلہ ہوا تھا اُن کا وقت جماعت صغیر میں بھی تھا اس لئے مجھے بھی دو تین مہینے جماعت صغیر میں تعلیم دینے کا اتفاق ہوا

صرف پنسل کی مار بچوں کے لئے کفایت کرتی اور وہ اچھی طرح سبق یاد کر لیتے تھے میں انھیں دوست پکارا کرتا وہ میرے ساتھ مودبانہ محبت سے رہتے۔ اب جب کہ اس کو چھ سات سال کا عرصہ ہو چکا ہے استحاد کا یہ حال ہے کہ اس جماعت کے طلبہ اس وقت کسی جماعتیں زیر تعلیم ہوں مجھ سے مخلصانہ ملاقات کر لیا کرتے ہیں۔ پہلے ہی والدین علم اور اُستاد سے طالب علموں کو وحشت زدہ بنا کر مدرسہ لاتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کم سن بچہ روتا یا کچھ ضد کرتا ہے تو اُس کو ماں باپ کہا کرتے ہیں کہ خاموش رہ ورنہ مدرسہ روانہ کر دیا جائے گا اُستاد سے کہہ کے تجھے سزا دلائی جائے گی۔ گھر میں جب کبھی بچے نے کچھ شرارت کی کہہ دیا جاتا ہے کہ چل پڑھنے کے لئے بیٹھ جا۔ غرض ہر طرح علم اور معلم سے خوف زدہ رکھا جاتا ہے اب مدرسے میں لڑکا داخل ہوتا ہے تو اُستاد کی غضب ناک صورت، زبردست آواز زور زور کی مار اس کے لئے وحشت زدگی کی تکمیل کا باعث ہو جاتی ہے۔ اور وہ کتابوں اور ان کے پڑھانے والوں سے سخت نفرت کرنے لگ جاتا ہے اس لئے مدرس کا فرض ہے کہ اپنی نیک مزاجی اور خوش خلقی سے طالب علم پر یہ ثابت کر دے کہ علم نہایت مفید اور لذیذ چیز ہے اور علم سکھانے والا استاد اس لڑکے کے لئے والدین سے زیادہ شفیق و مہربان اور اس کا بہی خواہ ہے کہ وہ تو جسم کی پرورش کیا کرتے ہیں اور یہ روح کی تربیت کرتا ہے۔

مدرسین کرام کو اپنی اخلاقی و معاشرتی حالت بہت ہی درست رکھنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ ان کی تقلید سے لڑکے درست حالت میں رہیں بلکہ یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ علم و اخلاق کی جو باتیں بھی لڑکا اپنی کتاب میں پڑھے اس کا عملی نقشہ اپنے مدرس صاحب میں دیکھ لے۔ مدرس صاحبین کے لئے ضروری ہے کہ باوجود استطاعت کبھی کبھی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کریں تاکہ طلبہ میں بھی اپنا کام آپ کر لینے کی عادت ہو اور وہ معمولی کاروبار کی انجام دہی کو عار نہ سمجھیں۔ انتہائی امانت و دیانت کی بھی بے حد ضرورت ہے

تاکہ طلبہ دیانت داری کا کافی طور پر سبق حاصل کر سکیں۔ یہ تو خدائے تعالیٰ کا فضل ہے کہ طبقۂ مدرسین کے لئے بد دیانتی وغیرہ کے اسباب بڑی حد تک ناپید ہیں۔ تاہم کسی مدرس صاحب کو حق نہیں ہے کہ ذاتی کام کے لئے مدرسہ کا ذرا سا کاغذ تک خرچ کریں۔

وظیفہ تعلیمی و غربت کے لئے طلبہ کا انتخاب کرتے وقت بھی حضرات مدرسین کو خاص احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اپنے عزیز و اقارب یا دوست احباب کے بچوں کو ناواجبی طور پر وظیفہ خوار بنا دیں۔ بعض طالب علم نہایت واجب الرحم اور علم کے شوقین ہوتے ہیں مگر وظیفہ نہیں پاتے۔ ایک طالب علم اپنے کو غریب بتلاتا ہے اور اس کی غربت کسی طرح ثابت بھی ہو جاتی ہے مگر وہ سیکل پر مدرسہ آتا جاتا ہے یہ طالب علم وظیفہ پانے کا اس لئے مستحق نہیں ہے کہ سو پچاس روپیے کا مالک ہے کہ جو سیکل خرید لی اس سے تو وہ پیدل چلنے پھرنے والا طالب علم زیادہ حق دار ہے، جو غریب ہو۔ اگرچہ اس کے والد کی آمدنی بہ ظاہر پہلے طالب علم کے والد سے کسی قدر زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ غرض سیکل فارغ البالی کی بدیہہ دلیل ہے جو ہر مدرس کو علانیہ معلوم ہو سکتی ہے یہ تو میں نے مثالاً پیش کیا ہے لباس وغیرہ سے بھی اسی طرح غربت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرات۔ بالآخر ادباً گزارش یہ ہے کہ آپ سب صاحبین بچوں اور بڑوں کے لئے ہر حیثیت سے بہترین نمونہ بنے رہیں اور جو بچہ بھی آپ کے مدرسہ میں داخل ہو وہ علم عمل اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہترین فرد ہو کر نکلے۔

مدارس میں اردو کی تعلیم

جناب مولوی ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن

ہندوستان میں تمام علمی اور سیاسی اصلاح کی بسم اللہ اتحاد عمل اور رواداری سے ہوتی ہے، لیکن خاتمہ "تو تو میں میں" پر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں راقم الحروف کی ساعی اس کلیہ سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتی تھیں۔ انجمن اساتذہ کے دوسرے سالانہ جلسے میں جس مضمون پر اور جن قیود کے ساتھ مجھے اپنے اظہار خیالات کا موقع دیا گیا تھا اس کو میں جانتا ہوں یا میرا دل۔ حالانکہ مضمون پڑھنے سے پہلے میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "قلت وقت" کا پھندا میری گردن میں کچھ اس طرح ڈالا گیا ہے کہ مضمون کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کی قطعی گنجایش نہیں ہے۔ لہذا ان مجبوریوں کے تحت میں نے صرف ایسے امور پر اکتفا کیا تھا جن کا جاننا ایک کامیاب طرز تعلیم کے لئے ضروری ہے اور میں نے اس امر پر اپنے مضمون میں زور دیا تھا کہ استاد کو کلاس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ ادب کے اعلیٰ مقاصد، نیز جدید ادبی معلومات اور اطلاعات سے باخبر رہے۔ تاکہ طلبہ کی استعداد کے مطابق وہ ان کے معلومات میں اضافہ کر سکے۔ یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ ان تمام چیزوں کے علاوہ طلبہ کے ساتھ نرمی اور آشتی کا برتاؤ ملحوظ رکھا جائے۔ بہر حال میں مضمون کے نکات کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا اگر میرے معترضین ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے "حیدرآباد ٹیچر" کے اوراق میں مضمون کا پھر مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ میں نے بحث بیجا سے احتراز کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شرح و بسط کے ساتھ بحث ناممکن تھی اس لئے کہ جس تنگی وقت میں جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اگر کہیں ایسی مجبوری کا انہیں سامنا کرنا پڑتا تو مجھ سے زیادہ انہیں وقت درپیش ہوتی۔

حضرات! انگریزی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے' بنایا نہیں جاتا۔ ہندوستان میں اب بھی یہ عام خیال ہے کہ شاعری ایک اکتسابی چیز ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر شاعری میں استادی اور شاگردی کی رسم کب ہی کی اٹھ گئی ہوتی۔ لطف تو یہ ہے کہ اور اکتسابی علوم کی طرح ہندوستان میں شاعری بھی سکھائی جاتی ہے۔ اور شعرا نے ملک کے چپہ چپہ میں اپنے اپنے اکھاڑے قائم کر رکھے ہیں۔ لیکن یہ امر ایک زبردست مغالطہ پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ محض کلام کو موزوں کر لینا اور کسی خیال کو خوش سلیقگی کے ساتھ بامحاورہ زبان میں ادا کر دینا' شاعر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ اہل بصیرت خوب جانتے ہیں کہ موزوں کلام یا یہ کہ عبارت میں ایک وزن موسیقی یا وزن عروضی پیدا کرنا' شاعری کا خارجی پہلو ہے' واقعہ یہ ہے کہ شاعری دراصل جذبات کی موزونی اور واردات قلبی کی تصویر کھینچنے کا کام ہے۔ شاعر کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ قواعد زبان اور عروض کا پابند ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اصول قواعد و عروض کو ملحوظ رکھے اس کی مثال ایسی ہی جیسی کہ زبان اور قواعد زبان کی۔ زبان سے قواعد بنتی ہے زبان قواعد سے نہیں بنتی۔ یہ قواعد کا کام ہے کہ وہ اپنے ضوابط کو زبان کی وقت بوقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بدل لے۔ بلبل نغمہ پیرا ہوتی ہے' تو اس لئے کہ گانا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ جب وہ عالم سرمستی اور خوش کیفی میں بے ساختہ چہکنے لگتی ہے تو اسے اس کی سدھ بدھ نہیں رہتی کہ وہ اپنے نغمہ کو بحر رمل میں موزوں کرے یا بحر ہزج میں۔ بلکہ وہ آپے سے باہر ہو کر گاتی ہے جس میں بیدل کی دقت پسندی اور ناسخ کی صنعت کاری کو کچھ دخل نہیں۔ اس کی آواز سے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے نغمے نکلتے ہیں اب سمجھنے والے اپنے سمجھنے کی خاطر اوزان یا پیمانے بنا لیں کہ آیا یہ نغمہ بحر خفیف میں ہے یا بحر کامل میں۔ مطلب میرا اس بحث سے یہ ہے کہ شاعر چند خدا داد جوہر اپنی آفرینش کے ساتھ لے کر آتا ہے۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ ایک مقرر اور مدرس بھی چند فطری قابلیتیں

ے کر پیدا ہوتا ہے۔ الغرض یہ کہ شاعر کی طرح مدرس بھی پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔

لہٰذا طرز تعلیم کے بارہ میں میرا یہ خیال ہے کہ کسی تعلیمی اصول یا نظام کے تحت ایک شخص جس میں یہ فطری صلاحیتیں نہ ہوں اُستاد بنایا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ محض سی۔ ٹی یا بی ٹی ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک شخص کامیاب مدرس ثابت ہوگا۔ لیکن جس طرح زبان کے قواعد کا پابند ہونے کے بعد ایک انسان صحیح زبان بول سکتا ہے یا یہ کہ عروض و بیان پر حاوی ہونے کے بعد کلام موزوں کر سکتا ہے اور ناظم بن سکتا ہے اسی طرح چند تعلیمی تجربے یا اصول ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جن کی بدولت درس و تدریس میں بڑی حد تک مدد ملے۔ گو اس میں شک نہیں کہ ان اصول پر سختی سے کاربند ہونے کی تلقین نہیں کی جا سکتی، اس لئے کہ خاص واقعات اور حالات کے تحت اس میں اس بات کی ضرورت ہے کہ اُستاد عقل سلیم سے بھی کام لے۔ ورنہ یہی اُصول جو تعلیمی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں خود وبال جان ہو جائیں گے۔ میں اس خیال کو ایک تمثیل سے واضح کروں گا۔

ماہران فن اس کو خوب جانتے ہیں کہ فوجی سپاہیوں کو اپنے پیشے پر چست و چالاک رکھنے کے لئے فوجی کرتب اور مصنوعی جنگ میں ان اُصول کو برتنے کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ لیکن محض مصنوعی جنگ میں کامیاب ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک سپاہی لازمی طور پر میدان جنگ کی قتل گاہ میں بھی اسی طرح کامیاب نکلے گا۔ اس لئے کہ بڑا فرق ہے فتح میدان کی پریڈ گرونڈ اور فرانس کے میدان کارزار میں۔ بڑے بڑے سورما سپاہی جنھوں نے یہاں بڑے کرتب دکھائے، اصلی معرکہ گاہ میں کچھ اس طرح سے چوکڑی بھولے کہ ان سے تو مصنوعی جولان گاہ کے پھسڈی بازی لے گئے۔ پس اسی طرح بی ٹی یا سی ٹی میں طرہ امتیاز حاصل کرنا اس امر کو ثابت نہیں کرتا کہ اسکول کی چار دیواریوں میں جب کہ مختلف ذہنیتوں اور جھٹے ہوئے طالب علموں سے سابقہ

پڑتا ہے' ماسٹر صاحب یا ملاجی اسی طرح کامیاب نکلیں گے۔ ایسے مواقع پر تو اصول وضوابط و نظائر تعلیمی کے علاوہ کچھ جراءت' معاملہ فہمی' استقلال' تحمل اور تدبیر کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ بعض شوخ طبیعت طالب علم مدرس کی آزمائش کی خاطر ایسے ایسے نکات نکالتے اور بحث سے ہٹا دینے والے سوالات کرتے ہیں کہ اگر مدرس حکمت عملی اور استقلال کو کام میں نہ لائے تو ساری جماعت کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ مواقع ایسے ہیں کہ محض کتابی معلومات اور اصول تعلیم سے کام نہیں چلتا ہے بلکہ حکمت سے جو محض اکتسابی چیز نہیں ہے ایک حد تک فطری بھی ہے حاصل کلام یہ کہ جس طرح یہ لازم نہیں کہ علم منطق سے واقف ہونے کے بعد ایک منطقی بحث و مباحثہ میں غلطی نہیں کرسکتا' لیکن منطق سے واقف ہونا انسان کو ایک حد تک مغالطہ سازیوں اور الٹی بحثوں سے مصئون رکھتا ہے۔ اصول تعلیم یا طرز تعلیم سے باخبر ہونا بھی اسی طرح بہتیری مشکلات سے ایک مدرس کو محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ آج اس موضوع پر خیال آرائی سے میری یہی غایت ہے۔

موجودہ تعلیمی دنیا میں ماہران تعلیم کے تجربوں اور نظریوں سے ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے۔ اور ان اصول پر احتیاط کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے بعد بہتیری سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں اور ہوتی جارہی ہیں۔ جس سے ایک حد تک تعلیمی مشکلات کا سد باب ہوتا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں بیس پچیس سالہ تعلیمی جدوجہد اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ تربیت یافتہ اساتذہ غیر تربیت یافتہ مدرسین سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہورہے ہیں۔ اس لئے کہ تعلیمی مشکلات اور اس کے حل نیز طلاب کی ذہنیتوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے بے خبر نہیں ہوتے۔ لیکن جہاں تک دیسی یا ملکی زبانوں کی تعلیم و تدریس کا تعلق ہے' اساتذہ کو یا تو اس قسم کا موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ادر ہم پیشہ لوگ کیا کررہے ہیں۔ اور (یہ ایک حد تک زیادہ درست ہے) مولوی صاحبان اپنے قدیم ڈگر سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتے۔ اور باوا آدم کے زمانے سے

جو اصول تعلیم بتا رہے ہیں، ان میں سر مو تبدیلی ایسا ہی تصرف بیجا جانتے ہیں جیسا کہ قرآنی آیات میں اعراب کا ادھر سے ادھر ہٹا دینا۔ لیکن واقعات حالیہ اس امر کے متقاضی ہیں کہ اس امر کی طرف تعجیلی توجہ عمل میں لائی جائے اس لئے ڈنڈے بازی کے زور سے لڑکوں پر رعب جمانا اپنے اصول تعلیم کی خامیوں کی تلافی کرنا نہایت خطرناک ہے! ور اس کے تحفظ کو بخوبی جانتے ہیں اور بے جا سختی کو گوارا نہیں کرتے' تو مدرسوں کے طالب علم تو کہیں زیادہ روشن خیال ہوتے ہیں وہ اس قسم کی بے جا سختی کا اگر بھولے سے بھی استاد کو مرتکب پائیں گے تو اس طرح پیچھا کریں گے کہ خیر شیطان سے لاحول پڑھ کر چھٹکارا پانا ممکن ہے لیکن ان معصوم شیطانوں سے بچنے کا کوئی چٹکلہ بڑے سے بڑا بھی پیش نہیں کرسکتا۔ اور حقیقتاً ان ہی مواقع پر استاد کی آزمایش ہے سب سے پہلے طلاب کی ذہنیتوں کا مطالعہ ضروری ہے اور پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنا ذاتی وقار اس طور پر قائم کیا جائے جو محتاج عصائے مولوی نہ ہو! اگر اس موقع پر استاد کی ہوا اکھڑ گئی تو پھر پھر وہ کتنا ہی بڑا عالم وفاضل اپنے وقت کا کیوں نہ ہو لیکن اس کی تعلیم سے لڑکوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا اور ملفت میں اپنی اوقات بھی تلخ ہوگی۔

لہٰذا اس تنبیہ کے بعد درس وتدریس کے بارہ میں چند باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

یہاں بھی زبان دانی اور ادبی اطلاعات کی حد تک استاد کو چند جدید رجحانات سے باخبر ہونے کی ضرورت ہے محض لغت پر حاوی ہونا ادب یا زبان پر عبور حاصل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اگر تعلیم کا یہی مقصد ہے کہ طالب علم کلاس میں استاد سے چند نامانوس الفاظ کے معنے پوچھ لے چند پیچیدہ عبارات کی ترکیب استاد اس کے ذہن نشین اس طرح کرادے کہ اس کا تعقل دشوار نہ ہو تو ایسی تعلیم تو طالب علم گھر بیٹھے بھی حاصل کرسکتا ہے۔ دو چار روپیہ کی ایک لغت اس کو دلادی جائے تو نامانوس الفاظ وغیرہ کے معنے اُسے یوں معلوم ہو جائیں گے دیکھئے پھر استاد کی ضرورت ہی ایک سرے سے

باقی نہیں رہتی اور ساٹھ ستر لاکھ روپیہ کی رقم جو ہماری ریاست کو تعلیمی معاملات کے ضمن میں صرف کرنی پڑتی ہے وہ صاف بچ جائے گی۔ لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ لڑکا اسکول میں اس طرح وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں آتا بلکہ وہ تو اس لئے آتا ہے کہ اضافہ لغت کے علاوہ جو اس کو مطالعہ کتب سے حاصل ہو سکتا ہے ایسی باتیں بالخصوص معلوم کرے جس سے اس کی اخلاقی اور ذہنی حالت درست ہو سکے، زندگی کے واقعات کو صحیح طور پر دیکھنے اور مشکلات دہر کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی اس میں رفتہ رفتہ صلاحیت پیدا ہو۔ آپ کی شخصیت یا یہ کہ شخصی نفوذ سے دوچار ہونے کے بعد اس کے ننھے وجود میں بھی ایسے خوابیدہ جوہر جو پوشیدہ ہیں ابھریں تاکہ وہ سمجھے کہ حقیقتاً یہ معلومات جو اُسے ملی ہیں محض امتحان پاس کرنے کی خاطر نہیں ہیں بلکہ ان سے بہت کچھ مشکلات زندگی کا سدباب ہو سکتا ہے اور یہی چیزیں آیندہ ترقی اور تکمیل حیات کی راہ میں شمع ہدایت بنیں گی لیکن ان چیزوں کو ذہن نشیں کرنے کے لئے اور لڑکوں کو ان کی استعداد اور حوصلہ کے مطابق روشناس کرنے کے واسطے اساتذہ کی ضرورت ہے کہ خود اساتذہ صاحبان زبان اور ادب کے بارہ میں جدید معلومات حاصل کریں عام طور پر قدامت پسند حضرات کا ادب اور بالخصوص زبان کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ بے کار چیزیں ہیں ادب کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ زبان دانی کا دائرہ بغیر اس کے وسیع ہو نہیں سکتا۔ زبان اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عبور حاصل ہوے بغیر طراری اور لفاظی حاصل ہو نہیں سکتی جب یہ نہ ہوا تو پھر وعظ اور مولود کی محفلیں کیسے گرمائی جاسکتی ہیں۔

لیکن حضرات! ان جزئی فوائد سے قطع نظر زبان اور خصوصاً ادب کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ زندگی کا اثر ادب پر پڑتا ہے اور ادب کا اثر زندگی پر۔ اس طرح ادب اور زندگی کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب انسانی زندگی کا ترجمان ہے ادب انسانی زندگی کا آئینہ ہے۔ کسی قوم کے دلی مقاصد، رجحانات، احساسات، جذبات،

اور تخیلات کو ٹٹولنا چاہو تو اس کے ادب کا مطالعہ کرو لیکن کتنے افراد ایسے ہیں ہمارے ہاں جو ادب کو اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں کتنے ہیں جو اوروں کو اس قسم کا مطمح نظر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ بہتیرے ہم میں ایسے ہوں گے جنہیں اس کی بھی خبر نہ ہوگی کہ حافظ کا زمانہ پہلے کا ہے یا سعدی کا۔ حافظ یا سعدی کے زمانہ میں ادبی، سیاسی رجحانات سعدی کی شاعری حافظ سے کیوں ملتی جلتی نہیں، میر تقی کب پیدا ہوئے؟ اُن کے زمانہ میں ہندوستان کی سیاسی فضا میں کس قسم کا انتشار تھا۔ اور اس کی جھلک کہاں تک ان کے کلام اور اُن کی داستانِ درد میں پائی جاتی ہے برخلاف اس کے سودا اور انشا کے ہاں یہ بہروپیا پن کہاں سے آیا؟ اور اس کے کیا اسباب تھے، اِن چیزوں کے متعلق ہمارے معلومات ایسے ہیں جن کو ریاضی کی زبان میں بیان کرنا چاہیں تو غالباً صفر بھی ادا نہ کر سکے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ غزل کے خاتمہ پر تخلص کی مہر لگی نہ ہو تو شائد ہم داغ اور حالی کے کلام میں بھی تمیز نہ کر سکیں۔ لہٰذا خیال فرمائیے کہ استاد کا جب یہ حال ہو تو شاگردوں سے کیا توقع کی جائے۔

الغرض ادبی انقلابات اور رجحانات سے باخبر ہونے پر اُستاد کو طرز تعلیم میں بہت مدد مل سکتی ہے اور کتابی مبحث کے علاوہ طلاب کو دوسری چیزیں بھی معلوم ہوتی رہیں تو یقین ہے کہ اُن کی دلچسپی اضافہ معلومات کے ساتھ ساتھ اور بڑھتی جائے گی لیکن ہاں اس میں اعتدال شرط ہے۔ مثلاً مڈل کلاس کے طالب علم کو وہی حد تک نئی باتیں بتلائی جائیں جہاں تک اس کی استعداد علمی اس کی متحمل ہو نہ یہ کہ ہمہ دانی کے جوش میں آکر ایسا لکچر پلا دیا کہ جس کے سمجھنے کی توقع ایف اے کے طالب علموں سے بھی کم کی جا سکتی ہے۔

علاوہ بریں کلاس میں ہمیشہ استاد کو چاہیے کہ مہا تما بدھ کی سنجیدگی اختیار کرنے سے احتراز کرے لڑکے تو خیر لڑکے ہی ہیں دنیا کے شیریں و تلخ کو انہوں دیکھا ہی کیا ہے۔ زندہ دل اور عیار تو انہیں ہونا بھی چاہیے۔ ذرا اُن صحبتوں پر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ

آدمی جو ظریف، خوش طبع اور شگفتہ مزاج ہوتا ہے۔ کس طرح ہر جگہ پیش پیش رہتا ہے۔ پس کلاس میں تو اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ظریف نہ سہی تو خیر اس لئے کہ ہر شخص بذلہ سنج ہو نہیں سکتا، جب تک کہ دست قدرت نے اُس کو حیوان ظریف نہ بنایا ہو۔ لیکن ہر ایک حیوان ناطق کو ہنسمکھ اور زندہ دل ہونا چاہیئے اور مدرس کو تو ضرور ہونا چاہیئے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ میرے بس کی بات ہوتی تو یہ کرتا کہ کسی استاد کو اگر ہشاش بشاش نہ پاتا تو اُس کو اضافہ تدریجی سے محروم رکھتا۔ اے کاش اس انجمن کے ارباب حل وعقد کو میرے اس مشورہ سے اتفاق ہو اور اس کا عملدرآمد ہو جائے تو خود کو بڑا خوش قسمت سمجھوں۔ بہرحال میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کے ساتھ زیادہ سنجیدہ اور خشک مزاج رہنا ٹھیک نہیں ہے بہت سے مسائل ہنسی مذاق میں آسانی سکھائے جا سکتے ہیں اور لڑکوں سے تو ہنسا بہلا کر جتنا چاہو کام لے لو مثل مشہور ہے

مزدور خوش دل کند کار بیش

پس مزدور ہی پر کیا منحصر ہے کیا لڑکوں پر یہ تمثیل صادق نہیں آتی؟

(باقی)

دَورِ مسعُود

عنوان بالا کے تحت ہمارے لائق مقالہ نگار نے نواب مسعود جنگ بہادر کی دوازدہ سالہ کارگزاری کو جن مختصر اور جامع الفاظ میں قلم بند کیا ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں قارئین کرام غور فرمائیں کہ کس درجہ پبلک کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

شریک مدیر

تعلیمی نقطۂ نظر سے عموماً ہندوستان اور خصوصاً علیگڈھ کو سرسید علیہ الرحمۃ کے نام نامی سے جو نسبت ہے، بالکل وہی مناسبت جناب نواب مسعود جنگ بہادر کے اسم گرامی کو خطۂ دکن سے ہے۔ اگر ان دونوں جلیل القدر ہستیوں کے دور دورے کے حالات پر ایک اجمالی نظر بھی ڈالی جائے تو یہ امر حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا کہ ہر دو مقاماتِ مذکورہ میں ایک ہی نوعیت کی تعلیمی پستی رونما تھی۔ نیز جد بزرگوار کو جس قسم کی مشکلات کا سامنا ہوا، نبیرہ محترم کو بھی کم و بیش ایسے ہی سوانحات کا مقابلہ کرنا پڑا اور بالآخر دونوں نے نیّت خیر و حسنِ عمل کی بدولت ملک و مالک سے خراج تحسین حاصل کیا۔

خالق اکبر نے نواب صاحب ممدوح کو حسنِ صورت و سیرت کے ساتھ خاندانی فضیلت و برتری بھی عطا فرمائی ہے جو سونے پر سہاگے کا مصداق ہے۔ چنانچہ آپ کا سیّد ہونا اس تقدس کا ضامن ہے جس کا قابل سلسلہ آن حضرت صلعم کی ذاتِ مقدس سے ملتا ہے۔ آپ کا اعلیٰ خاندان نہ صرف دولتِ علم و عمل سے مالا مال نظر آتا ہے بلکہ اس پر شانِ امارت

دانسری بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ حکومت کی تاریخ شاہدِ حال ہے کہ اس خاندان کی دستارِ فضیلت خطاب عالیہ و منصب جلیلہ کے طرۂ امتیاز سے مزین بھی۔ اور تو اور ہندوستان کے آسمانِ تعلیم کے نیر اعظم سرسید علیہ الرحمۃ کا مشہور آفاق نام کیا کم باعث فخر و مباہات ہے۔ کونسا تعلیم یافتہ دل ایسا ہے کہ جس میں اس معلّم اول کی یاد تازہ نہ ہو اور کونسی زبان ایسی ہے کہ جو اُن کے احسانِ عظیم کے اعتراف سے آشنا نہ ہو خدا نے نواب صاحب کو جس پائے کا جدِ بزرگ عطا فرمایا اسی رتبے کے باپ کا بیٹا بھی بنایا۔ جسٹس سید محمود صاحب مرحوم کی خداداد قانونی قابلیت مقننینِ وقت سے اس طرح اپنا لوہا منوا چکی ہے کہ آج تک قانونی دنیا میں آپ کا نام نامی ضرب المثل ہے۔

آپ ۱۸۸۵ء میں بمقام علیگڈھ پیدا ہوئے اور اپنے مُصلحِ قوم جدِ محترم کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی مگر افسوس ہے کہ ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے ہی آپ کے جدِ امجد اور والد ماجد ہر دو کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا لیکن اس دُرِ یتیم کی تعلیم و تربیت برابر جاری رہی اور اس میں سر مو فرق نہ آیا۔ چنانچہ آپ نے علیگڈھ کے مشہور مدرسے میں تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور دورانِ تعلیم میں ہونہاری اور شغف علمی کے کچھ ایسے جوہر دکھائے کہ سر تھیوڈ ماریسن کی کوشش اور سرکار عظمت مدار کی توجہ عالیہ سے آپ بہ غرض تعلیم انگلستان روانہ ہوئے اور مسٹر فشر کی نگرانی میں نیو کالج آکسفورڈ سے ۱۹۱۰ء میں بی اے (آنرس) کی ڈگری لی اور فن تاریخ میں اپنے ہم چشموں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا۔ نیر وحید العصر پروفیسر کی نظروں میں اپنا وقار و منزلت پیدا کی، جس کے سبب استاد و شاگرد کے شریفانہ تعلقات بہت جلد مبدل بہ دوستی ہوگئے اور آپ کو کالج کی تقاریب میں نہایت ممتاز حصہ ملنے لگا مزید برآں آپ نے اپنے والد محترم کے معزز پیشہ وکالت کی ناقابل فراموش یاد کو تازہ کرنے کی غرض سے بیرسٹری کی سند بھی حاصل کی۔ نہ صرف درس و تدریس میں آپ کی شہرت و توقیر ہوئی، بلکہ عموماً

مختلف کھیلوں اور خصوصاً ٹینس میں آپ کو ایسا یدطولیٰ حاصل ہوا کہ آپ کی شاطری کالج کے لئے باعث فخر ہو گئی۔ چنانچہ آپ اپنے زمانۂ قیام میں نمایندگی کے قابل رشک فرائض برابر ادا کرتے رہے آپ کی موجودہ عمدہ صحت اور متین جسامت، چشم بد دور۔ خود اس امر حقیقت کی دلیل ہے کہ آپ نے دماغی تعلیم کے ساتھ جسمانی ورزش کا خیال بھی بدرجۂ اتم رکھا ہے کہ صحیح الدماغ ہونے کے لئے صحیح الجسم ہونا لازمی ہے۔ خلق و مدارت اور حسن گفتار نے آپ کی ہر دل عزیزی کو اس قدر عام کر دیا تھا کہ احباب تو احباب اغیار بھی بجا طور پر آپ کے ثنا خواں تھے۔ بالآخر آپ فارغ التحصیل و فاتح المرام ہو کر ۱۹۱۲ء میں مراجعت فرمائے ہندوستان ہوئے۔

ہندوستان آنے کے بعد عملی زندگی کے وسیع میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جد امجد اور والد ماجد کی دو مختلف العمل راہیں پیش نظر تھیں اور آپ میں ہر دو کی کما ینبغی قابلیت و موزونیت موجود تھی۔ آخرکار آپ نے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھان لی اور پٹنہ میں وکالت شروع کر دی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ

نہفتہائے پدر از پسر شود پیدا

کی صداقت ظاہر ہونے لگی اور دولت و شہرت کا ذریعہ بن گئی۔ بایں ہمہ کچھ تو حکومت انگریزی کی خواہش اور زیادہ تر جد امجد کی مقدس علمی وراثت کی لاج نے آپ کو آئی۔ ای۔ ایس۔ (انڈین ایجوکیشن سروس) میں داخل ہونے پر مجبور کیا اور آپ نے پٹنہ کالجیٹ ہائی اسکول کی صدارت قبول کر لی۔ ۱۹۱۵ء میں بہ صلۂ حسن کارگزاری آپ کٹک کالج میں فن تاریخ کے پروفیسر اور وائس پرنسپل بھی مقرر ہوئے اور فرائض منصبی بوجہ احسن انجام دیئے۔

۲۵؁ ف میں شہریارِ دکن کی مردم شناس و معارف نواز نظر نے نظامت تعلیمات سرکار عالی کے معزز و اہم ترین عہدے کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا۔ اس زمانے میں دکن کی تعلیم پر کچھ ایسا جمود و خمود ساری وطاری تھا کہ اصلاح حال اور امید افزا صورت کے پیدا ہونے کے لئے کم از کم ربع صدی درکار تھی۔ چنانچہ تعلیمات کا موازنہ صرف سترہ لاکھ تھا

اور کالج و مدارسِ فوقانیہ و وسطانیہ و تحتانیہ و ابتدائیہ کی تعداد نہایت محدود تھی نیز معلمین و متعلمین کے اعداد و شمار بہت ہی قلیل تھے جس کی تفصیل اس حالیہ سپاسنامے میں بہ کمال صحت درج ہے جو منجانب سررشتہ جناب ممدوح کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسائل تعلیم کی نہایت مختص اہمیت و نزاکت کے مدنظر صرف بارہ سال کی مدت قلیلہ میں ساڑھے لاکھ موازنے سے خفیف ترین شعبے میں بھی المضاعف سے کہیں بڑھ کر ترقی ہوئی۔ جس کا حقیقی استحکام آیندہ کی مزید ترقی کا حامل و ضامن ہے۔ نہ صرف ذکور بلکہ طبقہ اناث کی اعلیٰ تعلیم بھی خاص طور پر آپ کی رہین منت ہے۔ مختلف شعبوں میں با اصول و مستحکم تنظیم آپ کے ماہرانہ تدبر کی زندہ دلیل ہے۔ بہ لحاظ مراتب مدارس کا اسکیل مقرر کرنا آپ کی دانشمندی کا گہرا ثبوت ہے اسکاؤٹنگ کی ترویج ورزش جسمانی کی تحریص۔ معائنہ طبی کا آغاز، ٹریننگ کی تعلیم کی بہتات نیز ناظر قرأت کا تقرر، دور مسعود کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی تاسیس اور اس کے نشو و نما میں آپ نے جو گہری دلچسپی عملاً ظاہر فرمائی وہ بہ ہر نوع نہایت گراں قدر ہے۔ کئی ایک فوقانیہ مدارس میں ایف۔اے کی تعلیم کا انتظام نہ صرف جامعہ کی تقویت کا سبب ہوا بلکہ متعلمین کو بھی وطن اور قرب وطن میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کم خرچ بالانشین موقع ملا۔ اگر جاگیرداران کالج کے قیام اور اس کے بہترین انتظام سے امراء کو زیور علم سے آراستہ ہونے کا موقع دیا گیا تو غرباء کے لئے بھی اس دریا دلی سے کام لیا گیا کہ نہ صرف وظائف ترغیبی و تعلیمی کی کثرت و اشاعت سے تعلیم پانے میں بڑی سہولت پیدا کر دی بلکہ ابتدائی تعلیم کی فیس یک لخت معاف کر کے اس طبقے پر احسان عظیم کیا حالات و ضروریاتِ ملک کے مدنظر فی الحال بلدے کی حد تک ابتدائی تعلیم کو جبری قرار دینے کا نہایت نازک و اہم ترین مسئلہ اور اس کے مکمل اصول طے پا چکے ہیں۔ صرف وقت نفاذ کا انتظار ہے۔ خدا کرے کہ وہ ساعت مسعود جلد آئے اور ملک و ملت کے لئے فال نیک ثابت ہو۔ متعدد و مختلف تعلیمی و اصلاحی انجمنوں کو آپ کے فیض توجہ سے

جو علمی و مالی اَن گنت فوائد پہونچے ہیں ان کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کو آپ کے چند سطری خطوط یا زبانی چند کلماتِ خیر پر ہزاروں روپیوں کی نہایت گراں بہا امداد مل چکی ہے۔

آپ کی انگریزی ادبی قابلیت کا لوہا اور تو اور خود اہل زبان نے بھی مانا ہے۔ فرانسیسی زبان میں بھی آپ کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ اردو و ہندی کا کیا کہنا کہ یہ خود ہی آپ کی پروردہ ہیں۔ چنانچہ "خیالات زرین" کے نام سے آپ نے جو کتاب تالیف فرمائی ہے اس کے ہر شعر سے آپ کا مذاق سلیم مترشح ہوتا ہے تعلیمی تجربے کا کمال و دثوق آپ کی زرین و بے بدل کارگزاریوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اِس کے قطع نظر آپ نے "تعلیم جاپان" کے نام سے جو کتاب تصنیف فرمائی ہے وہ بالتخصیص ہر ماہر تعلیم کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ آپ کی معاملہ فہمی و کاردانی بھی ضرب المثل ہے۔ جس کا بیّن ثبوت ان تمام پیچیدہ مسائل اور الجھی ہوئی کارروائیوں کے بہترین حل اور آسان ترین سلجھاوے سے ملتا ہے جو آپ کو اپنے زمانۂ نظامت میں پیش آئے۔

خدا نے آپ کو حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت میں بھی ممتاز کیا ہے خلق و مدارات کی زندہ مثالیں جو آپ نے قائم فرمائی ہیں وہ حسنِ خلق کے ایسے انمول جواہر پارے ہیں کہ جن کی درخشاں لمعانیت ہر کہ و مہ کے دل میں ہمیشہ جلوہ گر رہے گی یہی وجہ ہے کہ آپ کا دائرہ احباب نہایت وسیع اور با اثر ہے۔ خصوصاً اپنے ماتحتین کے ساتھ آپ نے جس سچی محبت و شفقت اور حقیقی قدر دانی و بندہ نوازی کا جو شریفانہ و مربیانہ برتاؤ کیا ہے اس کا ایک خفیف پرتو آپ کی آخری مُرتبہ سرکاری روئداد میں نظر آتا ہے کہ اِس میں جن حضرات کا ذکر خیر ہوا ہے وہ یقیناً خوش قسمت اور ہر طرح قابل مبارکباد ہیں اور وہ اُس پر جس قدر بھی فخر و ناز کریں کم اور بہت کم ہے۔ اور سچ تو یہ ہے سرکاری و خانگی ہر دو حیثیت سے آپ کا وجود باجود ملک و ملت کے لئے آیۂ رحمت کا موجب تھا جس کا

بین ثبوت آپ کے چھوٹے سے چھوٹے کارنامے میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف بھی ہے کہ مختصر نگاری وضیق وقت کے سبب اجمال کی تفصیل سے قاصر رہنا پڑا ؎

مضمون تمام گشت و بہ پایاں رسید وقت
من ہم چناں بہ اوّل وصفِ تو ماندہ ام

سیّد غلام محمود (ناظر مدارس بلدہ)

جلسۂ الوداعی نواب مسعود جنگ بہادر

یوں تو نواب مسعود جنگ بہادر کے وظیفہ حسنِ خدمت پر از خود سبکدوش ہونے کی افسوس ناک خبریں ایک عرصے سے سنی جا رہی تھیں اور جن کی تصدیق متعدد وداعی عصرانوں اور دعوتوں سے ہو رہی تھی۔ مگر ۲ شہر یور ۱۳۳۷ف کی شام میں وہ سوز و گداز کی گھڑی بھی آپہنچی جب کہ آپ کو باغ عامہ کے ٹاؤن ہال میں منجانب سررشتہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر جس کی نظیر شاید ہی ملے، شاندار عصرانہ اور جذبات خلوص سے بھرا ہوا سپاس نامہ دیا گیا، جہاں اُمرا، حکام اور ہر طبقے، پیشے اور فرقے کے معززین کا کثیر مجمع تھا۔

اس جلسے کی صدارت کو عالی جناب مہاراجہ سر یمین السلطنتہ بہادر صدر اعظم باب حکومت باالقابہم نے قبول فرما کر اس کی شان و شوکت میں چار چاند لگا دئے اور سپاس نامہ پیش ہونے کے بعد اپنی صدارتی تقریر میں بحوالہ فرمان مبارک اظہار خوشنودی فرما کر نواب صاحب ممدوح کو خاص طور پر معزز و مفتخر فرمایا۔ جس کے بعد اپنے دستِ مبارک سے سونے اور چاندی کے کام کا قیمتی کاسکٹ دیا اور متعدد پھولوں کے قدِ آدم ہار پہنائے اور

اخیر میں اپنے گلے کا ہار معزز مہمان کو پہنا کر معانقہ فرمایا۔ پھر نواب ولی الدولہ بہادر بالقابہم بھی اپنا ہار پہنا کر بغل گیر ہوئے۔ گل پوشی کی رسم کی ادائی کے بعد نواب صاحب ممدوح نے سپاس نامے کے جواب میں فصیح اور پُر مغز تقریر انگریزی میں فرمائی جو نصیحت جذبات تشکر اور انکسار پر مبنی تھی۔ ۲۲ شہریور ۱۳۲۳ف کی صبح کو نامپلی اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لئے ایسا ہی شاندار مجمع ہوا تھا جس نے متعدد مطبوعہ نظموں، بے حساب پھول کے ہاروں اور امام ضامنوں کے عقیدت مندانہ اور مخلصانہ پیش کش کے ساتھ رسم وداع کو شایان شان طریقے پر انجام دیا۔ یہ نظارہ سوز و گداز کی عجیب کیفیات اور اثرات رکھتا تھا۔ کئی ایک حضرات وقار آباد، واڑی، گلبرگہ، ہڈگی اور بمبئی تک گئے۔ جن اسٹیشنوں پر ریل گاڑی نہیں ٹھہرتی تھی وہاں بھی لوگ خدا حافظ کہنے کے لئے آئے تھے اور جہاں ریل گاڑی رکتی تھی گل پوشی اور نظم خوانی کے نظارے قابل دید ہوتے تھے، خصوصاً اسٹیشن گلبرگہ پر شاندار مظاہرہ ہوا اور بہت سے تحفے پیش کئے گئے۔

آخر کار ہر وداع کہنے والے کو دعائے خیر کے بعد اپنے مشتعل جذبات کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کرنا پڑا۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

طلبہ جو سبق بازی گاہ میں حاصل کرتے ہیں وہ مکتب کے سبق سے بدرجہا بہتر ہے
(روسو)

سپاس نامۂ وداعی

منجانب عہدہ داران و ارکین سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

بخدمت جناب نواب مسعود جنگ بہادر بالقابہ ناظم تعلیمات سرکار عالی۔

جناب والا!

وابستگان سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی آج نہایت حزن و ملال کے ساتھ جناب کو الوداع کہنے حاضر ہوئے ہیں۔ اس موقع مفارقت پر جب کہ آپ کی ہمدردی اور احسانات جو آپ نے اپنے ماتحتوں پر ہمیشہ کئے ہیں یاد آتے ہیں تو ہماری زبان و قلم دونوں کی قوت اظہار الم کے لئے سلب ہو جاتی ہے۔ سرکاری کاموں میں جب کبھی مشکلات پیش آئیں یا پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے اُن کے حل کرنے میں جس توجہ اور کریمانہ اخلاق کے ساتھ آپ نے ہماری مدد فرمائی وہ ہم کبھی نہ بھولیں گے۔

جناب والا! اس وقت جس امر کا اظہار ہمارے لئے سب سے زیادہ باعث فخر و مسرت ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جن امیدوں کے ساتھ حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہ نے نظامت پر آپ کا انتخاب فرمایا تھا اس دوازدہ سالہ مدت میں اُن امیدوں سے کہیں بڑھ کر آپ کا حسن عمل ثابت ہوا۔

۱۳۲۵ف میں جب جناب اس عہدہ پر فائز ہوئے تو اس وقت اس ملک میں صرف دو کالج تھے اور اب سات ہیں (۲۲) مدارس فوقانیہ تھے اور اب (۴۳) ہیں۔ مدارس وسطانیہ (۸۷) تھے اور اب (۱۸۰) ہیں۔ مدارس تحتانیہ کی تعداد (۱۱۲۲) تھی اور اب (۳۹۷۹) ہے۔ مدارس خاص کی تعداد (۲۰) کے بجائے (۴۹) ہو گئی ہے۔ الغرض جملہ مدارس کی تعداد

(۱۲۵۴) سے بڑھ کر اب (۲۱۸۶) ہوگئی ہے اور تعداد طلبہ (۹۳۲۸۹) سے بڑھ کر (۲،۱۸۵۰۷) پر پہنچی ہے اور سررشتہ تعلیمات کا موازنہ سترہ لاکھ سے زائد از ساٹھ لاکھ ہوگیا ہے۔

جناب والا! آپ کے مبارک و فیض بار عہد میں صرف لڑکوں ہی کی تعلیم پر سعی و توجہ موقوف نہیں رہی بلکہ متعدد زنانہ مدارس کا فروغ و ترقی پذیری۔ ایک کلیۂ نسواں کا افتتاح اور تعلیم نسواں کی جامع تجاویز عملی اس بات کی شاہد و عادل ہیں کہ آپ کو مدارس نسواں کی ترقی و بہتری کا کس درجہ فکر و خیال رہا ہے۔

اسی طرح اساتذہ کو فنِ معلمی میں اعلیٰ تعلیم و تربیت دینے، تجارتی تعلیم کی ابتدا کرنے، اسکاؤٹنگ اور جسمانی تربیت کی ترقی کے لئے بہتر سے بہتر جدید انتظامات بھی آپ ہی کے عہد نظامت کی یادگار رہیں گے۔

جو امور اوپر بیان ہوئے ہیں، وہ محض اعداد و شمار ہیں۔ یہ جناب والا کے اُن اخلاقی اثرات کے مظہر نہیں ہیں جو واقعی علمی ترقی کی بنیاد اور جناب والا کے ماتحتوں کے حق میں ہمت افزائی اور اطمینان قلب کا باعث رہے ہیں۔ جناب کی برمحل امداد سے جیسے کچھ ہمارے حوصلے بڑھے جناب کی خوش اخلاقی، عالی ظرفی، رواداری، ہمدردی اور حق پروری نے جو گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑا ہے وہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔ جناب والا نے ہر علمی اور ادبی کام میں، خواہ اس کا تعلق سررشتہ تعلیمات سے تھا یا نہ تھا، ہمیشہ نہایت کشادہ دلی اور خلوص کے ساتھ معاونت کی چنانچہ جامعۂ عثمانیہ، دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، انجمن ترقی اردو اور دیگر ادارے جناب کی گراں بہا مدد کے ہمیشہ ممنون منت رہیں گے۔

ہم خلوص اور صدق دل سے عرض کرتے ہیں کہ جناب کے وسیع اخلاق نے عام طور پر تمام ملازمین سررشتہ و طلبہ کے اخلاق پر نہایت خوش گوار اثر ڈالا اور جناب کی اعلیٰ شخصیت، وسیع معلومات اور تدبر نے سررشتہ کے رتبہ و توقیر کو بڑھا کر تعلیم کے ہر شعبے میں ایک نئی روح پھونک دی۔

یہ بارہ سال کی مدت جس میں سررشتۂ تعلیمات کا نظم ونسق جناب کے سپرد رہا ایک ایسا زمانہ تھا جسے ہم بجا طور پر عہد" امن و فروغ" کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو نہایت خوش نصیب خیال کرتے ہیں کہ ہمیں ایک ایسے عالی خیال، عالی ظرف اور ہمدرد افسر کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔ ہماری دلی آرزو تھی کہ جناب کچھ مدت اور رہتے اور جن کاموں کا جناب نے آغاز کیا تھا انہیں اپنے روبرو تکمیل کو پہنچاتے لیکن ہماری کم طالعی سے ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے ہمیں سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ قلب محزون کے ساتھ آپ کو خیرباد کہیں۔ اور آپ کے کارہائے نمایاں اور اپنی احسان مندی اور دلی سپاس گزاری کے محض ایک جزو قلیل کو اس ژولیدہ بیانی کی صورت میں آپ کے روبرو عرض کریں۔

جناب والا! جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح آدمی کی قدر و منزلت کا اندازہ اس کے عمل سے ہوا کرتا ہے۔ اب اگر یہ تمثیل بجا ہے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح آپ کے نامور جد بزرگ سرسید احمد خاں (رحمۃ اللہ علیہ) کا اسم گرامی اپنی عظیم الشان تعلیمی اور قومی خدمات کی بدولت ابداً زندہ و تابندہ رہے گا۔ اسی طرح آپ کا نام نامی ممالک محروسۂ سرکار عالی میں ہمیشہ تکریم و محبت کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔

آخر میں ہم درگاہِ رب العزت میں دعا کرتے ہیں کہ آپ جہاں رہیں شاد و آباد رہیں آپ کی دلی آرزوئیں برآئیں اور فرصت و آزادی کے زمانہ میں آپ اپنے ملک کی ارفع و اعلیٰ خدمات انجام دے سکیں کہ زندگی کا اس سے زیادہ مبارک و مسعود مقصد دوسرا نہیں ہوسکتا۔

جناب کے نہایت احسان مند و عقیدت آگین خدام

عہدہ داران و اراکین سررشتۂ تعلیمات

دولت آصفیہ حیدرآباد (صانہا اللہ تعالیٰ عن الزوال و الفنا)

تقریر یمین السلطنت بہادر

معزز خواتین وحاضرین!

سپاس نامے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ واقعی یہ امر سب کے لئے سبب رنج ہے کہ مسعود جنگ بہادر نے یہاں سے جانے کی ٹھان لی۔ یقیناً وہ ہم کو چھوڑ کر نہ جاتے اگر اُن کی خانگی ضرورتیں اُن کو مجبور نہ کرتیں مجھ کو یقین ہے اگر وہ حیدرآباد میں اور رہتے تو اُن کی مفید خدمات کے لحاظ سے ملازمت کے بلند تر زینوں پر وہ ترقی کرتے۔ ہر طبقے میں مسعود جنگ بہادر کی یکساں ہر دل عزیزی جس کا یہ مجمع بھی اپنی زبان حال سے ایک شاہد ہے لائق مبارک باد ہے۔ گزشتہ دو مہینوں سے مسعود جنگ بہادر کے دوستوں نے اُن کو خدا حافظ کہنے میں جو سلسل اہتمام کئے ہیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ میرے لئے یہ اطلاع بھی باعث مسرت ہے کہ عہدہ داران سر رشتہ تعلیمات نے بکمال طیب خاطر، خاطر خواہ چندہ جمع کر کے مسعود جنگ بہادر کی خدمات وعنایات کی یادگار میں مستحق ملازمین سر رشتہ کی اولاد کو وظائف تعلیمی دینے کا بھی مستقل انتظام کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت قدر قدرت کے فرمان مرحمت نشان کی تعمیل میں گورنمنٹ کی جانب سے میں مسعود جنگ بہادر کے پسندیدہ خدمات کی نسبت اظہار خوشنودی کرتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ مسعود جنگ بہادر جہاں کہیں رہیں شاد کام رہیں۔

جواب سپاس نامہ

یور اکسلنسی مہاراجہ بہادر، نواب ولی الدولہ بہادر، معزز خواتین اور حضرات!

انسان کی زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب کہ وہ اپنے خیالات کے ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ وہ وقت میری زندگی میں یہی ہے۔

آپ نے اپنی عنایت سے جس قدر بھی میری تعریف کی ہے، اُس کا میں اپنے آپ کو مستحق نہیں پاتا ہوں۔ سررشتہ تعلیمات میں جو کچھ ترقی اور اصلاح گزشتہ بارہ سال کے اندر ہوئی ہے وہ اراکین تعلیمات کی کارگزاری کا بیّن نتیجہ ہے، جس میں میرا حصہ کم ہے۔ آپ نے جو مجھے خوبصورت کاسکٹ دیا ہے، میں اُس کو آپ کی محبت کی یادگار سمجھوں گا اور میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہمیشہ بطور بیش بہا تحفے کے بحفاظت رہے گا۔

حضرات! میں اس وقت نصیحت کے طریقے پر کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کو محسوس کیا ہے اور کرتا رہوں گا کہ آیندہ نسلوں کی ترقی کے لئے تعلیم سے بڑھ کر اہمیت رکھنے والی کوئی چیز نہیں ہے اور تعلیم ہی کے ذریعہ ہم ایسی نسل تیار کرسکتے ہیں جو ہمارے ملک کو دوسرے ممالک کی نظروں میں اعلیٰ رتبہ پر پہنچنے کے قابل بنا سکے یاد رکھو کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بجز محکمہ تعلیمات کے جس کے رکن ہونے کا آپ کو فخر حاصل ہے، کوئی اور محکمہ ایسا اہم ہے اور نہ اس قدر مفید۔

صداقت و وفا شعاری کی کسی محکمہ میں اتنی ضرورت نہیں ہے، جس قدر آپ کے محکمہ کے لئے ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی یقین رکھنا چاہئے کہ آپ کو امداد باہمی کے اُصول بھی پیش نظر رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ مجھ کو بیرسٹری، مدرسی، اور نظامت تعلیمات کے تجربات نے بتلا دیا ہے کہ آپ بہت ہی اہم اور بڑی ذمہ داری کی خدمت ادا کر رہے ہیں اگر آپ نے اپنے عیوب پر نظر نہ ڈالی اور اُن کو دُور نہ کیا تو یہ خوف ہے کہ اُن کے زہریلے اثرات، آنے والی نسلوں کے حق میں مضر ثابت ہوں گے۔ مدرس تو اُس کو کہیں گے، جس میں دنیا کا نقشہ بدل دینے کی قوت ہو۔ میں اُس دن کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب ریاست حیدرآباد جو ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے، اقتصادی

معاشرتی اور تعلیمی حیثیت سے دوسری ریاستوں پر تفوق حاصل کرے گی۔

یور اکسلنسی۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں قوت نہیں ہے اور میں نواب ولی الدولہ بہادر کا شکریہ بھی ادا کرنے کے قابل نہیں ہوں، جنھوں نے میرے ہاتھ پھیلانے پر انجمن ترقی اردو کو پانچ سو روپیہ کا قابل قدر عطیہ عنایت فرمایا اور نواب صاحب ممدوح نے ہمیشہ مجھ پر عنایت رکھی۔

میں یور اکسلنسی کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں جو دنیائے ادب میں شاد کے نام سے مشہور ہیں اور یہاں کی ایک قابل فخر و ناز خدمت سے ممتاز ہیں۔ خدائے تعالیٰ یور اکسلنسی کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدائے برتر ہمارے اعلیٰ حضرت بندگان عالی کی عمر و اقبال میں ترقی دے اور ہمیشہ ان کے ملک کو سرسبز اور شاداب اور اُن کی رعایا کو آباد رکھے۔

اس تقریر کے اختتام پر مسٹر شاکراس نے عالی جناب مہاراجہ یمین السلطنت بالقابہم کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔
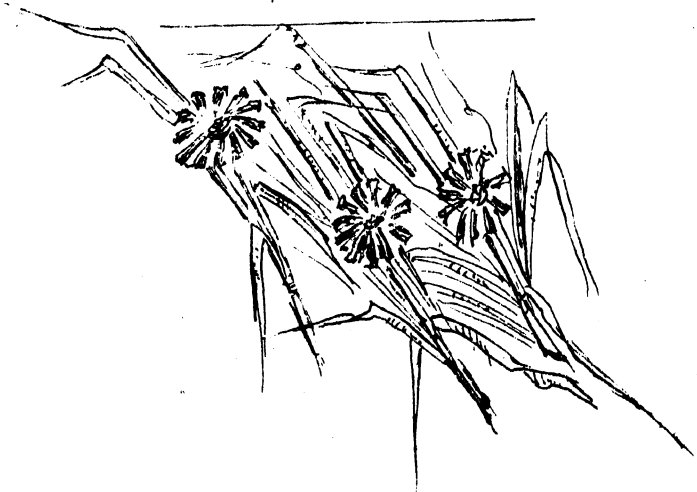
رپورٹ نمائش تعلیمی

(متعلقہ سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ مستقر بلدہ بابتہ ۱۳۳۷ف) سال حال انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی کانفرنس کے ساتھ نمایش تعلیمی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ عالی جناب راجہ راجایاں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے اپنے دست مبارک سے نمایش کا افتتاح فرماکر اس کی رونق دوبالا فرمادی۔ مہاراجہ بالقابہم نے دست کاری اور صنعت پر اظہار طمانیت و خوشنودی فرمایا اور چند اشیا خرید فرماکر تازہ روح پھونک دی۔
اس سال ۲۴ مدارس سے سامان وصول ہوا۔ بمقابلہ سال گزشتہ ۱۶ مدارس کا اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح تعداد اشیا سال زیر رپورٹ میں ۱۳۴۴ رہی جس میں بمقابلہ گزشتہ ۲۷۹ کی بیشی ہوئی۔ اشیاء مذکور بلحاظ صفائی و جدت اس مرتبہ بدرجہا بہتر تھیں۔
تشخیص انعامات کا کام مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل سٹی کالج مس لو اور مس ولسن نے عمر و طبقہ کے علاوہ جدت اور صفائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بکمال احتیاط انجام دیا۔ امتیازی اسناد از روئے مسابقت اُن مدارس کو دی گئیں جن کو زیادہ تعداد میں انعام ملے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

طبقہ	نام مدارس ذکور	و اناث	نوعیت سند امتیازی
فوقانیہ	سٹی کالجیٹ اسکول	زنانہ کالج نامپلی	درجہ اول
〃	چادرگھاٹ ہائی اسکول	....	〃 دوم
وسطانیہ	وسطانیہ دارالشفاء	وسطانیہ حسینی محلہ	〃 اول
تحتانیہ	تحتانیہ چادرگھاٹ	تحتانیہ شاہ علی بنڈہ	〃 اول
مدارس صنعت و حرفت	مدرسہ عثمانیہ صنعت و حرفت	....	〃 اول
	〃 آصفیہ ملک پیٹھ	....	〃 دوم

ان اسناد کے علاوہ انفرادی طور پر ۱۶ نقرئی تمغے (انعام درجہ اول) مع سند عطا کئے گئے۔
درجہ دوم کے ۲۶ انعام (مشتمل بر اشیاء مفید) مع سند درجہ دوم بھی تقسیم ہوئے۔ مدرسین کی تیار کی ہوئی چیزوں کے لیے بھی (پانچ) انعام درجہ اول اور ۳ سند درجہ دوم حسب تفصیل ذیل تقسیم ہوئی

(۱) عبدالحمید خانصاحب مدرس سٹی کالج ۲ انعام درجہ اول | (۵) کے جی نائڈو صاحب ڈرائنگ ماسٹر فوقانیہ دارالعلوم سند درجہ دوم
(۲) گنگا دھر بھاٹک صاحب ڈرائنگ ماسٹر وسطانیہ گوشہ محل ۱ ״ | (۶) عبدالحمید خاں صاحب مدرس سٹی کالج ״
(۳) جگناتھ پرشاد صاحب ڈرائنگ ماسٹر مدرسہ انوار العلوم نام پلی ۱ ״ | (۷) احمد نواز خاں صاحب مدرس فوقانیہ نام پلی ״
(۴) مشتاق احمد صاحب مدرس وسطانیہ دارالشفا ۱ ״

. . . .

ایام کانفرنس میں نمایش کا وقت صبح اور شام کو علاوہ اوقات کانفرنس رکھا گیا تھا جس میں معزز مہمان اور اراکین انجمن وغیرہ نے سامان نمائش کو نہایت شوق اور دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ کیا۔
اختتام کانفرنس کے دوسرے دن عالی جناب نواب مسعود جنگ بہادر نے بلدے کے مدارس کو ایک دن کی چھٹی دی تاکہ طلبہ بھی مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ اس روز طلبہ جوق جوق جن کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی آئے اور سامان نمایش کو شوق سے دیکھا۔ اس کثیر تعداد کا انتظام ایک مشکل کام تھا لیکن خدا کے فضل اور حکام سررشتہ کی نیک نیتی سے بغیر کسی بدعنوانی کے جملہ امور اطمینان بخش طریقے پر انجام پائے۔

اس خصوص میں جناب مولوی سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج کا شکریہ ادا کیا جانا ضروری ہے۔ جناب معزز نے ازراہ مہربانی و علم پروری نمایش کے لئے مکان و فرنیچر وغیرہ سے امداد فرمائی۔ انتظامات نمایش میں اراکین کمیٹی و دیگر مدرس صاحبان کی اعانت کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے خصوصاً مولوی عبدالحمید صاحب مدرس سٹی کالج کا جنھوں نے اس اہم کام میں اپنی فطری دلچسپی سے حصہ لے کر نمائش کو کامیاب بنایا۔

نظیر حسین شریف
معتمد سب کمیٹی نمائش

attainments, administrative genius and keen sense of duty. His administration was characterised by thorough impartiality and mutual confidence between him and his immediate subordinates. He exercised the greatest care in choosing his officers, but having once chosen them and satisfied himself as to their efficiency and integrity, he trusted them and gave them every encouragement and support. Thanks to this policy, he was able to secure the willing co-operation of his subordinate officers and also to maintain strict discipline in the Department. At the same time, by his natural sympathy, kindness and courtesy, he won a popularity which, as the send-off given to him at his departure from Hyderabad showed, was quite unique. We agree with those who think that it is very difficult, if not impossible, to replace Nawab Masood Jung Bahadur; but we believe that if his successor, whoever he may be, works along the lines laid down by him, there is no reason why the future of the Education Department in Hyderabad should not be bright.

Though Hyderabad will no longer benefit by Nawab Masood Jung Bahadur's services, we pray that he may live long to serve the wider cause of India, which he has always had at heart. We wish him every success in all his plans for future work.

Editorial Notes.

Ourselves.

With the publication of this issue, the *Hyderabad Teacher* enters on the 3rd year of its existence. We are glad to say that during the year which has just closed the journal was approved by the text-book committees of several provinces in British India. There has also been a satisfactory increase in circulation. But while the appreciation of our efforts in various quarters is a source of great encouragement to us, we regret to say that the number of subscribers is not yet sufficiently large to make the magazine self-supporting, for about 25% of the cost has still to be met out of the funds of the Hyderabad Teachers' Association. We appeal to all those who are interested in educational matters to help us by purchasing the magazine. We have kept the subscription as low as possible in order to enable even teachers drawing small salaries to become subscribers.

Nawab Masood Jung Bahadur.

Nawab Masood Jung Bahadur, B. A., (Oxon), Barrister-at-Law, retired on the 25th July, 1928, after having served as Director of Public Instruction, H. E. H. the Nizam's Dominions, for a period of 12 years. His departure has caused universal regret here. We have published elsewhere a review of the progress of education in the Dominions during his tenure of office. Apart from the enormous increase in the number of schools and scholars, we think that Nawab Masood Jung Bahadur will always be remembered for raising the prestige of the Education Department and securing for the teachers a status which they had never enjoyed before and which compares very favourably with the status of teachers in the most advanced provinces of British India. The success which he achieved in these and numerous other directions was due chiefly to his towering personality, intellectual

the men and 2% of the women in India were literate. Illiteracy, he said, was the greatest curse in India. That countries like Japan, Germany and America were in the vanguard of civilisation was mainly due to the fact that there the percentage of literates was very high, reaching 80 to 90. In this connection, the learned lecturer emphasised the need for the establishment of vernacular universities in India. He spoke of his own Women's University of Poona and the Osmania University of Hyderabad as a step in the right direction for reducing illiteracy. Professor Karve also advised young men to devote their time and energy to the removal of this evil. In the end, he drew attention to the problem of unemployment among the educated classes in India. He suggested that young educated Indians should cease to make service, either Government or private, the goal of their life and should chalk out other independent lines of work. He cited the examples of the institutions at Ahmedabad, Surat and Bombay, where educated men were working on mere subsistance allowances and training boys and girls for independent professions.

* * *

Dr. Harold Mann's Lecture on 'Education in Rural Schools'.

At a meeting of the Hyderabad Teachers' Association held on the 24th August, 1928, under the presidency of Nawab Zulkadar Jung Bahadur, M.A., (Cantab), Barrister-at-Law, Home Secretary, Dr. Harold Mann delivered a brilliant lecture on "Education in Rural Schools". We shall publish a full report of the lecture in our next issue.

Mr. Shawcross, President of the Entertainment Committee, proposed a vote of thanks to the Maharaja Bahadur and other distinguished guests. After the termination of these proceedings, the guests were served with refreshments.

* * *

The Hyderabad Educational Exhibition.

The Educational Exhibition held in connection with the 2nd Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association was a great success. The number of schools which took part in the exhibition was 42 as against 26 in 1926, while the number of exhibits was 1344 as compared with 1066 on the previous occasion. The exhibits consisted of pictures, clay models and art and craft work. First class certificates were awarded to the City Collegiate School, Government Middle School, Darus Shafa, Government Primary School, Chaderghat, Zenana College, Nampally, Zenana Middle School. Husaini Mohalla and Zenana Primary School, Shah Ali Bunda The teachers who received first prizes were Mr. Abdul Hamid Khan (City College), Mr. Gangadhar Phatak (Gosha Mahal), Mr. Jaganath Pershad (Anwarul Uloom, Nampalli) and Mr. Mushtaq Ahmed (Government Middle School, Darus Shafa). Mr. S. M. Azam, M.A. (Cantab)., Principal, City College, Miss R. W. Love of the Mahboobia Girls' High School and Miss D. Webster of St. George's Grammar School kindly acted as judges. Mr. Nazeer Husain Sharif, Secretary of the Exhibition, deserves much credit for the excellent manner in which he organised the Exhibition.

* * *

Professor Karve's lecture on Education.

On the 11th July, 1928, in the hall of the Young Men's Improvement Society, Hyderabad Deccan, Professor D. K. Karve of Poona gave an instructive lecture, the title of which was "Stray Thoughts on Education". Mr. Abdur Rahman Khan, Principal, Osmania College, was in the chair. The lecturer deplored that only 15% of

goodness of your heart is not deserved by me. Whatever the Educational Department has been able to achieve during the past 12 years is entirely the result of the co-operation of the members of the Educational Department. My own share therein is a small one. The casket which the members of the Educational Department have given me will always be treasured by me as one of the dearest possessions of my life.

Ladies and Gentlemen, as this is the last occasion when I shall address the members of the Educational Department, it may not be out of place if I give you a few words of advice. I feel that we are living in an age of progress and that no country is more full of promise in this respect than our own. In the great State of Hyderabad, remember that there is no department that is going to play a greater part, a nobler part, than that to which you have the honour to belong. And remember that sincerity and loyalty are the two things required. These two qualities together with a third one, *viz.* co-operation, are essential for you. My own experience not only as a professor, but also as head of the department, has taught me that no responsibility can be greater than that which lies on the shoulders of those who teach. Intimate relations must exist between you and the pupils. But if you do not take the fullest care to self examine and to improve your own defects, you will be perpetuating those things among the youth you teach. To me who gave up the profession of law, these feelings are religious in their intensity. Ladies and gentlemen, I look forward to that day when it will be said that the largest state in India is also the most advanced state socially, morally and intellectually." Nawab Masood Jung Bahadur then thanked His Excellency the Maharaja Kishen Pershad Bahadur and Nawab Wali-ud-Dowla Bahadur for the kindness and courtesy which they had always extended towards him, and he ended his eloquent speech with prayer for His Exalted Highness the Nizam.

After an Urdu translation of the above address had been read by Mr. Syed Mohamad Husain Jaffery, B. A., (Oxon :), Acting Director of Public Instruction, Miss Amina Pope, Principal, Zenana Nampalli Intermediate College, presented a beautiful silver casket to Nawab Masood Jung Bahadur as a token of remembrance on behalf of the members and officers of the Educational Service.

The Nawab Saheb was then garlanded so profusely by the heads of the various Divisions and High schools that his face was hardly visible. Before the conclusion of the ceremony, His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, and after him, Nawab Wali-ud-Dowla Bahadur took off their own garlands and put them round the neck of Nawab Masood Jung Bahadur and embraced him.

His Excellency the Maharaja Bahadur delivered a short speech in the course of which he referred in eloquent terms to the services rendered by Nawab Masood Jung Bahadur. He said that the large gathering which had assembled that afternoon was a clear evidence of the popularity which Nawab Masood Jung Bahadur had enjoyed during his stay in Hyderabad. It had given him much pleasure to learn that the officers and members of the educational service had decided to commemorate Nawab Masood Jung Bahadur's services by giving scholarships annually to the sons of deserving members of the service. In conclusion, His Excellency expressed, on behalf of H. E. H. the Nizam's Government, their deep appreciation of the work done by the retiring Director of Public Instruction.

Nawab Masood Jung Bahadur replied as follows :—

"There are occasions in a man's life when it becomes well nigh impossible for him to give adequate utterance to what his heart feels. In my life, ladies and gentlemen, this is such an occasion. The many gracious things said about me, and the honour you have done me have moved me profoundly. But I feel that the praise you have sung by the

Thus, the Osmania University, the Translation Bureau, Dairatul Maarif, the Anjuman-i-Taraqq-e-Urdu and other organizations will ever feel indebted to you for your generous and sympathetic help.

We can truly and sincerely say that your personality has brought a happy influence to bear upon the characters of all the teachers of the Department and all the students of the State. Your extensive knowledge and administrative genius have raised the status and the dignity of our Department, while infusing a new spirit into every branch of education.

The twelve years of your Directorship have been indeed years of steady progress; and we deem ourselves extremely fortunate that it has been our lot to serve under so high-minded, cultured, and sympathetic a chief. It was our cherished hope that you would stay with us for some time longer, in order to carry to completion several works which you have so well begun. Unfortunately for us, you have decided otherwise. So it is with sad hearts that we have come to express but a little part of the gratitude we feel for the noble work you have done and for all your kindness to us.

As a tree is known by its fruit, even so a man's value can be estimated from his work. If that analogy holds good, we can declare with certainty that, just as the name of your distinguished grandfather Sir Sayyid Ahmed, will shine for ever on account of his educational and social services, even so your name will always be remembered with affection and respect in these Dominions.

In conclusion, we pray that you may be happy where-ever you may be, that you may realize your cherished aspirations, and, in your freedom, may render still further and still greater service to your country, than which there is no nobler aim in life."

In the year 1325 Fasli, when the burden of office was placed on your shoulders, there were only two colleges in the State; to-day there are seven. The number of High Schools has increased from twenty-two to forty-three. There were only eighty-seven Middle Schools; now we have one hundred and eight. During the twelve years of your Directorship, the number of Primary Schools has increased from 1,123 to 3,979, and Special Schools from 20 to 49. Thus the total number of schools has increased from 1,254 to 4,186, and the number of students attending those schools has risen from 93,279 tc 2,71,857, while the educational budget has advanced from 17 lakhs to above 60 lakhs of rupees annually.

Under your beneficent regime, attention has not been devoted solely to the education of boys. The flourishing condition of some educational institutions for girls, the opening of a college for women, and a comprehensive and practical scheme bear eloquent witness to the interest you have shown in their advancement.

Your term of office as Director will also be remembered for the excellent arrangements which you have made for the efficient training of teachers, for the introduction of commercial training and scouting and for the development of physical education. These facts are merely in the nature of statistics and so cannot convey the moral influence—the real foundation of cultural progress—which has given so much satisfaction to those under you. Your timely help which has so often encouraged us; your kindness, courtesy, infinite patience, impartiality and tolerance, your unfailing sympathy, your keen sense of justice—the profound impression which these qualities have left upon our minds is ineffaceable.

You have assisted to the utmost of your power every educational and literary work and movement, whether directly connected with the Educational Department or not.

Notes and News.

On the 26th July, 1928, the spacious Town Hall with its gallery was packed to its full, as the members of the Educational Department had assembled to bid farewell to Nawab Masood Jung Bahadur, the retiring Director of Public Instruction. The function was presided over by H. E. Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, and among the distinguished guests were Nawab Wali-ud-Dowla Bahadur, Nawab Lutfud-Dowla Bahadur, Nawab Sir Aming Jung Bahadur, Nawab Sir Hyder Nawaz Jung Bahadur and a number of other high officials of the State.

Farewell Entertainment to Nawab Masood Jung Bdr.

The proceedings began with the reading of a poem composed by Moulvi Hakim Mohammad Yusuf Saheb, in which was sung the praise of Nawab Masood Jung Bahadur. On behalf of the officers and members of the Educational Service, H. E. H. the Nizam's Dominions, Mr. H. W. Shawcross, M. A. (Cantab), Principal, Jagirdar College, read the following address in his stentorian voice:—

"It is with full hearts that we, the servants of the Educational Department of His Exalted Highness the Nizam's Dominions, have assembled here to bid you farewell. We are powerless to express our grief and regret when we remember all your kindness and sympathy towards us who have served under you. The unfailing courtesy and attention with which you always met us in helping us to solve our various official difficulties and problems can never be forgotten.

Of one thing we are able to feel proud and glad; it is that those hopes with which His Exalted Highness the Nizam selected you for the high and responsible office of Director of Public Instruction in these Dominions, have been more than fulfilled by the brilliant work you have accomplished in your twelve years of service.

in the whole of the Dominions when Nawab Masood Jung Bahadur took charge of the Department, at present there are 3979 schools. Including private schools, which have been recently brought under the supervision of the Department and whose number in 1336 Fasli was 1211, there is at present one school, either Government or private, for every 8.9 square miles of His Exalted Highness the Nizam's territory. This proportion compares very favourably with the state of affairs existing in some parts of British India. Towards the end of his stay in Hyderabad, Nawab Masood Jung Bahadur also took the preliminary steps for the introduction of compulsory education in urban areas. As far as the Hyderabad city is concerned, the necessary statistics have been collected and the Government have approved of the deputation of one of the senior officers of the department to Mysore for a study of this question.

Other excellent features of the term of office of Nawab Masood Jung's directorship are the institution of commercial classes in the City and Chaderghat High Schools, the introduction of scouting in the state and the encouragement given to physical education by the appointment of a whole-time officer to look after this side of education.

This brief review would be incomplete without a mention of the benefits that cannot very easily be measured. In the words of the address presented by the officers of the Department on the eve of his departure, it can truly be said that Nawab Masood Jung's personality brought a happy influence to bear upon the characters of all the teachers of the Department and all the students of the state, while his extensive knowledge and administrative genius raised the status and dignity of the Department, at the same time infusing a new spirit into every branch of education.

two at Hyderabad—one for boys and one for girls—and the fourth at Warangal. Further, the medical school was raised to the status of a college and affiliated to the Osmania University. Thus, while there were only two colleges at the beginning of the period, there are seven at present.

The first step in the work of re-organisation of the Department was the creation of Divisional Inspectorships. Previous to this, there was an Inspector of Schools in each district in charge of Primary and Middle schools and a Chief Inspector of Schools for the inspection of High schools. But the rapid increase in the number of schools and the pressure of routine work in the Head-Office made decentralisation of administration necessary in the interests of the efficiency of the Department. Consequently, the office of Chief Inspector of Schools was abolished and a Divisional Inspector of Schools was appointed to control the work of the District Inspectors and also to supervise the High schools in each Suba. Side by side with this, secondary education was improved by the abolition of purely Urdu Middle schools and oriental Titles Examinations and by the opening at suitable places of Osmania High schools to act as feeders to the newly-established university. At the time of the foundation of the university, there were only five such high schools; at present there are twenty.

Other reforms undertaken for the improvement of secondary education were the employment of graduate teachers in larger numbers, the provision made for sending such teachers to British India for training and the establishment of training classes for Matriculates and F. A.'s at Hyderabad itself. Further, the cause of education was indirectly helped by improvements effected in the pay and prospects of all the teachers employed under the Department.

In the field of Primary education, great strides have been made. While there were only 1123 Primary schools

Table showing the progress during a period of 12 years, *i. e.*, from $\frac{\text{1325 F. to 1336 F.}}{\text{1916 to 1927 A. D.}}$

Kind of institution.	1325 FASLI.		1336 FASLI.	
	No. of schools and colleges.	No. of Scholars.	No. of Schools and Colleges.	No. of Schola
Colleges ...	2	213	7	1,143
High Schools ...	22	6,765	43	16,104
Middle Schools ...	87	17,809	108	25,802
Primary Schools ...	1123	66,386	3979	224,983
Special Schools ...	20	2,116	49	3,825
Total ...	1,254	93,289	4,186	2,71,857

It is evident from the above that the number of schools and scholars trebled themselves during the above-mentioned period. These statistics, though illuminating, cannot give an idea of the actual work done. It is therefore necessary to examine that aspect of Nawab Masood Jung Bahadur's work which figures do not reveal.

College education received a great impetus with the foundation of the Osmania University. Whoever may have conceived the idea of the University, it cannot be gainsaid that the persons who brought it into actuality were Sir Akbar Hydari and Nawab Masood Jung Bahadur. The latter was also responsible for forming the various academic bodies and running the University College for the first few months until the appointment of a permanent principal—duties which he cheerfully undertook and efficiently carried out, in spite of the fact that at the same time he was in charge of the Education Department. The cause of university education was further advanced by him by the establishment of Intermediate Colleges, one at Aurangabad,

There is an examination office for considering the applications which are received. Such applications as are approved are passed on to an examination committee, which decides the case of each candidate after personally interviewing him and giving him in the subject for which he seeks admission one or more written exercises to work out.

To be continued.

A Brief Review of the Progress of Education in H. E. H. the Nizam's Dominions during the Directorship of Nawab Masood Jung Bahadur

BY

AHMED HUSAIN KHAN, B. A.,

Principal, Darul Uloom High School.

THE retirement of Nawab Masood Jung Bahadur from the directorship of the Education Department of His Exalted Highness the Nizam's Government closes a very important chapter in the history of education in Hyderabad, as the period during which the Nawab Saheb was at the head of the Department was one which was characterised throughout by unparalleled activity for the thorough overhauling and re-organisation of the system of education in Hyderabad. No doubt, this work of reform was started by Dr. Alma Latifi; but the latter did not stay in Hyderabad sufficiently long to effect any appreciable change, and it was left to Nawab Masood Jung to begin anew and complete the work of modernising the whole system.

The following table will give at a glance an idea of the progress achieved during the period under review:

England and America. It is not a lash held over scholars to make them work the harder, nor does it convert a youth into a mere machine for grinding out facts on demand. It allows full play to the individuality of pupil and teacher, and gives both every opportunity for performing the best possible service. It leaves the teacher free to devote his best energies to the mental-spiritual development of his charge, without the suspicion that some one may come in, wholly ignorant of the character of his pupils and of his course of instruction, to test them on what might be the veriest non-essentials. It gives free scope for the best teachers to work out their problems in their own way; it sets a standard below which the poor teacher dare not fall; in short, it accomplishes all that any system of examinations could be expected to do, while it is free, at least in its practical workings, from the evils incident to the popular methods of this country."

In recent years provision has been made in Prussia for giving an opportunity to specially gifted young men and women, who have left school before finishing the nine-year course in a gymnasium but who have continued their studies privately in any subject, to proceed to a university without the Leaving Certificate. The conditions for the admission of such people to a university are as follows:—

(a) A candidate must not be below 25 nor above 40 years of age.

(b) He must produce trustworthy guarantee to the effect that he is able to follow university lectures in the subject chosen by him.

(c) The application for admission must be made not by the candidate but by persons having personal knowledge of his accomplishments and competent to judge his ability.

(d) He must have achieved distinction and produced acknowledged results in the occupation in which he has been engaged.

and partly on the result of his written examination and oral test. Successful candidates receive a certificate signed by the members of the examining committee. This certificate shows in detail the character, intellectual ability and special likings of the candidate as well as his share in the various activities of the school and the state of his health.

The purpose of the examination is not so much to test the extent of the candidate's information as to test his power of using the knowledge which he has acquired at school. Memory work does not pay at all; it is the ability of the candidate which counts: not merely the ability which he displays at the examination but also the ability which he has shown in his daily work at school. At the same time, he is given an opportunity of proving his special talents. Above all, he is examined not by outsiders who do not know him at all, but by those with whom he has come into daily contact and who are acquainted with the limits of his powers and are able to differentiate between what is important for him to know and what is not. Thus the German system avoids many of the evils associated with examinations in other countries.

Lest it should be considered that I am exaggerating the merits of the system of examination obtaining in Germany, I should like to quote the opinion which Russell has expressed in his book "The German Higher Schools". This book appeared in 1910. Since then, not only have the German Higher schools been reorganised, but changes have been introduced in the Leaving Examination to make it more perfect. Therefore, Russell's remarks apply with greater force to-day than they did 18 years ago. He says, "There could scarcely be a better system of examinations for secondary schools than that which has been worked out in Germany. If one does not find himself in full sympathy with it on its theoretical side, he is forced to acknowledge its superior excellence in its practical workings, especially when it is contrasted with the prevailing systems in

education. For the written examination, each teacher of *Oberprima* submits to the director a list of questions in each subject. After going through these questions and making, in consultation with the teacher, such alterations as may be necessary, the director forwards them to the Inspector, who finally draws up the paper from the questions received by him. The Inspector may, of course, make changes if he thinks that the questions do not come up to the required standard or are defective for some other reason. But in the last analysis, the examination is controlled by the teachers. The director and the teachers are bound by their honour to keep the questions for the examination strictly confidential, and experience has shown that they never abuse the confidence reposed in them.

The written examination includes German composition and mathematics in all the schools, translation from Greek and Latin into German in the classical *Gymnasium*, papers on modern foreign languages in the *Realgymnasium*, *Oberrealschule* and *Deutsche Oberschule*, a paper on chemistry, physics or biology at the candidate's choice in the *Oberrealschule* and a paper on either history or geography, also according to the candidate's choice, in the *Deutsche Oberschule*. In translating from a foreign language, candidates are allowed the use of lexicons. Another interesting feature of the examination is that, in exceptional cases, a candidate is permitted to present a thesis written by him in the course of the year on some phase or aspect of one of the examination subjects, in which case he is exempted from the paper on that or some allied subject at his choice. For the oral examination also he may select a subject in which he has specialised. The board of examiners choose the other subjects, which are generally those in which the candidate is likely to do well.

At the end of the examination, the board of examiners consider fully the case of each candidate. They base their final decision partly on the candidate's record in the schoo

utilitarian rather than cultural reasons, for a knowledge of Spanish is of immense value in commerce. French is losing the prominent place which it once occupied in the school curriculum, partly because of the national prejudice against France and partly because, rightly or wrongly, the Germans now consider the English-American culture to be more important than the French culture. There is still, however, a higher school in Berlin with French as the medium of instruction. On the recommendation of the Prussian Ministry of Education, I visited this school during my stay in Berlin. It is known as the Franzosisches Reformgymnasium, and is situated close to Unter den Linden, which is one of the most aristocratic quarters of Berlin. It was founded originally for the education of the children of the Huguenots. It was here that the ex-Crown Prince of Germany was educated, and in the Director's room I was shown the chair which the prince used to occupy. The school is now attended chiefly by pupils who wish to join the diplomatic service, for which a high standard of French is required.

The Reifeprüfung or Leaving Examination

Up to *Unterprima* a scholar in a German higher school is promoted annually from class to class accordingly to the judgment of his teachers. It is only the students of the highest class—*Oberprima*—who are required to appear in a formal examination called the *Reifeprüfung* or Leaving Examination. Even this examination is of quite a different type from the examinations with which we are familiar in India. The universities have nothing to do with it; nor is it a common examination for all the higher schools. Each *Gymnasium* holds its own examination. The examination board, however, includes, besides the director or head-master and teachers of *Oberprima*, the Inspector of the school, who acts as chairman.

The examination is partly written and partly oral. To this has been recently added an examination in physical

It will be seen from what has been said before that the subjects which are common to all the higher schools are religion, German history, geography, science, mathematics, foreign languages and drawing. It is the emphasis on certain lines of study (classical languages in the *Gymnasium*, modern foreign languages in the *Realgymnasium*, mathematics and science in the *Oberrealschule* and German in the *Deutsche Oberschule*) which distinguishes one type of higher school from another. The admission of a student to different courses of study in a university depends upon the type of higher school which he has attended. This means that parents have to choose the future career of their children when the latter are only ten years old. This is one of the weak points in the German school system. Transition from one kind of higher school to another is, however, possible in the case of pupils attending the *Reformrealgymnasium*, *Oberrealschule* and *Deutsche Oberschule*, the lower classes of which have a more or less common curriculum. There is also the *Aufbauschule* which gives the parents an opportunity of selecting a course for their children after their personality and aptitude are adequately known; but, as has already been stated, this type of higher school is to be found only in small towns.

Less than 60 per cent of the pupils who complete the nine-year course in a *Gymnasium* enter the university. The rest take up business careers requiring higher educational qualifications. There is a tendency now for making the curriculum of the upper stage more elastic so as to satisfy the needs of non-academic occupations and at the same time to allow the varying capacities of the pupils to be developed fully.

Among the modern foreign languages taught in the German higher school, English is becoming increasingly popular and displacing French as the first modern language. The study of Spanish is also encouraged. This is done for

Another post-war institution is the *Aufbauschule*, or the Extension School, which receives pupils who have put in 7 years in the elementary school and gives them secondary education for 6 years. The *Aufbauschulen* have been created out of the normal schools for elementary teachers which have been closed. They are, at present, confined to small towns, but they are very popular and their number has been steadily increasing. This popularity is due to three reasons: in the first place, they link up the upper classes of the elementary school with the secondary school; secondly, pupils whose intellectual capacity has developed late are given an opportunity of receiving secondary education; thirdly, in places where there is no secondary school, parents are enabled to keep their children at home up to 13 years of age. In view of the fact that the period of preparation for the School Leaving Examination is only 6 years in the *Aufbauschule*, as opposed to 9 years in the other kinds of higher schools, great care is taken to admit into the former only talented children from villages and small towns. The courses of study are the same as those for corresponding classes either in the *Oberrealschule* or the *Deutsche Oberschule*. This is why the *Aufbauschule* is not treated as a separate type of higher school.

The higher schools for girls are the *Oberlyzeum*, based on the principles of the *Realgymnasium*, *Oberrealschule* and *Deutsche Oberschule*. The curriculum is the same as for the corresponding schools for boys except that: (1) the usual course is supplemented by lessons on music, needlework and domestic science; (2) greater attention is paid to religious instruction; (3) in the *Oberlyzeum* Latin is less important than in the corresponding school for boys; (4) the girls in all the schools begin with a modern foreign language. The total number of working hours per week is shorter than in the schools for boys, the daily hours of work being 8 a. m. to 12-30 p. m., as compared with 8 a. m. to 1 p. m. in the boys' schools. Physical education is compulsory as in the latter schools.

(2) The *Realgymnasium.* This type is a compromise between two different tendencies in education, the classical and the utilitarian. It aims at acquainting its pupils with European thought since the Renaissance and its influence on the German culture. The curriculum includes two modern foreign languages, one of which is begun in the 6th or lowest class and the other in U III or 4th class. Only one classical language, viz. Latin, is taught, and it is studied for 9 years in the *Realgymnasium,* 6 years in the *Reformgymnasium* (*i. e.* from U III to O. I) and 4 years in the *Reformrealgymnasium* (*i. e.* from U II onwards). In the middle and high stages more time is devoted to mathematics and natural sciences than in the *Gymnasium.*

(3) The *Oberrealschule.* The *Oberrealschule* lays special stress on mathematics and natural sciences. Thus, whereas in the *Realgymnasium* only 4 periods a week are allotted for mathematics and 3 for natural sciences in the middle and high sections, the pupils of the *Oberrealschule* study mathematics for 5 and natural sciences for 6 periods in the said stages. The curriculum also includes two modern foreign languages, but they do not receive the same attention as in the *Realgymnasium* and the instruction is based more on practical than on scientific lines. No classical language is studied in the *Oberrealschule.*

(4) The *Deutsche Oberschule.* The *Deutsche Oberschule* or the German Upper school is a post-war creation. It aims at the thorough study of national culture and therefore special attention is paid to the language, literature and history of Germany. In view of the cultural relations with England and France, either English or French may be chosen as the first foreign language, which is taught from the lowest class onwards. Later on, a second foreign language (English if the first foreign language is French and *vice-versa*) may also be studied.

Realien **means facts or actualities of all kinds.**

in the high stage. These hours, however, do not include the time spent on physical exercises, games and excursions.

The most striking feature of the German higher schools, and one which is at first bewildering to a foreign visitor, is their variety. There are four main types of these schools:

(1) The *Gymnasium**. This is the earliest type, dating from the 16th century. The *Gymnasien* were originally established for giving professional training to the clergy and consequently emphasised Latin, Greek and Hebrew, especially Latin. After the Renaissance and the Reformation, they provided a more liberal training, though the emphasis on the ancient languages remained. Under the influence of the great educational reformer Humboldt, the *Gymnasium* grew up in the 19th century to be a centre of the humanistic sentiment and intellectual discipline. He was a great admirer of the Greek ideals of life and he wanted the students of each *Gymnasium* to be imbued with these ideals. For a long time the *Gymnasien* enjoyed a privileged position. All those who wished to become clergymen, jurists, doctors or higher officials of the state were required to pass through these schools. It was not till the end of the 19th century that the other types of the higher school, which the growing material needs of the middle and commercial classes had brought into existence, were recognised as giving an education of equal value for the general cultivation of the mind.

Religion, German, Latin, geography, mathematics, natural sciences and drawing are taught in all the classes. Greek is begun in U III, a modern foreign language in IV and history in V, while singing is restricted to the lowest two classes, VI and V. Formerly, students of the upper classes were required to translate from German into Latin and to write essays in Latin, but this is no longer necessary. Hebrew is now optional.

---

* *Gymnasium* is a Greek word meaning a training ground.

the higher schools was necessary in the interests of trade and industry and of the lower placed officials.

Continuation and Trade Schools.

Boys and girls who take up employment after finishing the 8-year course in an elementary school are required to attend Continuation schools till they attain the age of 18. These schools are held for about 8 hours a week either during the day, or more often, in the evening. No fees are levied. The subjects of instruction are vocational information, citizenship, German, arithmetic, hygiene and physical exercises with games. The course for girls includes household management, cookery, needlework and care of children.

Trade schools are full-time schools which receive boys and girls before they enter into active employment and give them specialised training in the particular trades which they wish to follow.

Higher Schools.

The German higher schools aim at giving their pupils a liberal education and preparing them for the university and institutions of scientific research. As has already been explained, they offer a nine-year course and admit pupils after they have put in 4 years at a public elementary school. A German student is, therefore, generally 19 years of age when he enters a university.

The lowest class in the higher school is *Sexta* or 6th and the highest *Oberprima* or Upper First, the intermediate classes being *Quinta* (Fifth), *Quarta* (Fourth), *Untertertia* (Lower Third), *Obertertia* (Upper Third), *Untersecunda* (Lower Second), *Obersecunda* (Upper Second) and *Unterprima* (Lower First). Classes VI, V and IV represent the upper primary stage, U III to U II the middle stage and O II to O I the high stage. The total hours of work per week are 26 to 27 in the upper primary stage and 28 to 30

Boys and girls are admitted into middle schools after they have attended the *Grundschule* for 4 years. The course in a middle school extends over 6 years. In his first year every student must take up a foreign language. Later on, that is, from the 3rd year onwards, he may, if he likes, study another foreign language. The total hours of instruction per week are 32 in the 1st and 2nd years, 34 in the 3rd and 4th years and 36 in the two highest classes.

Five different types of curriculum are provided by the Prussian Ministry of Education. The first type is a general curriculum for boys, which differs from the curriculum of the upper classes of the elementary schools in so far as it includes at least one modern language, a larger measure of science and mathematics and courses in book-keeping, handicraft, gardening, stenography, type-writing and shorthand. The second type is devised to meet the needs of boys entering commerce and industry; the third is a general curriculum for girls; the fourth is a curriculum for girls with special reference to their future vocations and the fifth is intended for those *Mittelschulen* which prepare pupils for the higher schools. Manual training for boys and household arts for girls are included in all the plans.

Before the Revolution of 1918, there were only two kinds of middle schools in Germany—middle schools for boys and middle schools for girls. But now there are five different kinds of middle schools corresponding to the five types of curriculum mentioned above. This reform was opposed, on the one hand, by the advocates of the elementary schools and, on the other, by the advocates of the higher schools. The former objected to it on the ground of the withdrawal of the better pupils from the elementary schools, while the latter were afraid of a complete identification of the middle schools with the lower and middle sections of the higher schools. But the *Mittelschulen* found a strong supporter in Dr. Boelitz (formerly Minister of Education in Prussia), who declared that a more practical course than that provided by

The German School System.

II

POST-PRIMARY AND SECONDARY EDUCATION.

BY

S. ALI AKBAR, M.A., (CANTAB),

Divisional Inspector of Schools, Hyderabad-Deccan.

Middle Schools.

UNLIKE the system of education in India, the system of education in Germany is not so designed as to enable a student to proceed ordinarily from the primary to the middle and from the middle to the high school. Therefore, pupils of elementary schools wishing to receive high school and, later on, University education generally join a *Gymnasium* or higher school with a course of 9 years, though it is possible for such pupils to proceed to a higher school after attending a middle school.

Like the Central schools in England, the vast majority of the *Mittelschulen* or middle schools in Germany are schools with a vocational bias. They give the necessary training to boys and girls intending to enter commercial, agricultural and technical schools or to secure intermediate positions in the state or local services. Adequate facilities for this kind of training cannot be provided in the elementary schools, which are compulsory schools for all children. Nor can the demands of the various vocations be met by the higher schools, the aims of which lie in a scientific or academic direction. Thus arises the need for schools which, while continuing to give the students the general education which they have received in the *Grundschule* or common elementary school, would primarily aim at preparing them for a practical career.

new created for each fresh generation. Men were not greater in the past than they now are. They only saw their opportunities and used them well. Everything that is wrong can be remedied, the people who have been idling can wake up and do good work and it is the rising generation that will make our Hyderabad the glory of its ruler, and of India and the Empire. That is the proper tone to take with boys.

Similarly, in their ordinary school work and school life, I would speak a word of praise, and withhold a word of blame wherever possible. Have you ever discovered what I discovered very soon after my arrival in India, that the people of this country are exceedingly sensitive—more sensitive perhaps than those of any other country? No horseman would ride a sensitive horse always on the curb, for he knows that by so doing he would spoil the horse, would make it spiritless or vicious. Perpetual blame, perpetual knocking-about is to a sensitive boy far worse than is the curb to a sensitive horse. Sensitive people can show their worth only under happy conditions. Under harsh treatment, adverse criticism, they take to vice, to drugs and other evil remedies for consolation, so appear depraved. Let us try an experiment. Let us make the children, boys and young men of our schools as happy as we possibly can and carefully abstain from every word and act that would deject them at the very outset of life's journey, before their character has hardened to resist adversity. If that experiment were made in every school in India for a generation, I believe the world would have to admit that its present diagnosis of the case of India was all wrong; that India was not so depraved, degenerate and so forth as had been supposed; India was only awfully unhappy.

---

fully docile boys who form the majority of students in the Government schools of Hyderabad, corporal punishment is sheer brutality.

If we face a class of boys with the thought of finding fault, of blame or punishment, we spoil the flavour of our teaching from the very outset; for it means we despair of the class, and our despair is certain to communicate itself to our students. Every teacher ought to be an optimist; for the teacher's hope in the boy is a positive factor in the boy's progress and in the teacher's influence. You have heard of Signor Mussolini, the dictator of Italy, and Ghazi Mustafa Kemal Pasha, the saviour and dictator of Turkey. These great men may be tyrannical, there may be much to be said against the methods employed by them; but one thing both have done which stamps them for all time as great educators. They have made war-weary nations, used to dwelling in remembrance of the past, look forward. They have given hope to the hopeless. They are preaching a new doctrine that the world is young, not old and worn out, as everyone in Italy and Turkey was thinking when those men emerged. They praise the people who are used to being blamed, they swear to them that they have the capacity to equal, nay, excel, the great works which the ancient Romans and the grand old Turks achieved. And it is coming true. Those peoples are reviving wonderfully.

India is very old. Our Hyderabad is a relic of old India. Both India and Hyderabad are used to being blamed for all sorts of antiquated inefficiency and shortcomings. Well, if you, the people of India and of Hyderabad, adopt that tone of hopelessness when speaking to young men, then our condition is indeed desperate. Both India and Hyderabad have a great past; you dwell on that in your teaching with complacency, at the same time observing how far we of the present day have degenerated. It is all false to what should be the point of view of youth in every nation. The world is

violence can now manage a class without it, then their condition too is much improved. In my short and limited experience confined to Hyderabad, I have come across hardly any boys who needed thrashing. Now and then a young boy requires a stroke or two of the cane to cure him of some naughty trick, but the fact of being sent up to the Principal is the greater part of the punishment and a kind word of reproach is quite sufficient to reduce the culprit. Sometimes, after talking seriously to the boy, I have taken a solemn promise from him of future good behaviour. And never, so far as I know, has one of the promises thus given to me been broken. Yet there are teachers who would think and say that the Principal had slighted and dishonoured them, because when they had sent up a student for punishment, he had chosen not to cane the boy.

I know something of the old system, for I was sent to a school where corporal punishment was much in vogue, and is still. But it was a school for the sons of folk of some importance—well-fed, cheeky boys inclined to arrogance, who, if they were not beaten into shape, would have been quite ready to treat their masters as a kind of servants. Now in England, corporal punishment is abolished in all government schools; it is preserved only in those exceedingly expensive, misnamed "public" schools frequented by the sons of people of importance. That is to say, it is given only to the rich. And I can tell you from my own experience as a boy that it was treated as a joke; that the master who was always sending up his boys to the Head Master for that kind of punishment, for which we cared nothing since it only lasted a minute, was considered a silly fool as compared with the master who gave us extra school or imposition; and that those masters—there were several—who could get really into touch with boys,—I mean, who studied their peculiarities and found the way into their hearts, were the only masters whom we really honoured, or who did us any good. In the case of the poor, miserably underfed, wonder-

Corporal Punishment

BY

MARMADUKE PICKTHALL,
Principal, Chaderghat High School.

WHAT I am opposed to is not the principle of corporal punishment but its reckless abuse. It should be there in reserve just like the death penalty in the criminal code, but it should be used very seldom. It should never be given in anger, never as revenge. It should never be inflicted in cases where it will stupefy or bewilder a boy. Too many teachers regard it as the most important part of education. They say that if they are not given the right of using personal violence, they will not be able either to teach or maintain order in the school. In my own school I try to enforce the wise rule of the Department that only the Head of the institution should apply corporal punishment, but for doing this I am regarded as a dangerous revolutionary, striking at the root of law and order, placing the weak and righteous teacher at the mercy of the powerful and wicked student. When I issued a notice to enforce the rule of the Department together with a list of punishments which the teachers were free to use, I was told that if the students got to know of it, the discipline of the whole school would suffer. It was a strange remark, for discipline based on wholesale and indiscriminate personal violence is not the discipline which H. E. H. the Nizam's Government wants established in our schools. The discipline of my school, as I understand the word discipline, has not suffered at all. If the boys are less downcast than before, then that is a gain to them educationally. If the masters who formerly used

* A lecture delivered at the Second Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

of an official. His real recompense is the gratitude of the people for whom he has done so much. Let us therefore make him feel that on leaving us he is carrying with him the sincere and heartfelt gratitude of all classes in this State. But gratitude is after all a mere sentiment. The most practical way in which we could show the Nawab how grateful we felt would be for us to cherish, improve and increase the institutions he has founded both in numbers and efficiency instead of letting them dwindle or deteriorate after he is gone, so that if he should happen to visit us again— as I hope he will—we may be able to say: "Behold the sapling that you planted is now grown into a tall and gigantic tree!"

Conclusion.

In conclusion, I shall only be voicing the feelings of all present when I say how honoured we feel at the presence of His Excellency the Maharajah Sir Kishen Pershad Bahadur, whose interest in education is well-known. The report of the Secretary is very satisfactory, and of good augury for the future of the Association, which has great potentialities for usefulness. I wish it, and every individual member of it, every success.

Finally, our gratitude is due to His Exalted Highness the Nizam for the interest graciously evinced by him in all matters pertaining to education, for his patronage of learning and his promptitude in sanctioning all schemes for the advancement of his people.

took first class honours from Dacca, is engaged in original research in England. You will therefore agree with me that the Osmania University is an institution which we may well be proud of. I would ask you to take it up enthusiastically, to vindicate its honour and to guard jealously its reputation. In this way you would be doing far greater service to your country than by belittling the labours of those who have founded it. It is for you to foster and develop this institution until it becomes the foremost of its kind in India.

You will be interested to know that other places are beginning to emulate the example of Hyderabad, and to teach through the vernacular, for instance, Karve's Women's University at Poona and the Hindu University at Benares.

Education is a thing in which improvement is always possible, but while insisting on improvement, we must know at the same time what has been actually achieved and we must learn to be grateful to those who have helped us to achieve great results.

Tribute to Nawab Masood Jung.

Now that Nawab Masood Jung Bahadur is on the point of departure, it gives me great pleasure to make public allusion to his splendid services and to the great strides made by the Education Department in the short decade during which he has guided its destinies. At the beginning of his directorship there were only two colleges with about 300 pupils, while now there are 7 colleges with about 1200 pupils. There were 22 High schools before, but now we have got 43 High schools, while the number of the pupils has doubled. The number of Middle Schools was 87 but now it is 108. The number of Primary Schools has increased from 1123 to 3679. This tripling of the number of schools and scholars is a wonderful achievement which we owe to your Director's unremitting labours on your behalf. Now what is to be his requital for all this splendid work and achievement? Pay and pension are only the material reward (often inadequate)

"unemployed" who will ultimately subvert the existing order". While admitting the existence of the economic problem of unemployment, I deny that education is responsible for it. These young men would have existed all the same even if the University had not existed, and the problem of their employment would have been all the more difficult due to their ignorance. So far, therefore, from creating the problem of unemployment (which is due to economic causes beyond our control) we have made its solution appreciably easier.

Achievements of the Osmania University.

Finally, some say that there is no originality in this University; that, in short, we have produced no original thinkers or discoverers. Let us ponder a little over this allegation. If the idea is that a University is a place simply full of Darwins and Newtons, such an idea is absurd. Even the oldest Universities with the highest reputation, so far from being full of original thinkers and discoverers, hardly produce half a dozen such in a century. I doubt if all the first class honours men turned out in a year add between them a single iota to the sum total of human knowledge. Indeed the men who add anything new to human knowledge are very rare. There is only one Einstien in the whole of Europe, and only one Bose in India. But young as it is, you will be surprised to hear that the Osmania University has already produced at least one man who *has* added something to human knowledge. It will be a revelation to you if I quote the following from official reports: Speaking of Syed Hussain, a research scholar in England, Mr. Seaton writes, "He has been urged *to patent* some of his discoveries". This shows that at least one of your students has made original discoveries. It is a result which under the old system has not been accomplished in 40 years. Let it suffice to refute the adherents of the old system. In the field of Philosophy, Salahuddin, a graduate of this University, who

These remarks show that one of the first results achieved was that our boys understood the subjects much better than those who had learnt them through the medium of a foreign language.

"Mass Production in Education."

There is another class of people who say that we are producing graduates in too great numbers on the principle of the Ford car. But I ask, is it not satisfactory to reflect that we have attained to "mass production" in respect of such a precious commodity as education? Taking the analogy of the Ford car, I ask: Is America the worse for producing cheap means of transport? No doubt increase in supply lowers the price, but the material supplied in the shape of the Ford is not bad value for the money. Gradually, standards will rise and the next generation will get even better value than the present. As it is, the examiners themselves have admitted that our product is superior in originality and intelligence to that of their own Universities.

Industrial Education.

Some others say, "What is all this literary education for"? They demand not degrees but commercial and industrial training. No doubt, industrial education is the crying need of the day, but we cannot graft industrial education on ignorant minds. Even industrialists must have some fundaments of education. A little preliminary education is necessary even for the understanding of machinery. In order to impart industrial education it is necessary to educate the mind. Practical industry depends upon the knowledge of elementary science, and in turning out our graduates we are only producing raw material which can be shaped into the future industrialist.

The Problem of Unemployment.

Again there are others who say: "By producing graduates in such large numbers you are only creating discontent and sedition and thus bringing up a class of the

natural way in which we can acquire knowledge is through the medium of our own tongue. Hence it is the other system, namely the use of a foreign medium, that is an experiment and not our University. The opposite method has lasted a hundred years and has proved a colossal failure. It has succeeded in producing few men of high calibre or originality. The fact is that the average Indian student is handicapped by having to learn his subjects through a difficult foreign tongue. He has to spend most of his time and energy in trying to master the difficulties of the English language instead of getting down to his subject. The idea of going back to a more natural state of things first occurred to Nawab Sir Hydar Nawaz Jung Bahadur. It was a brilliant idea, and with the courage of his convictions, he proceeded to carry it to its logical conclusion; and to-day we see the results of it. Sir Tej Bahadur Sapru in his Convocation Address at Lucknow said, "It is a serious handicap for our students to be instructed in a foreign language. The credit for courage and imagination should be given to the founders of the Osmania University who decided from the very beginning to adopt Urdu as the medium of instruction". What is the outcome of this bold step? No sooner was education imparted in the pupil's own language than the natural result started to realise itself, and we found after a year that the examiners from all parts of India who examined our students said that they had proved themselves to be far superior to students of other Universities. The remarks of some of these examiners are worth quoting: A gentleman from Aligarh says, "Your boys were refreshingly original and showed considerable power of original thought". A London B. Sc. says, "The descriptive power of Osmania students is certainly better than that of others." Mr. Ali Akbar says, "The results are splendid....The students had studied the subject intelligently, and had grasped the essential facts".

and take are the natural adjuncts of the true sportsman. In a word, it is sport that makes us manly and causes us to disdain all that is low, cowardly or vile. Indeed our salvation as a people lies in making ourselves physically fit, and our very existence depends on it. If I were you, I would never cease to press upon the authorities the necessity of developing this side of education as far as the resources of the State permit.

University Education.

At the end of his High School course a boy should be fit to enter the University. Let us see what a University student should be like. That he should be a sportsman and a gentleman goes without saying. He should also possess general education to a degree sufficient to carry him up the highest rungs of the University ladder. What the Osmania University now suffers from is that some of the pupils enter it at a stage of education in which they are unable to make the most of the instruction imparted to them. The result is that they act as a drag on other and better students, and tend to lower the standard of teaching, specially in English. In short, the whole system of secondary education requires to be overhauled and re-organized so as to fit in at the top and harmonise with the Osmania courses. The invidious distinction between third class students joining the Osmania University and the second and first class pupils going to the Nizam College should be abolished. There should be but one system and one examination intended to lead first and foremost to our own University and incidentally to other Universities.

Medium of Instruction.

As I have already said, certain critics attribute all evils to education as a ready explanation, and they particularly condemn that education which is given in the vernacular. They are unable to forgive the Osmania University for being an Urdu institution. But it is obvious that the only

should be able not only to teach the pupils to use their powers of observation but also to use their hands, so as to develop both their mental and bodily powers. Further, it is necessary that teachers should be selected from among men of the best character and principles. The character of a pupil is often the reflex of that of his teacher. It is a true adage which says that an ounce of example is better than a ton of precept.

Physical Education.

As brain and body go together, and it is impossible to acquire an effective brain without a healthy and efficient body, I would insist on the greater development of the physique. I would make it a point to provide play-grounds for every school and to insist upon every pupil, not lame or sick, taking part in some manly game or other. Games and exercises should be encouraged in all schools for boys and girls by every means possible. For example, take the game of hockey: The Indian team has achieved a brilliant success in Europe. This in itself should form an inspiring example for us, and there is no reason why the youngest player should not entertain the ambition of one day becoming an "international". Then there is our favourite game of cricket. There is a lot of local talent coming up which only requires proper coaching to develop. The State should consider the employment of a "professional" to coach up our boys. Finally, there is football which recently in Hyderabad seems to have fallen into the hands of professionals of an undesirable class. As a means of killing professionalism, schools and colleges should make it a point of playing this game only among themselves and not admitting professional or club teams to their tournaments. Then, there are the athletic sports that teach a boy to be swift, strong and supple. I hold that nothing conduces more to the building of character than manly games and exercises. The idea of helping the weak, the sense of fair play, the spirit of give

Government employment, is at the same time no bar to manual labour. As a step towards securing this object we must consider seriously the question of the bifurcation of elementary schools into rural and urban schools, and we should so order the curriculum of rural schools as to help agriculture and make people go back to the land, so that this great staple industry of the country may be improved and developed. These rural schools should be so organized that the pupils may be taught to use implements of agriculture and to study the crops, the soil and the seasons, so that they may be ready to go back to agriculture as soon as they leave school. Then the question arises: What is to become of the other schools situated in urban areas? The time is past when education was looked upon as merely items of information instilled into the receptive mind just as air is pumped into a pneumatic tyre. This idea is now exploded. Education to be useful should mean a development of all the mental and bodily faculties so that a man may become fit both mentally and physically to follow any walk of life. There should therefore be some reform in the curriculum of urban schools in conformity with this principle. The great vehicles through which we absorb knowledge are the five senses, and in the young these should be trained and developed. We should teach the children observation, and also how to use their hands; for this, nature study, kindergarten games and occupations together with a little natural science are necessary, as science is a great aid to correct observation and the drawing of correct conclusions from experiments. At the same time, in the high sections some form of manual training is necessary. An education so organized would form the best equipment for after-life.

Training of Teachers.

But for this it is essential to have proper teachers, and it is for the Teachers' Association to help in producing them. We should have some means of training teachers, who

Presidential Address

BY

NAWAB MAHDI YAR JUNG BAHADUR, M. A. (OXON :).

Your Excellency, Ladies and Gentlemen,

You are probably all of you familiar with a common institution in Hyderabad which has grown into a veritable nuisance: I refer to the letter of recommendation with which every one is pestered. These letters are brought by people seeking petty jobs, but they generally lead to nothing, except to waste everybody's time all round. It is obvious that the present craze for these letters is due to the hope that Government employment can be gained through their instrumentality specially by persons who do not otherwise possess proper qualifications for such employment.

Need for Bifurcation of Elementary Education.

Now, there are some people who are sufficiently cynical to attribute all our evils to education, and they would at once put down the nuisance I am complaining of to that cause. But on a little reflection you will see how wrong this insinuation is. For if education brings enlightenment, it should correct and not create such evils. It is really the absence of education or the imparting of it on mistaken lines that is responsible for some of our difficulties.

Thus the idea which creates a demand for these letters, that is to say, the idea that the educated person should wield no instrument but the pen, is a survival of the time when artisans and agriculturists were supposed to be necessarily ignorant, and educated people followed only the learned professions. But all that is now changed, and the time has arrived when we should educate the mind of people in such a way that they may see that education, while it may lead to

Assistant, Chaderghat High School, were deputed to represent this Association in the Calcutta Session of the said Conference in December 1927. Half of the expenses incurred for the latter conference were very kindly defrayed by Government.

(2) The President of this Association, Mr. Syed Ali Akbar, and Mr. Syed Mohamed Husain Jafri, B. A., (Oxon:), Deputy Director of Public Instruction, had the honour of attending the Imperial Educational Conference as representatives of Government last year. The Managing Committee of the Association had decided to give an "At Home" in their honour after their return and a sum of Rs. 600/- was collected for this purpose. But as these two officers did not like the idea of the money being spent on refreshments, the Association decided to establish a library with the amount collected. It is hoped that the committee to which this work has been entrusted will soon complete it. The Association, however, held a meeting to welcome Messrs. Mohamed Husain and Ali Akbar, and on that occasion each of them gave his impressions of his tour. We shall hear more from them at this Conference.

(3) At the desire of the All-India Federation of Teachers' Association, it was decided to affiliate this asssociation to the said Federation and the Government has been approached for permission in this connection.

(4) I regret to say that since the last Conference was held, we have lost a young and promising member of the Association, Mr. Syed Wilayat Ali, B. A., Head Master, Government Middle School, Shah Ali Bunda and Editor of the Urdu section of the "Hyderabad Teacher", who died recently after a brief illness.

Besides the above meetings, a public meeting was held at the Nizam College at which Professor Seshadri of the Benares University, President of the All-India Federation of Teachers' Association, delivered a lecture on "The Teaching of English Literature in the Secondary Schools in India". A report of this lecture has already been published in 'The Hyderabad Teacher'.

Co-operative Society.

The Central Executive Committee appointed a sub-committee to consider the possibility of starting a central co-operative society under the auspices of the Association. The suggestions of the said committee have been published in the magazine and will be given effect to after the approval of the Central Executive Committee.

"The Hyderabad Teacher".

The quarterly magazine of this Association called the "Hyderabad Teacher" has been appearing regularly since June 1926. The editorial staff is trying its level best to maintain a high standard both as regards subject-matter and general get-up. Though the number of subscribers is gradually increasing, it is not yet so large as to make the magazine independent of financial support from the Association. It is to be hoped that in the near future the "Hyderabad Teacher" will become self-supporting, so that the grant of Rs. 300/- a year, paid towards its publication from the funds of the Association, may not be required.

Miscellaneous.

(1) Mr. Syed Ali Akbar, M. A (Cantab :), President of the Association, was deputed by Government to attend 'The All-India Teachers' Conference, held under the auspices of the All-India Federation of Teachers' Associations, at Patna during Christmas 1926, while Mr. Ahmed Husain Khan, B.A., Principal, Darul Uloom High School and the Vice-President of the Association and Mr. Hari Har Aiyar, B. A., First

*

Extracts from the Report of The Hyderabad Teachers' Association

for $\frac{\text{1335 to 1337 Fasli.}}{\text{1926 to 1928 A. D.}}$

BY

S. M. S MUSHADI, *General Secretary.*

Branches of the Association.

There were 14 centres of the Association during the period under report. The loss in the number of members due to the abolition of the Training College centre has to some extent been counter-balanced by the acceptance of membership on the part of the professors and lecturers of the Nizam College, the City College and the Osmania Training College, teachers in the districts and other persons, according to Section IV-B of the rules of the Association.

Ordinary Meetings.

Eleven ordinary monthly meetings were held during this period, and at these meetings the following subjects were discussed :—

1. School Hygiene.
2. The Teaching of Drawing.
3. Co-operation between Teachers and Parents.
4. Educational Excursions.
5. The Art of questioning.
6. Valuation of Answer Papers.
7. School Libraries.
8. Use of the Black-board.
9. The Kindergarten.
10. Manual Training.
11. The Teaching of the Vernaculars.

educational journal and to hold an annual conference, both of which ought to help in the realisation of the aims of the Association. I feel confident that the Association will achieve still greater success and that the scope of its activities will be still further enlarged. The efforts which Mr. Syed Ali Akbar and his colleagues have made in organising this Conference and the active interest of Nawab Masood Jung Bahadur deserve much praise.

I have taken part in this function for two reasons: in the first place, because I have always had great interest in the activities of teachers; and secondly, because I wanted to have the pleasure of attending a meeting in which Nawab Masood Jung Bahadur, who will be leaving us shortly, is keenly interested. The inestimable services rendered by Nawab Masood Jung Bahadur have already been recognised by Government. Apart from those responsibilities which he successfully took upon his shoulders in the discharge of his duties and apart from his keen sense of duty, his charming personality, pleasing manners and his intellectual attainments have never failed to produce a deep impression on all those who have come into contact with him. He has a gift of endearing himself to others. The best way in which you can commemorate your loyalty to him and his concern for your welfare is by endeavouring to realise the hopes which made him take interest in the formation of your Association.

You have now to proceed tc your real business. I request the President Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, who is not only a scholar but who has also inherited the excellent character of his forefathers, to begin the work of the Conference. I hope that under his guidance you will prepare, in the course of this Conference, a practical and satisfactory programme for your future work, which will be watched with interest by the public. I heartily wish you ever success.

In conclusion, I heartily welcome, on behalf of the Teachers' Association, Nawab Sir Hyder Nawaz Jung Bahadur, Nawab Zulkadar Jung Bahadur and other distinguished guests who have taken the trouble of coming to attend this Conference. I need hardly say that their presence here to-day is a source of great encouragement to us.

His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur's Opening Speech.

Translation from Urdu.

It has given me great pleasure to accept Nawab Masood Jung Bahadur's invitation to open the Exhibition and the Conference to-day. The aims and objects with which the Hyderabad Teachers' Association has been founded are lofty and noble and the efforts which the Association has made within the short period of its existence to attain these aims and objects deserve great credit.

Well-conducted schools are centres of knowledge and culture and an effective means of fulfilling the mental, physical, moral and economic needs of the country. The good example set by the teacher is not only beneficial to the pupils but also to the country at large. It requires great responsibility, self-sacrifice, honesty of purpose and technical knowledge to organise and conduct successfully an association like the Teachers' Association which aims at systematising, and improving the quality of, the work of teachers. I am sure that you are all fully conscious of the direct and close bearing of the programme of such an organisation on the moral, economic, political and physical progress of the country. Among other activities, the organisers of the Association have found time to conduct an

men hesitated to accept service in the Department, to-day even young men who can find employment in other Departments, are not only willing, but are anxious, to serve in this Department. The members of the Hyderabad Teachers' Association will never forget the sympathy, kindness, impartiality and courtesy which Nawab Mascod Jung Bahadur always showed in his dealings with his subordinates.

The members of the Hyderabad Teachers' Association are very proud and happy that His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur has graced this occasion with his presence. His Excellency has always taken a deep interest in education. I vividly remember that nine years ago, while speaking at the Annual Dinner of the Nizam College Old Boys' Association, His Excellency said: "The time has come for making primary education compulsory in this state". Ever since he became President of the Executive Council, he has shown an interest in education for which there is no parallel in the history of these Dominions. He has not only paid attention to the question of compulsory education, but to all other proposals emanating from the Education Department. He has also tried to obtain first-hand knowledge of the conditions of education in the state by personally inspecting schools in the course of his tours. The great interest that our ruler, his Exalted Highness the Nizam, takes in the spread of education is well-known everywhere. And when he has as his Prime-Minister a person who has real sympathy with the state and the people and who takes a special interest in educational affairs, no one can doubt for a moment that education in this State has a glorious future.

It is the good fortune of this Association that while the President of its first Conference was a man of the reputation and eminence of Nawab Sir Hyder Nawaz Jung Bahadur, its Second Conference has now as its President Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur who is genuinely interested in, and has a wide knowledge of, educational matters.

ation has already moved in this matter, and it is to be hoped that a central organisation will come into being before long.

Till the beginning of this year, the members of this Association consisted of only teachers of those schools which are under the jurisdiction of the Divisional Inspector of Schools, Hyderabad Division. It is very gratifying to note that since then the Principals and teachers of other institutions like the Nizam College and the City College have become members of this Association.

A journal which goes by the name of the "Hyderabad Teacher" has been started to realise and spread the aims and objects of this Association. We have been conducting this journal quite satisfactorily for the last 2 years.

Whatever success this Association has achieved is due, to a great extent, to the interest which its patron Nawab Masood Jung Bahadur has evinced in it. The able and eloquent lecture on Japan, which he delivered on the occasion of the last Conference, and owing to which that Conference achieved a remarkable success, will be ever remembered not only in the history of the Hyderabad Teachers' Association, but also in the history of the intellectual activities of these Dominions. In the organisation of this year's Conference also, Nawab Masood Jung Bahadur has, in spite of his being extremely busy just now, given us very great help. But the thought that this will be the last Conference at which he will be present causes us very great grief. He held the office of the Director of Public Instruction for 12 years. All of you are acquainted with the phenomenal progress that education has made during this period in His Exalted Highness the Nizam's Dominions. Nawab Masood Jung Bahadur has always had the welfare of his subordinates at heart. He increased the prestige of the teaching profession to such an extent that, whereas a few years ago qualified young

you what this Association has done since its inception, and the Secretary will give further details in his report. Perhaps it will not be out of place if I now say a few words regarding the aims and objects of this Association.

There are 4 essential factors in the teaching profession. First of all, the teacher's knowledge should be wide. Secondly, he should be well-acquainted with the science of teaching. Thirdly, he should have a genuine interest in his work. Fourthly, he should know how to work in co-operation with others. The Hyderabad Teachers' Association provides opportunities to the teachers at the Head-quarters for exchanging ideas on educational matters. At the meetings of this Association, the untrained teachers learn new methods of teaching and of maintaining discipline and forming the character of the pupils, while the trained teachers get an opportunity of keeping their knowledge fresh. Mutual exchange of ideas and experiences also adds to the interest of the members in their daily work. But, to my mind, the greatest benefit which this Association has conferred on them is that it has brought together teachers of different schools at the Head-Quarters and created in them a spirit of co-operation. In this way, the Hyderabad Teachers' Association has become a powerful instrument for increasing the power, status and influence of the teachers.

For the last two years the representatives of this Association have been attending the Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations and our Association will be affiliated to the said Federation as soon as the required sanction is received from Government. This association is not the only association of its kind in H. E. H. the Nizam's Dominions. There are Teachers' Associations in the districts also. Like the Provincial Teachers' Associations in British India, we need a Central Association in our state of which the existing associations would become branches. The Hyderabad Teachers' Associ-

occupied the post of Director of Education, and so knows personally our problems.

I could not conclude without mentioning Nawab Masood Jung, whose approaching departure means a great loss to the Association and to education generally. Others better qualified can speak of his great service to the cause of State Education. But speaking as a representative of the Aided schools, I should like to publicly state how much we owe to him for his great help at all times. His never-failing sympathy and advice was always available for those who went to him, and I feel we are losing not only an educational statesman but a friend as well.

I should also like to mention our esteemed Inspector Mr. Ali Akbar whose indefatigable energy is mainly responsible for bringing this Association into being, and for arranging these Annual Conferences, which are doing so much to bring the teaching profession of Hyderabad together. We are most fortunate in having such an untiring personality for our Inspector.

On behalf of the Conference, I cordially welcome all our visitors and teachers to the meetings of this, our second Annual Conference, which, we hope, will have a very practical outcome in furthering the cause of education in Hyderabad.

Address of Welcome

BY

S. ALI AKBAR, M. A., (CANTAB:),

President of the Association.

(Translation from Urdu).

Your Excellency, Mr. President & Gentlemen,

It is four years since this Association was started and I am now standing before you to welcome you to its Second Conference. My friend Mr. Philip has already told

ourselves into trouble with the doctors—perhaps with our students also. We hope that the medical profession will co-operate in this urgent matter. The same urgency applies to the provision of playgrounds for schools. When the body has been made fit, it is well to keep it so by exercise, and this cannot be done without proper playgrounds.

Another aim of the Association is to improve the status of the teacher generally. We are a long-suffering profession, and seldom lift up our voice—except in the class-room, and of course we should not do it there. Too long, however, has the teachers' been the Cinderella amongst the professions in public estimation. Nawab Sir Hyder Nawaz Jung made a fine appeal in his address at our last Annual Conference for a re-adjustment in the public estimate of the teaching profession, which I heartily endorse. Rightly understood, it will be difficult to find any profession so full of potentialities and possibilities for good, and more entitled to public esteem; that is, of course, if we consider a profession as a "life investment" to some practical purpose. Ultimately, say what you will, the teachers of a nation are its makers for better or worse, and the day will surely come when they will be rated on the same plane as, for instance, those who shape the foreign policy of a nation. Japan and Germany have recently shown to an astonished world how a nation can be changed in a decade or two by its educational system. So let us glory in our profession; rightly understood, it is the grandest on earth, and not to be exchanged for any other.

We are honoured in having with us to-day His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad, so well known as a patron of all the Arts and Crafts, and of education generally. His presence is an impetus to us all, for we feel assured of a sympathetic ear for our discussions and problems. Nawab Mehdi Yar Jung, our President for this occasion, is also well known to us for his interest in educational circles; we remember that for a time he

examiner unless he has experience and qualifications for that office, and a suggestion made at the last conference about establishing a co-operative society in connection with the Association is on the eve of accomplishment. Some resolutions have not borne fruit, at least not yet. The question of the medical inspection of schools, concerning which a resolution was passed at the last Annual Conference, is one we are all anxious about. The Premier State of Hyderabad, which is now moving fast in educational matters under the liberal policy of the authorities, might well set a lead in this matter, which is, in fact, sadly neglected in India generally. Indeed, the Director of Education in Bengal has recently stated that he would like to stop all higher education for some years and concentrate on physical education in its place. We may not quite agree with this sweeping statement, but we must all respect the motive behind it. Even England, a well organised country from a medical point of view, exhibits astounding figures when the question of physical fitness is investigated; the hand-book on health education states that "upwards of 20% of the children in attendance at school are suffering from acute disease needing treatment, and the practice of hygiene is necessary as a defence measure, a means of cure and prevention." England has suffered economically and otherwise from unfitness, and the Board of Education is setting out upon a crusade of hygienic education. It would be well if we could do the same, for from all we hear, India needs it even more so. Many diseases and deformities can be checked if taken in time, and a regular medical inspection of school children would make for the early detection of such troubles. It is better to have a sign post or fence at the top of a precipice than a hospital at the bottom. Such preventive measures are really far less expensive in the long run. Medical inspections, however, cannot be carried out without the aid of the medical profession. If we tried to do it ourselves, we might get

on a thousand. Membership is of course compulsory in the Divisional schools, but we are glad to also have as members teachers from other institutions such as the Nizam's and the City Colleges. The Association is recognised by the All-India Teachers' Association and though we are not yet actually affiliated, I understand Government has passed orders sanctioning the affiliation, so that the affiliation may be expected to take place in the near future, and this should prove an added stength to us.

Our outstanding activities are:—(1) the arranging of regular group discussions on subjects pertinent to teaching; (2) public lectures on educational topics; and (3) the publishing of a Teachers' Magazine, the "Hyderabad Teacher," which is the official organ of the Association, and which is, we think, filling a need in the teaching world of Hyderabad, and is finding a place even beyond our State, for it has now been approved for use by the Educational Departments of the United Provinces, the Punjab, Central Provinces and Berar, Mysore, Baroda and Bihar and Orissa. The Magazine is not yet self-supporting, and we are hoping that more subscribers will be forthcoming in order that it may become so.

Apart from the practical value of these activities to teachers in the exercise of their profession, the various meetings and conferences should tend to develop an "esprit de corps" amongst members of the teachers' profession, and at the same time help to make articulate those silent longings and aspirations that find a place in most teachers' hearts. Our meetings and resolutions are all framed to that end, for we do hope that this and similar conferences will have a very practical issue, and that the resolutions put forward will ultimately become facts in the educational world of Hyderabad. Some of the resolutions passed at the last Annual Conference have already taken effect. Nobody for instance can now be appointed an

through a study of these languages, and hence greater attention should be paid to them. The Government would not generally take any action until the force of public opinion was brought to bear on them. Therefore a concerted programme should be drawn up and then pressure should be exerted on the Government to sanction all the proposals made. Finally, he exhorted the teachers to regard their work as a national duty and to do it with zeal and enthusiasm.

Proposing a vote of thanks to the President, Mr. M. Pickthall paid an eloquent tribute to the many good qualities possessed by him. The Conference came to a close with a short speech in Urdu by Mr. Syed Ali Akbar, in which he seconded Mr. Pickthall.

Address of Welcome.

BY

REV. F. C. PHILIP, M. A.,

Warden, St. George's Grammar School.

Your Excellency, Mr. President, Ladies and Gentlemen,

In welcoming our esteemed guests and teachers to the Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association, a few remarks on the Association itself will be in keeping with the occasion. It was founded in 1334 Fasli, and the First Conference was held two years ago. On account of the plague epidemic, no conference was held last year, so that this is the second Conference since the Association started. Hereafter it is hoped that the Conference will be an annual affair.

The Hyderabad Teachers' Association comprises fourteen branch associations with a total membership of close

Conference had ended successfully and he congratulated all those persons to whose untiring efforts the Conference owed its success, especially the Rev. Philip, Mr. Khairat Ali and Mr. S. M. Sharif Mushadi. After referring to His Excellency the Maharaja Bahadur's deep interest in all matters relating to education, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur remarked that many of the lectures delivered at the Conference were very suggestive. Mr. Syed Ali Akbar, in his interesting speech, had shown what living nations were doing in the world to-day and how they had solved the problem of combining intellectual and physical education, while Mr. Mohammad Husain's illuminating paper had revealed what patriotism was, and how a nation could be built up by sacrifice on the part of its leaders. Both these speeches, he added, were extremely instructive. Continuing, he said, that from Mr. Pickthall's able and eloquent lecture they had learnt that in moral training the best results could be obtained by love, sympathy and tact rather than by corporal punishment, which should be the last resort. The President then remarked that since he officiated as Director of Public Instruction ten years ago, education had advanced by leaps and bounds. The number of teachers and pupils had increased enormously, the efficiency of schools had improved and the public now took more interest in education. All this progress was the result of the efforts of the retiring Director of Public Instruction and the officers working under him. But still much remained to be done. Physical education had received very scant attention. Very few schools were provided with playgrounds. The study of science was neglected, and in view of the importance of science in present-day life, it was necessary to make it a compulsory subject in the school curriculum. Another glaring defect was that sufficient importance was not attached to classical languages like Sanskrit and Arabic. He said that our national heritage could only be conserved

the level of civilised nations, it was absolutely necessary that science should be made a compulsory subject in schools. Good teachers of science could not be secured without co-operation between the University and the Education Department. He suggested that a special inspector should be appointed to supervise the teaching of science in schools. Much emphasis should be laid on the Heuristic Method, which aimed at enabling boys to discover things for themselves. A pupil should be made to spend the greater part of his time in the laboratory, instead of in the lecture room, as was too often the case in Indian schools.

The Conference then proceeded to discuss a resolution urging the need for including elementary science as a compulsory subject in the High School curriculum. The mover, Mr. Subba Rao, B. A., Assistant, Chaderghat High School, said that the present distinction in the Osmania Matriculation and H. S. L. C. courses between examination and non-examination subjects was absurd and should be abolished. The non-examination subjects only served to adorn the timetable and received little attention. It was deplorable that matriculates should know nothing about their body and that they should betray an ignorance of the most fundamental principles of science. Mr. Abdur Noor, B. A., B. T., Head Master, Gosha Mahal Middle School, seconded the resolution in Urdu. Mr. Baqur Mohiuddin B.A., Lecturer in Commerce, also took part in the discussion. He lamented that elementary science, once a compulsory subject, was now given a step-motherly treatment and was left to the mercy of teachers and headmasters. The resolution when put to the vote was carried unanimously.

The resolutions passed at the 1st Conference were then reaffirmed. The next item on the programme was the distribution of Exhibition prizes. The President gave away the prizes to the prize-winners.

The president, Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, then rose to deliver his concluding speech. He said that the

Mr. Syed Mohamed Hadi, B. A. (Cantab:), Director of Boy Scouts, then read a paper in Urdu on Scouting. He gave a brief account of the progress of the scout movement in H. E. H. the Nizam's Dominions and said that during the last ten years the number of troops had increased from 12 to 35 and that there were now more than a thousand scouts. Scouting was very valuable in the formation of the character of boys, as it taught them in a practical way self-respect, truthfulness, sympathy, loyalty and obedience. It brought the teachers into intimate contact with their pupils and aimed at a discipline which was based on love rather than fear. Gardening, swimming, path-finding, map-reading and map-making were encouraged by means of the system of "Proficiency Badges". The scout movement, in his opinion, would greatly help to bring about unity in India. Scouting recognised no differences of caste and creed. Mr. Hadi declared that in the course of his inspections of scout camps nothing had given him greater pleasure than to see Hindu and Mussalman boys dining together and taking part in work and play without feeling for a moment that they belonged to different religions. Continuing, Mr. Hadi stated that physical education formed an essential part of the scouting programme. A fixed period was allotted for drill and games and a scout was expected to do as much camping as possible. Camp-life gave him fresh vigour, made him healthy and hardy and infused in him the spirit of self-reliance. It also gave the scout master an excellent opportunity of mixing with the scouts and studying their real character. Mr. Hadi concluded his speech by appealing to the teachers to help him in extending the scout movement.

Dr. M. Qureishi, Ph. D., Professor of Chemistry, Osmania College, spoke on the "Teaching of science as a subject of study in schools". He first dwelt on the importance of the study of science and said that no system of education would be complete without adequate provision for the teaching of science. He added that if we desired to rise to

5. The teacher should be very careful in the use of his language, as language is the index of his character.

6. Teachers should not hesitate to acknowledge their ignorance and shortcomings.

7. They should teach pupils the nobility of manual labour and of serving other men.

The afternoon session began with the moving of the following resolution by Mr. K. P. Shastry, B. A., B. T., Head Master, Mufidual Anam High School.

"That in the opinion of this Conference the introduction of the system of a Provident Fund for the benefit of employees of aided schools is a measure calculated to ensure stability of service in such schools, and that in view thereof, this Conference requests Government to take early steps in the matter by appointing a thoroughly representative committee for formulating a scheme and submitting it for sanction".

In proposing this resolution, Mr. Shastry said that it aimed at improving the lot of teachers serving in private schools. He said that the conditions in private schools were most unsatisfactory and that the teachers in such schools were under-paid. He therefore pleaded that the Government should take the initiative in the matter and come to the rescue of the private school teacher. Mr. Hanamanth Rao, B. A., L. T., Principal, Mahboob College, Secunderabad, seconded the resolution. He remarked that the teachers in private schools experienced great hardships in the matter of pay and leave and that they were dependent chiefly on the charitable disposition of the management. They were denied many of the privileges enjoyed by the teachers in Government schools. He held that the institution of a Provident Fund in Aided Schools would improve the situation very much. The Rev. F. C. Philip supported the resolution and said that as the aided schools gave no guarantee to teachers, a Provident Fund was necessary for ensuring stability of service for them. The resolution was carried unanimously.

of a man depends no less on environment than on heredity. Children inherit many traits of character from their parents. Weak parents beget weak children, but environment also plays a great part in improving their physique and moulding their character. Within the limits set by heredity, environment gives much scope for improvement and progress. This is the principle upon which all Reformatory schools are established. Heredity is beyond our control, but we can by providing the proper kind of environment produce good results". After explaining the various theories about the intellectual ability of man, *i. e.*, the unifocal, the multifocal and the nonfocal theories, Mr. Osman proceeded to show how the intelligence of pupils was measured by Tests. In conclusion, he remarked that it was the duty of a teacher to judge the capacities of the pupil and then make him take up some work for which his natural abilities fitted him and in which he could realise his powers to the best. The first day's session ended with this lecture.

The first sitting on the 2nd day was devoted to lectures on various subjects. All the lectures were in Urdu and we have published some of them in full in our Urdu section, and will publish the others in our next issue. The proceedings opened with a lecture by Mr. Hisamuddin, Assistant, Darul-Uloom High School, on "The Duties of Teachers". In the course of his remarks, he laid much stress on the following points:—

1. Teachers while obeying their superiors should, at the same time, maintain their self-respect.

2. Need for friendly intercourse between teachers and pupils.

3. The teacher should by his life set a good example to the pupils.

4. Need for greater co-operation between parents and teachers.

that where punctuality was enforced, the pupils often came with an empty stomach. Hence he proposed that in the summer months school work should begin at 7-30 A. M. Mr. Hisamuddin, Assistant, Darul-Uloom High School, seconded the resolution. There was then a heated discussion which was confined to the first part of the resolution. Messrs. Abu Zafar Abdul Wahed, M. A., Lecturer, City College, and Mr. Baqar Mohiuddin, B. A., Lecturer in Commerce, spoke against the resolution. The latter argued that hundreds of poor students did not get their meals before 9 A. M., and if forced to do so, they would come with only a remnant of the previous night's food, which would affect their health and studies. The resolution, he held, was good only for the children of the aristocracy and it would hit the poor students hard. Mr. Raghavan, B. A., B. T., Lecturer, Nizam College, speaking in favour of the resolution, pointed out that the change proposed by Mr. Ahmed Husain Khan was very necessary in the interests of Hindu students and that it would enable all boys to go home and return in time for games. Mr. Kader Mohiuddin of the Chaderghat High School also supported the resolution, which on being put to the vote, was carried by an overwhelming majority.

Mr. Abdus Salam, Nazir of Schools, Gulburga, speaking in Urdu, gave an account of the organisation of "Travelling Libraries" in the Gulburga Division, and presented a box containing books for the use of the Primary schools at the Head-Quarters.

Mr. Mohammad Osman, B. A., T. D. (London), Vice-Principal, Osmania Training College, gave a lecture in Urdu on "Heredity and Environment in Education". He said: "Thirty years ago great emphasis was laid upon heredity, and heredity was supposed to be an all-important factor in forming a man's character, but present-day thinkers attach greater importance to environment. The truth lies between the two extreme views, and the character

7. The care taken in giving each child the kind of education for which he is fit, psychological experts being often employed for the purpose. Only such children are admitted into secondary schools as are, in the opinion of their teachers, likely to profit fully by secondary education.

8. The arrangements for the preservation and improvement of the health of the school population. Medical inspection of schools is better organised than perhaps in any other country in the world and there are special schools for weak and neurotic children with open-air instruction, air-baths, sunbaths and short periods of work. Physical education is compulsory in all schools. There is hardly any school which does not possess a well-equipped gymnasium and a trained physical director.

The Conference then proceeded to discuss the following resolution:—

"That in the opinion of this House in view of the climatic conditions in the Deccan, the school hours should be from 9 A. M. to 3 P. M. with an interval of one hour from June till February, and from 7-30 A. M. to 12 noon with an interval of half-an-hour during the rest of the academic year".

In moving the resolution Mr. Ahmad Husain Khan, B.A., Principal, Darul Uloom High School, said that at present it was difficult to provide facilities for play, as boys instead of proceeding to the play-ground went to their houses. For the first three months they hardly got an hour to play in the evenings and in November, December, and January they did not get even that much time. The objection that 9 o'clock was an early hour was brought forward by people who were a prey to lazy habits. Another objection was that it affected a particular class of boys, especially Hindu boys, but the majority of the Hindus observed the same hours for meals as Muslims. As for the summer period, he said that seven was too early an hour, particularly for small boys, and

President remarked that, while our energies were now divided, under the system proposed by Mr. Azam they would be concentrated and would consequently produce better results. On being put to the vote, the resolution was carried by an overwhelming majority, only four members voting against it.

The afternoon sitting commenced with a most able and eloquent lecture on "Corporal Punishment" by Mr. Marmaduke Pickthall, Principal, Government High School, Chaderghat, a report of which is published elsewhere. This was followed by a lecture by Mr. Syed Ali Akbar on "Impressions of German Schools". According to him, the outstanding features of the German school system are as follows:—

1. The high academic and professional qualifications of the teachers.

2. The close co-ordination of the different subjects of the curriculum and the co-operation of the teachers of different subjects in the same class and of teachers of the same subject in different classes.

3. The aim of education in Germany is not so much to impart knowledge to the pupils as to teach them how to use knowledge, and therefore great stress is laid on independent work by the students.

4. Harmony between school work and the life and environment of the pupils. Children are always made to experience and do what they are taught, and practical work and school excursions play an important part in their education.

5. Co-operation of parents and teachers.

6. The attention paid to backward children. Efforts are made to detect backwardness in children at an early age and special methods are employed for dealing with such children.

High section without increasing the total school period. It was high time that the Middle School Examination was abolished: at any rate, for pupils who were studying in High schools or who aimed at High school education. If this were done, four years would be quite enough for the Primary section of High schools. In the end, Mr. Azam suggested that the common system proposed by him should be controlled by a board to be called the Osmania High School Leaving Certificate Board, which should consist of representatives of the Osmania University, the Nizam College, the Education Department and the Public.

The resolution was seconded in Urdu by Mr. Gulam Mahmood, acting Head Master of the Mustaidpura Middle School. A lively discussion followed. Messrs. Mohammad Sultan, Assistant, Nampalli High School, and Abdus Salam, Secretary of the Gulburga Teachers' Association, opposed the resolution, the former on the ground that the unification of the two systems would affect the Osmania University adversely and the latter on the ground that there was no longer any need for us to be slaves to the Madras University. Mr. Abdul Majeed and Mr. S. Mohamad Sharif Mushadi also spoke on the resolution. Mr. Syed Ali Akbar, strongly supporting the resolution, pointed out that the fears expressed by Messrs. Mohamed Sultan and Abdus Salam were really due to their having misunderstood the resolution, which in fact aimed at the substitution of Urdu for English as the medium of instruction for such Urdu-speaking boys as wished to join the Nizam College and other institutions affiliated to outside universities and which therefore was calculated to promote, and in no way to damage, the principle on which the Osmania University was founded. In his reply, Mr. Azam said that a committee consisting of representatives of the Osmania University and the Education Department was considering the question of amalgamation and that he had no doubt that their decision would be in its favour. Summing up the discussion, the

which was delivered extempore. Proposing a vote of thanks to His Excellency the Maharaja Bahadur, Nawab Masood Jung Bahadur said that His Excellency had always shown great readiness in sanctioning all his proposals and that he had received every encouragement from His Excellency. It was a blessing for the state that a man of His Excellency's personality was the head of the administration. The Maharaja Bahadur was distinguished no less for his learning than for his liberality and patronage of art and letters.

After the departure of the President of the Executive Council, Mr. Syed Mohammad Azam, M. A. (Cantab), B. Sc., Principal, City College, moved the following resolution:—

"This Conference is of opinion that the time has come when the division of High School education into the Osmania and H. S. L. C. courses should be abolished and steps should be taken to unify these two systems".

In the course of his speech, Mr. Azam said that financially the present division into two courses was obviously unsound. It was also objectionable from the standpoint of educational administration. As long as the Nizam College continued to exist, there should, no doubt, be some schools to feed that institution, but the Osmania Matriculation Examination need not on that account be kept separate and distinct from the H. S. L. C. Examination. It was possible to devise a common course which would meet the needs of students desiring to join the Nizam College as well as those aiming at entrance into the Osmania University. It would be necessary to retain English as the medium of instruction in some schools, but for the vast majority of the students the vehicle of instruction would be Urdu. The Madras University had declared that they were willing to recognise the Osmania Matriculation Examination, if the course for that examination were made a three years' course. It was possible to add one year to the

The Second Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.*

THE Second Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association was held at the City College on the 12th and 13th July, 1928 under the presidency of Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, M. A., (Oxon :), Political Secretary to H. E. H. the Nizam's Government. As usual, an educational exhibition had also been organised along with the Conference. His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, Yaminus Sultanath, G. C. I. E., graced the occasion with his presence and honoured the members of the Teachers' Association by performing the opening ceremony of both the Exhibition and the Conference.

The Conference opened with welcome addresses delivered by the Rev: F. C. Philip, M. A., Chairman of the Reception Committee and Mr. Syed Ali Akbar, M. A. (Cantab :), President of the Association in English and Urdu respectively. Both these Addresses appear in full elsewhere.

His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur rose amidst cheers to make his opening speech. In the course of his remarks, he expressed great satisfaction at the work which the Teachers' Association was doing and also referred to the remarkable progress which education had made during the tenure of office of Nawab Masood Jung Bahadur, the retiring Director of Public Instruction. We publish elsewhere an English translation of His Excellency the Maharaja Bahadur's speech as well as a report of the Presidential address of Nawab Mehdi Yar Jung

*We are grateful to Mr. Syed Zainulabedin, M.A., B.T., Assistant, Darul Uloom High School for helping us with notes for this account.

NAWAB MASOOD JUNG BAHADUR,
(SYED ROSS MASOOD),
B. A. (OXON:), BARRISTER-AT-LAW,
DIRECTOR OF PUBLIC INSTRUCTION, H. E. H. THE NIZAM'S DOMINIONS,
1916 TO 1928.

HE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS

PAGE.

THE SECOND ANNUAL CONFERENCE OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION. ... 1

ADDRES OF WELCOME BY REV. F. C. PHILIP, M. A., WARDEN, ST. GEORGE'S GRAMMAR SCHOOL 12

ADDRESS OF WELCOME BY S. ALI AKBAR, M.A., (CANTAB:), PRESIDENT OF THE ASSOCIATION 16

OPENING SPEECH BY HIS EXCELLENCY THE MAHARAJA SIR KISHEN PERSHAD BAHADUR, G. C. I. E. 20

EXTRACTS FROM THE REPORT OF THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION BY S. M. S. MUSHADI, GENERAL SECRETARY 22

PRESIDENTIAL ADDRESS BY NAWAB MAHDI YAR JUNG BAHADUR, M. A., (OXON:) 25

CORPORAL PUNISHMENT BY MARMADUKE PICKTHALL, PRINCIPAL, CHADERGHAT HIGH SCHOOL 34

THE GERMAN SCHOOL SYSTEM II BY S. ALI AKBAR, M. A., (CANTAB:), DIVISIONAL INSPECTOR OF SCHOOLS, HYDERABAD - DECCAN 38

A BRIEF REVIEW OF THE PROGRESS OF EDUCATION IN H. E. H. THE NIZAM'S DOMINIONS DURING THE DIRECTORSHIP OF NAWAB MASOOD JUNG BAHADUR BY AHMED HUSAIN KHAN, B. A., PRINCIPAL, DARUL ULOOM HIGH SCHOOL ... 49

NOTES AND NEWS 53

EDITORIAL NOTES 60

REGISTERED ASAFIA NO. 47

Vol. III.] July, 1928 A. D. / Amardad, 1337 Fasli. [No 1.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab).

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

SECUNDERABAD - DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, BY T. RAMAKRISHNA AND SONS.

1928.

جلد ۳ رجسٹری شدہ پیش سرکار عالی نمبر ۴ شمارہ ۲

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

دائرہ ادارت۔

سید علی اکبر۔ ایم۔ اے۔ (کنٹب) مدیر مسئول

سید فخر الحسن۔ ملا۔ بی۔ اے؛ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر

عبد النور صدیقی۔ بی۔ اے؛ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع رہا مہتمم صدر تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساسِ معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فنِ معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصُول

(ا) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۲ روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
۲۔ ۱۲ر علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (،،)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(س) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔
(ص) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت نہ رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	صہ ۸ر	ے
نصف صفحہ	صہ	للعہ ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع صفحہ	للعہ ۸ر	عہ ۶ر	۱۲ر
	۱۰ر	۸ر	۶ر

حیدرآباد ٹیچر

جلد ۳ شمارہ ۲

بابت دے ۱۳۳۸ ف م اکتوبر ۱۹۲۸ء

فہرست

	مضمون	صاحب مضمون	
۱	دیہی مدارس میں تعلیم	ڈاکٹر ہیرلڈ مین سابق مشیر زراعت ممالک محروسۂ سرکار عالی مترجم عبدالشکور صاحب، بی۔اے۔ مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل	۱
۲	اسکاوٹنگ	سید محمد ہادی صاحب، بی۔اے، بی ٹی کنٹب ناظم بائے اسکاوٹس ممالک محروسۂ سرکار عالی	۵
۳	موجودہ مدارس اور جدید طرز تعلیم	سید تجمل حسین صاحب، بی اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج۔	۱۲
۴	آغوش مادر میں بچے کی تعلیم و تربیت	ابوالمحاسن محمد محسن خان صاحب متین مدرس فارسی وسطانیہ مستعد پورہ۔	
۵	جدید روس میں تعلیم کا طریقہ	ماخوذ از ہمدرد دہلی۔	۳۰
۶	صوبہ گلبرگہ شریف میں سیر مقامات	محمد عبدالسلام صاحب معتمد انجمن اساتذہ گلبرگہ شریف	۳۷
۷	اڈیٹوریل (حصہ صدارت پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صاحب ایم، ایل اے		۴۱
۸	خبریں و نوٹ		۴۵
۹	حسابات جلسہ الوداعی نواب مسعود جنگ بہادر	مرتبہ۔ ایچ ڈبلیو شاکراس صاحب سابق پرنسپل جاگیردار کالج۔	۵۱

۱

دیہی مدارس میں تعلیم

ڈاکٹر ہیرلڈ مین مشیر زراعت ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ بلدہ کی سرپرستی میں بتاریخ ۲۴؍ اگست ۲۸ء ایک جلسہ عام کا انتظام زیرِ صدارت نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹر ایٹ لا بمقام سینٹ جارج گرامر اسکول کیا گیا تھا، جس میں عنوان بالا کے تحت محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات اور مشاہدات کا اظہار، انگریزی میں فرمایا۔ ہم ذیل میں اُن کی تقریر کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔

(شریک مدیر)

میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو جو قوائے ذہنی ودیعت کئے گئے ہیں، اُن کو وہ بوجہ احسن کام میں لاسکیں۔ ہر مرد اور ہر عورت کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے قوائے ذہنی کو کم و بیش ہر قسم کے انسانی مشاغل میں لگا سکے۔ چونکہ ہندوستان کے اکثر صوبوں کی طرح ریاست حیدرآباد کے آبادی کا بیشتر حصہ بھی کھیتی کیاری کے کام میں زندگی بسر کرتا ہے اور غالباً اسی طرح ہمیشہ بسر کرے گا اس لئے ضروری ہے کہ ان کے تعلیم کا خاص مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے ذہنی قوئ کو بوجہ احسن زراعت کے کام میں لگا سکیں۔ اور کاشتکاری کے مختلف شعبوں کی اصلاح کرسکیں میرا خیال ہے کہ یہاں تک تو ہر شخص کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔ لیکن جوں ہی ہم اس سے آگے بڑھتے ہیں اور اس مسئلے تک پہونچتے ہیں کہ دیہات میں تعلیم بہترین حیثیت سے کس طرح دیجائے ہماری رایوں میں یکایک شدید اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

بایں ہمہ آج تک جس کسی سے بھی مجھے ملنے کا اتفاق ہوا، دیہات کے موجودہ نظام تعلیم سے میں نے اس کو مطمئن نہیں پایا۔ دیہات کے باشندے خود بھی یقیناً اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً دیہات میں جبری تعلیم کو فروغ نہیں ہوتا۔ اور کاشتکار بالکل سرد مہری سے پیش آتے ہیں۔ اگر تعلیم اطمینان بخش طریقے کی ہوتی تو پچھلے دنوں بمبئی میں جو واقعہ پیش آیا ہرگز نہ پیش آتا۔ وہ یہ ہے کہ کوکن کے کسی حصے کے سربرآوردہ پٹیلوں میں سے ایک نے صاف

صاف کہدیا کہ میں تحتانیہ کی تیسری جماعت سے آگے اپنے بچے کو تعلیم نہیں دلاؤں گا جب اس سے اس کا سبب پوچھا گیا تو اس* نے کہا کہ اگر اس کے آگے میں اپنے بچے کی تعلیم جاری رکھوں تو پھر وہ مطلق کھیتی کے کام کا نہ رہے گا۔

ہمارا موجودہ دیہی نظام تعلیم نہ صرف مقامی باشندوں کی نظر میں ناقابل اطمینان ہے بلکہ ملک کے اکثر ارباب تعلیم بھی اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب کبھی مجھے کسی تعلیمی یا زراعتی کانفرنس میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا میں نے ہر مرتبہ دیہی طرز تعلیم پر تنقید کی بوچھار دیکھی۔ یہی بات تھی جس نے مجھے بمبئی کے قیام کے ابتدائی زمانے میں اس مسئلہ میں خاص دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔

دیہی مدارس میں زراعت کو ایک خاص مضمون قرار دئے جانے کا مسئلہ اب تو مطالبہ سے گذر کر التجا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ احاطہ بمبئی میں تو اس مسئلہ کی بے شبہ یہی حالت تھی اور سنہ ۱۹۱ء میں پونہ کی زراعتی کانفرنس میں نہایت شد و مد کے ساتھ یہ سوال پیش کیا گیا تھا۔ اتفاق سے صوبہ بمبئی کے ناظم تعلیمات اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ انہوں نے کہا اور وہ اپنے اس خیال میں کسی حد تک حق بجانب تھے کہ اساتذہ کے موجودہ عملے کی مدد سے مدرسوں میں زراعت کی تعلیم بحیثیت ایک مضمون کے شروع کر دینا ایک تماشے سے بڑھ کر حقیقت نہ رکھے گا۔ اساتذہ اس فن کی تعلیم میں ہرگز کامیاب نہ ہوسکیں گے اور یہ امر دیہاتیوں کی نظر میں نہایت مضحکہ انگیز ثابت ہوگا۔

یہ دیکھ کر کہ ارباب تعلیم ابھی مدارس میں زراعت کی تعلیم کو داخل کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، میں نے ایک دوسری تجویز پیش کی جو پہلے کا بدل تو نہیں تھی لیکن اس سے زراعت کی تعلیم کے نشر میں کچھ مدد ضرور ملتی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ بعض رقبوں میں اپر پرائمری یا لوور سکنڈری (فوقانی ابتدائی یا تحتانی ثانوی جماعت) جماعتوں کے بجائے خاص زراعتی مدارس قائم کردئے جائیں حکومت بمبئی نے اس تجویز کو منظور کرلیا اور اس قسم کے چند مدارس قائم کردئے بمبئی کے کئی ضلعوں میں خاص کر ورناکولر (دیسی) زبان کے بھی کچھ مدرسے ہیں، جہاں صرف کسی نہ کسی پیشے کی تعلیم دی جاتی ہے اور جہاں ایک محدود حد تک دیہات کے بچوں کے رہنے اور کھانے کا انتظام بھی ہے بحیثیت مجموعی اس قسم کے مدارس کامیاب اور بمبئی کے لسانی رقبوں (LANGUAGE AREA) میں

ہر دل عزیز ثابت ہوئے ہیں۔ اس قسم کے اکثر مدارس اپنی گنجائش کی حد تک ہمیشہ معمور رہتے ہیں یہ امر کسی قدر باعث حیرت ہے کہ حال میں زراعت کی تحقیق کے لئے جو شاہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے ان کو پسند نہیں کیا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ مدارس ایک خاص قسم کی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے قصباتی علاقوں کے لئے تو یقینی مفید ہیں۔

لیکن ان مدارس کی مدد سے زراعتی تعلیم کا عظیم مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ صرف ۱۹۲۰ء سے زراعت پیشہ طبقوں کو کاشت کاری کی ضروریات کے مطابق تعلیم دینے کی کوشش کی جاری ہے۔ اس سلسلے میں پنجاب اور بمبئی میں پوری کوشش کی گئی ہے اور ان دونوں صوبوں میں مدارس تحتانیہ کے اونچی جماعتوں کی تعلیم کو خاص زراعتی حیثیت دی گئی ہے جب اس مسئلے کو فروغ دینے کی نوبت آئی، تو دو مشکلوں کا سامنا ہوا۔ پہلی مشکل تو یہ تھی کہ دیسی زبان کی کتابیں جو مدرسوں میں داخل کی گئی تھیں اور سب کی سب ایسے آدمیوں کی لکھی ہوئی تھیں، جن کا ذہن زراعت کے مطمح نظر سے خالی تھا کتابیں ایسے قصوں سے بھری پڑی ہیں، جو دیہاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حساب کی کتابوں میں مشقی سوال وہ نہیں ہیں جن سے کاشت کار کو آئے دن کام پڑتا ہے، بلکہ اس قسم کے ہیں جن سے اس کو اپنی پوری زندگی میں بھی سابقہ نہ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ میں نے اوپر جو تدبیر بتائی ہے وہ زراعت کی تعلیم میں اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب کہ نوشت و خواند، حساب اور اور مضامین کا انصاب زراعتی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا جائے۔ مقابلتہً اب تک اس نہج کی تعلیم میں ترقی بہت کم ہوئی ہے۔ بمبئی کے میرے ایک قدیم شاگرد نے زراعتی علم الحساب کی ایک کتاب تیار کی ہے، جو اس وقت کثرت سے استعمال ہو رہی ہے۔ اور جس کا ترجمہ بھی بمبئی کے دو مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ نوشت و خواند سکھانے کی ایسی کتابیں بھی رفتہ رفتہ لکھی جاری ہیں جو عام تعلیمی نقطہ نظر سے مفید ہیں۔ اور جن میں خاص طور پر دیہاتی زندگی سے متعلق دلچسپی پیدا کرنے کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔

دوسری مشکل پہلے سے سخت تھی۔ اور مجھے یقین نہیں ہے کہ اس کے رفع کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ یہ دشواری ایسے تربیت یافتہ اساتذہ کا فقدان تھا، جنہوں نے زراعت اور اس کے وسیع مفہوم کا غائر نظر سے کچھ مطالعہ کیا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس معاملے میں یہ حال تھا کہ جو

تربیت یافتہ اساتذہ میرے حلقے میں کارگذار تھے وہ ضرورت سے زیادہ شہری مطمح نظر رکھتے تھے
اس سے ظاہر ہے کہ خود ان اساتذہ کو زراعتی مدرسوں میں کام کرنے سے پہلے خاص تعلیم دینے کی
کتنی شدید ضرورت ہے۔ اب تک اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے اس دشواری کو دیکھ کر بمبئی میں یہ طے
پایا کہ تربیت یافتہ اساتذہ کو خاص زراعت کی تعلیم ایک سال تک دی جائے اور اس کے بعد اُن کو
دیہات کے زراعتی مدرسوں میں بھیجا جائے۔ ٹھیک یہی طریقہ پنجاب میں بھی اختیار کیا گیا ہے لیکن
افسوس ہے کہ اس قسم کے اساتذہ کی تعداد بہت قلیل ہے اور اس سبب سے زراعتی مدارس میں
ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ اس پر بھی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بمبئی میں قریب قریب ستر پرائمری
یا لوور سکنڈری (فوقانی ابتدائی یا تحتانی ثانوی) مدارس قائم کیے جا چکے ہیں، جن کا خاص رجحان
زراعت پر ہے۔ پنجاب میں ان کی تعداد کسی قدر بڑھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے
صوبوں میں بھی اس نظام تعلیم کو وسعت دی جا رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا کون سا نظام تعلیم ممالک محروسۂ سرکار عالی کے
حسب حال ہے، جسے یہاں داخل کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں اس کا اچھا خاصہ امکان ہے
اور میری رائے میں اس ریاست کے بہت سے عہدے دار شریک ہیں۔ میں نے حال میں
حیدرآباد کے لیے ایک زراعتی کالج کا خاکہ تیار کیا ہے اور یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس میں دیہات
کے زراعتی مدرسوں کے اساتذہ کے تربیت کا خاص طور پر انتظام کیا جائے۔ جو اپنے اپنے مدرسوں
میں جا کر بچوں کو مدرسے سے ملحق باغ یا مزرعہ میں زراعت کا عملی تجربہ کرائیں گے اور یہ تجربہ بچوں
کے دماغ اور ذہن کی تربیت کا ایک جزو ہو گا۔

ممکن ہے کہ اس نہج پر جو تعلیم دی جائے گی اس کی رفتار کسی قدر سست ثابت ہو لیکن
اس بات کا اطمینان کرنے سے پہلے کہ ہماری دیہی مدارس کی تعلیم صحیح بنیاد پر ہے ہمیں تین اُمور کا
لحاظ رکھنا ہو گا۔ اولاً یہ کہ کاشت کار کی تعلیم کے لیے جن مضامین کا انتخاب کیا جائے اُن سے
اس کی اُتنی ذہنی تربیت ہو جتنی کہ شہریوں کی اُن کے مناسب حال مضامین سے۔ ثانیاً یہ کہ اگر
ہم یہ چاہتے ہیں کہ کاشت کاروں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو تو لازم ہے کہ ان کو تعلیم ایسے اساتذہ
دیں جو فطرتاً کھیتی کے کام کاج سے دلچسپی رکھنے کے اہل ہوں۔ یا یہ نہیں تو پھر ایسے اساتذہ ہوں

جنھیں دلچسپی لینے کی تربیت دی گئی ہو۔ ثانیاً میرے نزدیک ضروری ہے کہ دیہات کے مدارس کی فضا ارنہ صرف بچوں بلکہ ان کے والدین کے بھی مناسب حال ہو جن کی زندگی کا خاص مشغلہ صرف کھیتی ہے۔

ترجمہ عبدالشکور صاحب بی اے
مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل

اِسکاوٗٹنگ

جناب سید محمد ہادی صاحب بی اے بی ٹی (کینٹب)

(چیف انسپکٹر ورزش جسمانی و ناظم ہائے اسکاوٹس ممالک محروسہ سرکار عالی)

ہم ذیل میں، وہ پُر از معلومات مضمون شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں، جو انجمن اساتذہ حیدرآباد کے دوسرے سالانہ جلسے میں محترم ناظم صاحب نے پڑھا تھا۔

(شریک مدیر)

ابتدائے آفرینش سے اب تک مختلف زمانے اور ممالک میں مختلف نظام تعلیم کے دَور رہے اور وقتاً فوقتاً اقتصادی، سیاسی یا سماجی حالات کے تحت مقصد تعلیم میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ وہ دَور جب کہ مدرسی یا نصاب پر زور دیا جاتا تھا، رخصت ہو چکے، موجودہ دور کے خصوصیات یہ ہیں کہ بچے کی تعلیم و تربیت اور اس کے قوائے دماغی اور جسمانی اور عادات و اخلاق کے سنوارنے میں "نفسیات" سے مدد لی جائے اور کھیل کود کے ذریعے سے اُن کے جوہر قابل کو اُبھارا جائے۔ چنانچہ قدیم زمانے کا جبر و تشدد، ظلم و ستم اور سزا و جزا کے طریقے ختم ہو چکے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مدرسین "جور اُستاد بہ زمہر پدر"، کے مقولے پر عمل کریں بلکہ ہر ممکن ذرائع اور وسائل سے تعلیم اور تدریس میں وہ جاذبیت پیدا کی جائے کہ جو درس کہے بچے بہ آسانی قبول کرلیں، نہ صرف یہی بلکہ دل میں اُتر جائے۔ اسی طرح عادات و خصائل کے بنانے اور سنوارنے میں خالی پند و موعظت کے بجائے مختلف مشاغل اور کھیل کود سے مدد لی جائے چنانچہ اسکاوٹنگ کی غرض و غایت بھی یہی ہے سر رابرٹ بیڈن پاوٗل نے ۱۹۰۸ء میں جب اِس کی ابتدا کی تو اُن کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان کے کم عمر باشندوں سے جنگ کے زمانے میں

مدد لی جائے۔ مگر رفتہ رفتہ جب یہ تحریک ترقی کرتی گئی تو اُن پر یہ روشن ہونے لگا کہ لڑکوں کے اخلاق درست کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے ابتدائی خیالات بدل ڈالے اور اس کی کوشش کی کہ اسکاؤٹنگ کے ذریعے سے ایسے اخلاق سکھائے جائیں، جن کا حاصل کرنا مدارس میں ممکن نہیں اور ایسے اُصول مرتب کئے کہ اگر سب اُن پر عمل کریں تو دُنیا سے چند ہی سال میں جنگ بالکل مفقود ہو جائے۔ پیش آہنگی (اسکاؤٹنگ) کی اہمیت اور اُسکی خوبیوں کو یُورپ والوں نے ابتدا ہی سے جان لیا اور اُس کو ترقی دینی شروع کی لیکن ہندوستان میں اس کی ابتدا بہت دیر میں ہوئی اور جب ہوئی تو بہت ساری دُشواریاں پیش آئیں۔ لیکن اب یہ تحریک نہایت سُرعت سے پھیل رہی ہے۔

ہماری ریاست میں یُوں تو آٹھ سال قبل اسکاؤٹنگ کی ابتدا کی گئی لیکن نہ تو پبلک اور نہ گورنمنٹ نے اس میں دلچسپی لی۔ گذشتہ پانچ سال سے سرکار نے اس کی اہمیت کو مان لیا اور حتی الامکان کوشاں ہے کہ یہ تحریک تمام ممالک محروسہ سرکارِ عالی میں پھیل جائے اور اس سلطنت کا بچہ بچہ اس قابل بنے کہ اپنے بادشاہ، مُلک اور قوم کی مدد کر سکے۔ سرکار نے تو اپنا فرض ادا کیا لیکن پبلک نے اب تک اس تحریک میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی۔ غالباً اس کا سبب یہی ہے کہ اس ریاست کی پبلک پیش آہنگی (اسکاوٹنگ) کے فوائد اور اہمیت سے واقف نہیں ہے۔ بعض تو اس کو فوجی تعلیم تصور کرتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ بچّوں کا قیمتی وقت رائگاں جاتا ہے۔ جب کبھی مجھے موقع ملا، میں نے ان غلط فہمیوں کے دُور کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ پہلے اس ریاست میں پیش آہنگ (اسکاوٹس) کی تعداد دو سو کے قریب تھی اور بارہ ٹروپس (دستے) کام کر رہے تھے لیکن اس وقت ان کی تعداد ہزار سے کہیں زیادہ ہے اور پینتیس ٹروپس (دستے) قائم ہو چکے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسکاؤٹنگ میں بچوں کو کیا سکھایا جاتا ہے اور اس کے سکھانے میں ہمارا مقصد کیا ہے؟

(الف) ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ مُفید شہری بننے کے لئے کون سے صفات ضروری ہیں، جن کو حاصل کرنے کے بعد مُلک کے ہونہار بچّے اپنے ہم وطنوں کو فائدہ پھونچا سکتے ہیں۔

(ب) ہم ہر لڑکے کا میلان اور رجحان طبیعت دریافت کرتے ہیں اور اُس کے چال چلن میں جو خامی ہو، معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ج) اِن معلومات کے حاصل کرنے کے بعد ہم اسکاؤٹنگ کے ذریعے سے، جو بُرائیاں بچّوں میں ہوں، اُن کو عمدہ صفات سے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُسکولی پروگرام میں، جو خامیاں رہ جاتی ہیں، اُن کو دُور کریں تاکہ طلبہ آگے چل کر محض بی اے یا ایم۔ اے ہی نہ کہلائیں بلکہ اُن کا کیرکٹر ایسا ہو کہ "مکمل انسان" کا اطلاق اُن پر ہو سکے اور وہ اپنی زندگی کو خوش گوار بنائیں اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اُمور پر زُور دیا جاتا ہے۔

(ا) کیرکٹر:۔ اسکاوٹس کو بتلایا جاتا ہے کہ وہ اسکاوٹنگ کے قواعد و ضوابط کو نہ صرف یاد رکھیں ۱؎ بلکہ اُن پر عمل کریں اور اپنے وعدے کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں ۲؎ اپنی عزت کو ایک بیش بہا چیز سمجھیں ۳؎ ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی کریں ۴؎ والدین کی عزت و توقیر کریں اور اُن کے مطیع رہیں ۵؎ جانوروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں ۶؎ عورتوں کی عزت کریں اور اپنے بادشاہ کے وفادار رہیں۔

امتیازی نشان (بیاڈجز) کے ذریعے سے اسکاوٹس میں ذاتی تعلیم کا شوق دلایا جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی لڑکے کو باغبانی کا شوق ہے تو اُسے اِس طرف راغب کیا جاتا ہے، اُس کے لئے سہولتیں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ اُس کا شوق قائم رہے اور اس میں ترقی ہو۔ اِسی طرح نجاری، تیراکی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جب لڑکا اپنے فن میں مہارت پیدا کر لیتا ہے تو اُس کا امتحان لے کر بصورت کامیابی نشان امتیاز (پروفیشنسی بیج) دیتے ہیں۔ اس طریقے پر لڑکے اپنا مدعا بہ آسانی حاصل کر لیتے ہیں۔

اگر بچّوں کو ابتدا ہی سے پیش آہنگی کی تعلیم دی جائے تو وہ آئندہ چل کر قوم کے قابل قدر لیڈر بن سکتے ہیں۔ فی زماننا ہندوستان میں لیڈروں کی جیسی کچھ ضرورت ہے وہ آپ حضرات پر روشن ہے۔ مدرسے کی تعلیم اس کمی کو پُورا کرنے میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی البتہ اسکاؤٹنگ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے اور بہت کچھ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔

ہر ٹروپ (دستے) میں کئی پٹرول (پہرہ دار) ہوتے ہیں اور ہر پٹرول کا ایک لیڈر (قائد رہنما) ہوتا ہے جس کا انتخاب اُس پٹرول کے اسکاؤٹس خود کرتے ہیں۔ لیڈر مقرر کرنے کے بعد ہر ایک اسکاؤٹ کا فرض ہے کہ اپنے رہنما کے حکم کو بجا لائے ، اُس کی عزت کرے اور اُس کے خلاف مرضی کوئی کام نہ کرے۔ اگر کوئی اسکاؤٹ اپنے لیڈر کا حکم بجا نہ لائے تو اُسے سخت سزا دی جاتی ہے۔ لیڈر کا بھی فرض ہے کہ اپنے اسکاؤٹس کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرے۔ اُن کی خوشی اور غم کا شریک بنا رہے۔ اپنے پٹرول کے ہر اسکاؤٹ کے چال چلن کا نگہبان رہے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جب یہی لڑکے بڑے ہوں گے اور اعلیٰ خدمات پر مامور ہوں گے تو جو تعلیم اُنہیں بچپن میں دی گئی ہے وہ کس قدر مفید اور کار آمد ثابت ہوگی۔ اُنہیں کسی قسم کا کام دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ بلا تشویش انجام دیں گے اور اپنے فرض کو فرض سمجھ کر پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ سر ابرٹ اپنی تصنیف میں اس بات پر خاص طور سے زور دیتے ہیں کہ مختلف ممالک میں اسکاؤٹنگ کی تحریک کامیاب ثابت ہو اور ترقی کرے تو رُوئے زمین سے جنگ ہی مفقود ہو جائے۔ اِس لئے کہ تمام بنی نوع انسان ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے لگیں گے آپس میں میلاپ بڑھے گا، غلط فہمیاں دُور ہوں گی اور قومی و مذہبی تعصبات مِٹ جائیں گے۔ جب مختلف اقوام میں اس تحریک کے ذریعے سے یگانگت پیدا ہو سکتی ہے تو کیا ایک قوم کے افراد میں، جو معمولی تفرقے ہیں اس تعلیم سے دُور نہ ہو سکیں گے؟ جب کبھی مجھے اسکاؤٹ کیمپ کے معائنے کا موقع ملا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملک کے ہندو و مسلمان طلبہ مثل بھائیوں کے کیمپ میں زندگی بسر کرتے ہیں، ساتھ کھاتے ہیں کھیلتے ہیں اور اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کبھی اُنہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ فُلاں ہندو ہے اور فلاں مُسلمان۔ پس ایسی صُورت میں جب ایسے افراد کی تعداد، جو کہ مذہبی تعصب سے بَری ہوں، بڑھتی جائے گی تو آپس کے جھگڑے بھی مٹتے جائیں گے، جو ہماری ترقی میں بُری طرح مانع ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اسکاؤٹنگ میں شریک ہونے سے لڑکا لامذہب نہیں ہوتا، بلکہ خُدا کو اچھی طرح پہچاننے لگتا ہے اور مذہب کے اصل اصُول پر کاربند ہوتا ہے۔ البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ وُہ دُوسرے مذاہب کی بھی قدر کرتا ہے اور اُن کو گری نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہر مذہب یہی تعلیم دیتا ہے، لیکن ہم اس تعلیم کو بھول بیٹھے ہیں۔

تعلیم کا مقصد علاوہ اور چیزوں کے اخلاق کی دُرستی بھی ہے۔ فی زمانہ ہم دیکھتے ہیں کہ مدارس میں صرف دماغی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ اساتذہ اور والدین کی صرف یہی تمنا اور کوشش ہوتی ہے کہ لڑکے امتحانات میں کامیابی حاصل کریں اور ڈگری پانے کے بعد روزگار سے لگ جائیں تعلیم کا صرف یہی مقصد قابل تعریف نہیں ہے۔ ہر اسکول کا فرض ہے کہ وُہ اپنے لڑکوں کو نہ صرف دماغی تعلیم دے، بلکہ اُن کے اخلاق اور اُن کی جسمانی حالت کو بھی دُرست کرنے کی کوشش کرے۔ اگلے زمانے میں جب ایک جماعت کے لڑکے صرف ایک ہی اُستاد کی نگرانی میں تمام دِن تعلیم پاتے تھے اور جماعتوں میں طلبہ کی تعداد بھی کم ہوتی تھی، یہ ممکن تھا کہ اُستاد اپنے شاگردوں کے چال چلن سے واقف ہو اور ان میں جو خامی نظر آئے، اُس کو دُور کرے۔ لیکن موجودہ طریقہ تعلیم جُداگانہ ہے۔ ہر جماعت میں ۴۰ یا ۵۰ طلبہ ہوتے ہیں اور ہر مضمون کے لئے الگ الگ اُستاد ہوتے ہیں کہ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد صرف ۴۰ یا ۴۵ منٹ کے لئے انھیں پڑھاتا ہے اور کثرت طلبہ کے باعث ہر ایک سے اُسے واقف ہونے کی مُہلت نہیں ملتی کہ نہ تو وہ لڑکوں سے واقف ہو پاتا ہے اور نہ لڑکے ہی اُس سے مانوس ہوتے ہیں۔ ایسی صُورت میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کل جو تعلیم مدارس میں دی جاتی ہے، اُس سے بچّوں کے اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اسی خامی کو دُور کرنے کی غرض سے مدارس میں اسکاؤٹنگ کی تعلیم جاری کی جاتی ہے، جس کا عین مُدعا یہ ہے کہ اُستاد اور شاگرد میں اُنس پیدا ہو اور اُستاد کو موقع ملے کہ وہ اپنے لڑکوں کی چال چلن سے آگاہ ہو اور اُن کے اصلاح کی کوشش کرے۔ اسی سبب سے ہر ایک ٹروپ میں اسکاؤٹس کی تعداد ۳۲ سے زیادہ نہیں رکھی گئی تاکہ اچھی طرح نگرانی ہو سکے اسکاؤٹ ماسٹر کے انتخاب میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ اُس کا چال چلن نہایت عمدہ ہو اور اُس میں ایثار کا مادہ زیادہ ہو تاکہ بچوں پر بھی اُس کا اچھا اثر پڑے اسکاؤٹنگ صرف کھیل ہی نہیں ہے، بلکہ تعلیم اور اُس سے زیادہ تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔ اگر کوئی شخص اخلاق سے خالی ہے مگر اُس کے نام کے ساتھ ڈگریوں کا دُم چھلاّ ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص سے اہل ملک کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے بخلاف اس کے، جو شخص مُجسّم اخلاق ہو اور ڈگری نہ رکھے تو اُس سے اہل مُلک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ جو کام اُس کو دیا جائے گا۔ وُہ دیانت داری سے انجام دے گا کوئی

فعل ایسا نہ کرے گا، جس کی بدولت اُس کا نفس اُس کو ملامت کرے اور وہ ہمیشہ انصاف کو پیش نظر رکھے گا۔ یہی ہے وُہ تعلیم، جو اسکاوٹنگ کے ذریعے سے دی جاتی ہے اسکاوٹنگ کا دوسرا خوش گوار رُخ اُس کے جسمانی فوائد ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تقریباً ہر مدرسے میں کچھ نہ کچھ جسمانی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور لڑکے اوقات مدرسہ میں ڈرل کرتے اور شام کے وقت ہاکی۔ فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں۔ مگر اسکول پروگرام میں جو وقت اُن کے لیۓ رکھا گیا ہے، وُہ بالکل ناکافی ہے۔ اس لیۓ ضرورت اِس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ اِن ذرائع کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نکالا جاۓ، جس کی بدولت بچّوں کو کافی ورزش کرنے کا موقع مل سکے اور اُس میں ایسے لڑکے بھی شریک ہوں، جو کھیل یا ڈرل کے لیۓ موزوں نہیں ہیں۔ یہ ذریعہ اسکاوٹنگ ہے۔ اس میں تھوڑی ڈرل سکھائی جاتی ہے اور کھیل کا بھی انتظام ہے۔ لیکن سب سے اہم اور دلچسپ چیز یہ ہے کہ اسکاوٹس کو "کیمپ" کرنا پڑتا ہے، جس کے لیۓ ایسی جگہ تلاش کی جاتی ہے جو شہر سے فاصلے پر ہو اور جہاں کی آب و ہوا اچھی ہو۔ دو یا تین دن اکثر اِس سے زیادہ بھی لڑکے کیمپ میں رہتے ہیں، جہاں اُنھیں اپنا کام اپنے ہاتھوں کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات کھانا بھی پکانا پڑتا ہے۔ یہاں اُنھیں اسکاوٹنگ کے مختلف مضامین سکھاۓ جاتے ہیں اور اُنھیں اِس کا موقع بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اسکاوٹ بھائیوں سے تبادلۂ خیالات کریں اور دوستی بڑھائیں۔ کیمپ میں اُنھیں تازہ ہوا میسر آتی ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کیمپ سے واپس ہوتے ہیں تو اُن کی صحت پہلے سے بہتر ہوتی ہے۔

دورانِ کیمپ میں اسکاوٹ ماسٹر کو اپنے لڑکوں کی چال چلن جانچنے کے بہترین موقع ملتا ہے اور لڑکے بھی اپنے اُستاد کے عمدہ خصائل سے واقف ہوتے ہیں۔ چوں کہ اُن میں نقل کرنے کا مادہ ہوتا ہے، اس لیۓ وُہ اُستاد کو بہترین نمونہ سمجھ کر اُس کے نقشِ قدم پر چلنے لگتے ہیں۔

اسکاوٹنگ صرف بچّوں ہی کے لیۓ نہیں ہے، بلکہ اساتذہ بھی اس سے مُستفید ہو سکتے ہیں۔ جو اُستاد اسکاوٹ ماسٹر بنتا ہے، اگر اُس میں ایثار اور ہمدردی ہو تو بچّے اُس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، اُس کی قدر کرتے ہیں اور اُس کا ہر ایک حکم بلاعذر بجا لاتے ہیں۔ جماعت میں بھی

اُس کے مطلع رہتے ہیں اور جو کچھ وہ پڑھائے اُس کو خوشی سے سیکھتے ہیں۔ کیا یہ اس سے بہتر نہیں کہ بچے اُستاد کی اطاعت اُس کے ڈر سے کریں؟ وہ ضبط، جو خوشی سے قائم ہو اُس ضبط سے کہیں بہتر ہے، جو جبر و تشدد سے قائم کیا جائے! اس طرح اسکاؤٹنگ کی بدولت اساتذہ ایک نیا طرزِ تعلیم اختیار کر سکتے ہیں اور مدرسے کے بہترین مدرس بن سکتے ہیں۔

ہر صدر مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسکاؤٹنگ کی حقیقت سے مطلع ہو اور کوشش کرے کہ اُس کے مدرسے میں بھی اسکاؤٹ ٹروپ قائم کئے جائیں تاکہ طلبہ کو علاوہ کتابی تعلیم کے اخلاقی تعلیم سے بھی بہرہ مند ہونے کا موقع ملے!

یہاں یہ کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اسکاؤٹ کس کو کہتے ہیں اور اسکاؤٹنگ کے ذریعے ہمارے مُلک میں کس قسم کے باشندے تیار ہوں گے، جن سے ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

اسکاوٹ اُس لڑکے کو کہتے ہیں۔ جو اپنی عزت کو دُنیا کی سب سے بڑی دولت سمجھے اور اُس کو جان سے زیادہ عزیز رکھے وہ اپنے فرضِ منصبی کو بخوبی محسوس کرتا اور خوشی کے ساتھ اُن تمام ذمے داریوں کو انجام دیتا ہے، جو اُس کے فرائض میں داخل ہیں۔

اسکاوٹ وہ لڑکا ہے، جو اپنے نفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کو معلوم رہتا ہے کہ جو لوگ دُنیاوی معاملات پر حاوی ہونا چاہتے ہیں اُن کو پہلے اپنے نفس پر حاوی ہونا چاہیئے۔

اسکاوٹ وہ لڑکا ہے، جو خطرے کے وقت جھجکتا نہیں کیونکہ اُسے یہ معلوم رہتا ہے کہ نازک موقع پر اُس کا کیا طریقۂ کار ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی حفاظت سے بڑھ کر دُوسروں کی حفاظت کا خواہاں رہتا ہے۔

اسکاوٹ وہ لڑکا ہے، جو کسی حادثے کے وقت فرار نہیں ہوتا بلکہ کسی کے چوٹ آگئے، تو اُسے معلوم رہتا ہے کہ کس طرح خون روک دیا جائے اور کیونکر مرہم پٹی کی جائے۔ بہرحال اس کی فہرست تو طول طویل ہے۔ جن اصحاب کو مزید معلومات حاصل کرنے ہوں وہ اسکاؤٹنگ پر کوئی ایک رسالہ پڑھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر ہمدرد اصحاب سے یہ گذارش ہے کہ وہ اِس تحریک کو ترقی دینے میں امداد فرمائیں۔ نوجوان حضرات اس تحریک میں حصّہ لے کر اپنے قوم کی مدد

فرما سکتے ہیں اور جو اپنے کو اس کام کے لئے موزوں تصور نہیں کرتے، وُہ کم سے کم اس کی اہمیت کو بچّوں کے ذہن نشین کر کے اُنھیں اس تحریک میں حصّہ لینے کی ترغیب دلا سکتے ہیں۔

ابھی تک ہمیں وُہ ترقی حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر اصحاب نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی اور اکثر نے مہمل اعتراضات کر کے عوام میں غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ لیکن ہم مایوس نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُمید رکھتے ہیں کہ ایک نہ ایک روز اس تحریک کی اہمیت سب پر روشن ہو جائے گی اور غفلت و جہالت کے پردے آنکھوں سے اُٹھ جائیں گے۔

موجودہ مدارس اور جدید طرز تعلیم*

انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کو ایک خاص اہمیت دیتا ہے اور ایک نیا دَور خیال کر کے کہتا ہے کہ بس یہی انقلاب اور ہل چل کا زمانہ ہے۔ ایک حد تک یہ خیال بجا ہے اور تاریخ بھی اس کی شاہد ہے۔ دنیا کی حالت ایک بحرِ مواّج کی سی ہے، جس میں ہمیشہ مد و جزر اُٹھتے رہتے ہیں۔ اگر ایک قوم ایک زمانے میں اپنی بیداری، محنت اور جفا کشی کی بدولت بامِ عروج پر پہنچ کر اپنا نام چار دانگ عالم میں روشن کرتی ہے تو چند روز بعد اُسی قوم کے افراد میں غفلت پیدا ہو کر اُس کی پستی اور انحطاط کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ قوم اپنی گمراہی کی وجہ سے قعرِ مذلت میں جا پڑتی ہے۔ لیکن جس طرح سمندر میں کبھی کبھی ایک غیر معمولی تلاطم بپا ہو جاتا ہے اور اپنے جوش و خروش کے باعث معمولی مد و جزر پر ایک خاص فوقیت رکھتا ہے اُسی طرح زمانہ بھی کبھی کبھی زبردست پلٹے کھاتا ہے اس زمانہ کے ایام معمولی ایام سے ممتاز ہوتے ہیں۔ تاریخ یورپ میں نشاۃ جدیدہ (RENAISSANCE) اس قسم کے زمانے کی ایک واضح مثال ہے۔

اتنا عرض کرنے کے بعد یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ اور نازک ہے کہ آیا ہمارا زمانہ بھی دَورِ جدید میں شمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ہم جب اپنے ملک کے پچھلے دس بارہ سال پر نظر ڈالتے ہیں اور اس وقت

*یہ مضمون انجمن اساتذہ بلدہ کے دوسرے سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔

کی تعلیمی حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو بین فرق نظر آتا ہے۔ صنعتی اور حرفتی اسکول، طبیہ کالج سیول انجینیرنگ اسکول، عثمانیہ یونیورسٹی اور ٹرمینگ کالج سے قطع نظر اگر معمولی مدارس اور اُن کی تعداد کا جو اُن میں زیر تعلیم ہیں دس سال گزشتہ کی تعداد طلبہ اور تعداد مدارس سے مقابلہ کیا جائے تو ہم کو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ اس زمانے کی سب سے بڑی تعلیمی کامیابی اور ترقی کا ثبوت اردو کا ذریعہ تعلیم قرار پانا ہے۔ علاوہ ازیں آئے دن ترقی تعلیم کے متعلق نئی نئی قسم کی تحریکات پیش ہوتی رہتی ہیں متعدد تعلیمی رسالے شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اس کے علاوہ مختلف تعلیمی تحریکات، مختلف نظریے اور تعلیمی کانفرنسوں کا انعقاد، اس کا پتہ دے رہے ہیں کہ آج کل ہمارے ملک میں ایک نئی روح پھونکی ہوئی ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ نہ صرف محکمہ سے متعلق اصحاب ہی سرگرم ترقی ہیں بلکہ پبلک میں بھی ایک گونہ بیداری پیدا ہو چلی ہے اور اکثر روشن خیال اصحاب تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے اعلیحضرت سُلطان العلوم کی ادنیٰ توجہ کا نتیجہ ہے اگر ہم اس زمانے کو دور جدید کہیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ پھر بھی باوجود ہماری سرگرمی کے مغرب سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم کی طرح فن تعلیم میں ہم سے بھی بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ ہم تو ابھی اُس کی نقط ریس کر رہے ہیں مگر اس خیال سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم جاپان سے سبق حاصل کریں اور خُذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر عمل پیرا ہو کر تن دہی سے کام کریں تو جاپان کی طرح تعلیمی ترقی کی دوڑ میں ہم مغرب کے قدم بہ قدم ہو سکتے ہیں یہاں اس خطرے سے خوب خبردار رہنا چاہیئے کہ ہم مغربی طرز تعلیم کی اندھا دھند تقلید نہ کریں بلکہ اپنی طرز معاشرت، تمدن اور ملکی ضرورتوں کو مد نظر رکھیں۔ تاریخ تعلیم سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یورپ میں مختلف زمانوں میں مختلف قسم کی طرز معاشرت، تمدن اور ضرورتوں کے مد نظر مختلف معیار اور اُصول تعلیم رہے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں پہلے تلوار کی تیزی تھی اس کے بعد قلم کا زور ہوا۔ ایک ماہ شماکو بی۔ اے کا سودا ہوا۔ لیکن مدتیں گزریں اور زمانہ ہو گیا کہ سیف زنگ آلود ہو چکی اور اب قلم بھی فرسودہ ہو چلا۔ موجودہ زمانے میں فقط خالی ہاتھ ہے، جس کے لئے کسی اور قسم کے اوزار کی ضرورت ہے۔ اوزار تلاش کرنے سے پیشتر ہم کو اپنے تمدن، طرز معاشرت اور ملکی ضرورتوں پر ایک گہری نظر ڈال کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ موجودہ

اوزار کارآمد ہیں یا ناکارہ ہو چکے ہیں اور اگر ناکارہ ہو چکے ہیں، تو اُن کی وجہ سے ہم میں کیا عوارض پیدا ہو گئے ہیں، تاکہ اُن کا خاطر خواہ علاج دریافت کیا جائے۔ سب سے زیادہ مہلک وبا جو ہم کو ہلاک کئے ڈال رہی ہے، وُہ فرقہ واری تعصبات اور تنازعات ہیں۔ مشکل سے کوئی ایسا مبارک دن ہوتا ہو گا جو اخبار میں یہ خبر درج نہ ہو کہ آج فلاں مقام پر ہندو مسلمان میں لاٹھی چل گئی اور کل ہڑتال ہو گئی یہ منافرت غلط طریقہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ وبا ہماری ریاست سراپا خیر و برکت میں بہت دبی ہوئی ہے۔ لیکن تعلیم و ترقی کے فروغ کے لئے اس کا جڑ سے نیست و نابود کرنا نہایت ضروری ہے۔ ملی اتحاد کی ترویج اور استحکام کے لئے مدارس سے بڑھ کر کوئی اور جگہ موزون نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنی عملی زندگی سے بچّوں کے دلوں میں یہ بات دل نشین کر دیں کہ ہر ایک اپنے مذہب میں بغیر کسی کے احساسات کو ٹھیس لگائے پکا بن سکتا ہے۔ ان مناقشات اور تعصبات کی بدولت مختلف مذاہب کے افراد میں میل جول رُکا رُکا سا ہے۔ ہماری سوسائٹی بلحاظ مذہب، ثروت اور تمدن مختلف طبقوں میں منقسم ہے، جہاں ایک طبقے کا دُوسرے سے میل ملاپ کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ اگر ہم اس بات کے متمنی ہیں کہ ہماری سوسائٹی ترقی کرے تو ان بندشوں سے آزادی حاصل کی جائے اور مختلف طبقوں کے افراد کو آپس میں میل جول بڑھانا چاہیئے۔ کچھ دن پہلے یورپ کا بھی یہی حال تھا لیکن اب وہاں اس کے اثرات بہت کم رہ گئے ہیں اس غرض کی تکمیل کے لئے مدارس میں مختلف قسم کی بچوں کی انجمنیں قائم کی جائیں، تاکہ مختلف مذہب و ملت کے بچّوں میں ربط ضبط اور اتفاق و اتحاد بڑھے۔ میرے مدرسے میں بچوں نے خود اپنی خوشی سے ایک چائے خانہ کھولا ہے اس میں بچے اپنی فرصت کے اوقات میں کام کرتے ہیں۔ ہندو مسلمان ایک ہی جگہ کھاتے پیتے ہیں۔ اس کا چوتھائی منافعہ نادار بچوں کی تعلیمی اغراض کے لئے وقف ہے۔ اس کی بدولت بچے عملی زندگی سے واقفیت کفایت شعاری ہمدردی و ایثار وغیرہ کے من جملہ آپس میں محبت و یگانگت کا عملی سبق سیکھتے ہیں۔ دُوسرا مرض جو تعلیمی نقطہ نظر سے قابل غور ہے وہ مسئلہ اقتصادی ہے افلاس کی گھٹا عوام پر چھائی ہوئی ہے۔ دنیا میں کسی ملک کے لوگ یہاں سے زیادہ عسرت سے بسر نہیں کرتے۔ آبادی کا بہت بڑا حصہ ایسی حالت میں زندگی کے دن کاٹتا ہے، جو حفظان صحت

کی رُو سے نہایت مضر ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ریاست میں تندرست اور توانا اشخاص مشکل سے نظر آتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کے قویٰ کمزور مضمحل ہیں جب اطمینان اور فارغ البالی ہی میسر نہیں تو وہ کیا خاک دماغی ریاضت کر سکتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی زندہ دلی قائم نہیں رہ سکتی۔ آبادی کے ساٹھ فیصدی حصّے کو دن میں صرف ایک مرتبہ روکھی سوکھی نصیب ہوتی ہے۔ حال آں کہ اوسط درجے کی خوراک والے کو دن میں چار مرتبہ کھانے کی ضرورت ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ زراعت معدنیات اور دستکاری سے ہماری ریاست مالا مال ہے پھر افلاس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا طرز معاشرت کچھ اس ڈھب کا واقع ہوا ہے کہ ایک کمانے والا ہے اور دس کھانے والے پھر ایک بہت بڑا طبقہ انسان نما جونکوں کا ہے جو ریاست کے سپوتوں کا خون چُوس رہا ہے۔ اس طبقے میں نکمے ہٹے کٹے فقیر اور ایسے افراد ہیں جو یا تو مذہب کی آڑ میں بے کار زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر کچھ کرتے ہیں تو فساد برپا کرتے ہیں۔ اُن کے علاوہ مستورات کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو مردوں کی دست نگر ہے۔ اگر ہم تمام اوصاف کے افراد سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ سوسائٹی کے جملہ افراد کو اُن کے استعداد اور فطری لگاؤ کی مناسبت سے تمام معاشرتی اور ذہنی شُعبوں اور شاخوں میں تقسیم کردیں۔ ہم اپنے تعلیم یافتہ طبقے کا رجحان صرف ایک طرف دیکھتے ہیں۔ ہر ایک ملازمت کا خواہاں ہے ملازمت کہاں تک اور کس کس کو ملے گی۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی قوتیں مقابلے کی وجہ سے رائگاں جا رہی ہیں۔ اس لئے اس مقابلے کو توڑ کر ان میں تعاون اور اشتراک عمل کی اسپرٹ پیدا کی جائے صنعت و حرفت کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا حال آں کہ اس میدان میں ابھی بے انتہا وسعت ہے۔ اگر چند افراد کرتے بھی ہیں تو نہایت بھدّی اور بدرونق چیزیں تیار کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بچپن میں وہ ایسے ماحول میں پرورش پاتے ہیں جہاں نفاست اور حُسن کا کال ہے۔ عام گھروں کی حالت تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں اب مدارس کی بھی سُن لیجئے۔ ہمارے مدارس میں سوائے بے ڈول بنچوں اور حفظان صحت کے منافی عمارتوں کے ایسی چیزیں شاذ ہوتی ہیں جس سے بچّوں میں بدصورتی اور خوب صورتی میں تمیز کرنے کا مادہ پیدا ہو۔ مدارس میں نہ اچھے

قسم کا فرنیچر ہے، نہ چمن ہیں، نہ عجائب خانے۔ اب عمدہ قسم کی اشیاء تیار ہوں تو کیونکر!۔
اس میں شک نہیں کہ محکمہ تعلیمات میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن اب بھی ہمارا تعلیمی نظام
بے ڈھنگا ہے۔ آبادی کا بہت بڑا حصہ ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور یہ جہالت کی
تاریکی میں پڑا ہوا ہے اوسط طبقے کے لوگ اپنے بچوں کو ثانوی اور اعلیٰ ادبی تعلیم دلانے
کے شائق ہیں، جو ہماری ضرورتوں کے اعتبار سے مناسب نہیں۔ طبقہ تحتانیہ کی تعلیم ناقص
ہے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد صرف تین چار سال مدرسے میں تعلیم پاتی ہے اس کے
بعد وہ اپنے دھندوں سے لگ جاتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے سیکھا تھا وہ کھو بیٹھتے
ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے تمام افراد یونیورسٹی کی تعلیم کے دلدادہ ہیں اور تعلیم سے فارغ ہوتے ہی
ملازمت کا فکر دامن گیر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے تمام محکمے پُر ہو گئے ہیں اور کہیں بھی قدم رکھنے
کو جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن صنعتی اور حرفتی تعلیم کی طرف کسی کو رغبت اور شوق پیدا نہیں ہوا۔
ان خرابیوں کے دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم کو طبقہ تحتانیہ کی تعلیم جبری کر دینی چاہیئے
پھر تعلیم بالغان پر زور دیا جائے اور اس کی تکمیل کے لئے جا بجا شبینہ مدارس قائم کرنے
چاہئیں تاکہ ملک کا کوئی فرد ایسا باقی نہ رہے جو نوشت و خواند سے بے بہرہ ہو۔ اس کے
علاوہ نظام تعلیم کو جو نہایت تنگ اور محض درس اور تدریس تک محدود ہے، نہایت وسیع
اور ہمہ گیر کرنا چاہیئے تاکہ وہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو۔ اس نصاب کو دو
حصوں میں تقسیم کیا جائے ایک لازمی اور دُوسرا اختیاری۔ لازمی نوشت و خواند۔ معلومات
عامہ۔ حساب ادب دینیات اور تعلیم جسمانی پر مشتمل ہو یہ مضامین تمام مدارس میں یکساں ہوں۔

دُوسرے حصہ میں زراعت تجارت صنعت و حرفت ڈرائنگ سائنس اور فنون
لطیفہ ہوا۔ نصاب کا یہ حصہ بالکلیہ ہر جگہ یکساں نہ ہو بلکہ خوب لچک دار ہو تاکہ جہاں جہاں
جن جن چیزوں کی خاص ضرورت ہو وہاں انہی پر زور دیا جائے اور غیر ضروری چیزوں کو
چھوڑ دیا جائے۔ مدارس کا ماحول مصنوعی ہے اور باہر کی گوناگوں زندگی سے اس کو کوئی
تعلق نہیں ہوتا اس لئے جب بچہ مدرسہ سے فارغ ہو کر دُنیا میں قدم دھرتا ہے تو اپنے تئیں
ایک نئی دُنیا میں پاتا ہے مثلاً ایک کاشت کار کا بچہ جب پڑھ لکھ کر فارغ ہوتا ہے تو اُسکی

تعلیم اپنے آبائی پیشہ کے لئے بے کار ہوتی ہے اور برادری سے باہر ہونا پڑتا ہے ایک طرف تو اس کو برادری سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا اور دوسری طرف خود اس لڑکے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ موجودہ نصاب یونیورسٹی کی تعلیم میں مدد معاون ہو لیکن طلبہ کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی تعلیم یونیورسٹی پہنچنے سے پیشتر ہی ختم کر دیتا ہے اور یونیورسٹی کا مجوزہ نصاب ان طلبہ کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہے ہماری تمام کوشش اور اصلاح اس بارہ میں ہونی چاہیئے کہ بچے کی فردیت اور شخصیت کی نشو و نما کی جائے اور دباؤ کے نیچے کام کرانے کی عادت ترک کرا کر ان کو ایک حد تک آزادی دی جائے صحیح تعلیم کے ہر ایک مقبول طریقے کو ہر ایک سب بچے کی فطری لگاؤ اور سوسائٹی کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر رواج دیا جائے۔ اس کے علاوہ چھوٹے بچوں، لڑکوں اور نوجوانوں کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے۔ بچپن کھیل کود کا زمانہ ہے ان کی تعلیم بطور کھیل کود اور کہانیوں کے ذریعے سے ہونی چاہیئے۔ لڑکپن اور جوانی میں طلبہ کی طبیعت حقیقت حس اور جذبات کی طرف مائل ہوتی ہے اس لئے ان کی تعلیم میں انہی خصوصیات کو مدنظر رکھا جائے۔ غرض ہر قسم کی کوشش اور طریقے کو کام میں لانا چاہیئے جس کے ذریعہ استاد بچے کو عملی زندگی سے گہری واقفیت پیدا کرائے۔ بچوں میں آزادانہ طور پر تبادلہ خیالات کرنے کے لئے مختلف قسم کی انجمنیں قائم کی جائیں۔ درس و تدریس پر ہی اکتفانہ کی جائے۔ کتابیں اسی وقت کار آمد ہو سکتی ہیں جب کہ ان کے ساتھ ساتھ عملی تجربات بھی ہوتے رہیں۔ مدرسے کو ایک چھوٹی سی دنیا بنا دینا چاہیئے کہ بچوں کو مدرسے اور گھر کی زندگی میں کوئی فرق نہ معلوم ہو۔ بچے مدرسے میں ہر قسم کی زندگی بسر کرنا سیکھیں علاوہ ازیں مدرسے کا تعلق ان سوسائٹیوں سے بھی ہونا چاہیئے جو بچے کی زندگی پر اثر ڈالتی ہیں۔

مدرسین کو بچوں کے والدین سے تعلقات وسیع کرنا چاہیئے بچوں کے والدین کو مدرسہ میں مختلف کھیل اور تعلیمی موقعوں پر مدعو کیا جائے اور اس وقت اساتذہ ان سے بچوں کے تعلیمی معاملات پر تبادلہ خیالات کریں مختصر یہ کہ بچے کی فردیت کو نہ کچلا جائے بلکہ جس طرف اس کا میلان طبیعت ہے اور وہ فن ایسا ہے کہ جس سے سوسائٹی کو بجز فائدہ کسی قسم کا

نقصان نہیں پہنچتا۔ اس کو اسی فن میں ترقی دینے کے لئے پورے پورے موقعے دئے جائیں تاکہ ہر ایک اپنے اپنے فن کا استاد اور کامل بن سکے۔ اس اصول سے ایک طرف تو خود بچے کا فائدہ ہوگا اور دوسری طرف اس کی لیاقت کی وجہ سے سوسائٹی کو نفع پہنچے گا۔ آج کل اُسی شخص کی قدر کی جاتی ہے جو کوئی کمال رکھتا ہو مدرس کا کام بچوں کے اخلاق اور رویہ درست کرنا اور ان کا علمی اور معلومات عامہ کا دائرہ عملی طور سے وسیع کرنا ہے تاکہ وہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرسکیں۔ اس غرض کی تکمیل میں ہمارا موجودہ طریقہ امتحانات سد سکندری سے کچھ کم نہیں۔ عام طور پر میٹرک کے ممتحن صاحبان اور غالباً بعض اوقات مڈل کے ممتحن صاحبان ایسے حضرات ہوتے ہیں جن کا تعلق مدارس سے نہیں ہوتا اس لئے اکثر اوقات امتحانات میں اس قسم کے سوالات دئے جاتے ہیں جو طلبہ کے معیار کے مطابق نہیں ہوتے لیکن مدرس کی قابلیت کا معیار بچے کو کسی نہ کسی طرح امتحان میں پاس کرانا ٹھیرا ہے۔ امتحانوں کا عجیب بچوں پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ تعلیم نہایت ناقص اور اُدھوری ہوتی ہے۔ مدرسین اسی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ تاریخ کا ممتحن کون ہے اور انگریزی کا کون تاکہ اُسی کے خیالات کے بموجب بچوں کو رٹوائیں نتیجہ یہ ہے کہ امتحان بچوں کے لئے نہیں رہا بلکہ بچے امتحانوں کے لئے بن گئے ہیں۔ سوائے بچوں کی قوت حافظہ کے قوت عمل، جدت، فردیت ایسے امتحان سے نہیں جانچی جا سکتی۔ شروع ہی سے حافظے پر اس قدر زور ڈالا جاتا ہے کہ بچوں کا دماغ کھوکھلا ہو جاتا ہے اُس پر طرہ یہ کہ بچوں کو امتحان گاہ پر بار بار حملے کرنے کے باوجود کامیابی نصیب نہیں ہوتی اور ان کی عزیز عمریں اور ان کے والدین کے گاڑھے پسینے کی کمائی بلا وجہ برباد ہوتی ہے۔ ایسی باتیں جو زندگی میں حقیقی طور پر مفید یا سوسائٹی کیلئے ضروری ہیں امتحان میں نہیں پوچھی جاتیں۔ امتحانوں کی بدولت تعلیم درس و تدریس تک محدود ہے۔ اس لئے میری یہ تجویز ہے کہ امتحانوں کا زور کم کر دیا جائے اور مڈل کا امتحان موقوف کر کے صرف مہتمم صاحبان کے معائنہ پر اکتفا کیا جائے حضرات میں نے جو کچھ ترقی تعلیم کے بارے میں عرض کیا اور جو نظام تعلیم پیش کیا ہے اس کو عملی جامہ پہنانے اور فروغ دینے کے لئے مدرس اور مہتمم، دو اہم جز ہیں۔ اگر ہمارے نوجوان زندگی کی تگ و دو کے قابل

دہ نہیں تو قصور اُن اصحاب کا ہوگا تعلیمی سائیکل کے یہ دو پہیے ہیں اگر پہیے ایک دوسرے سے مخالف سمت میں چلیں یا اُن میں سے کسی ایک میں بھی خرابی ہو تو سائیکل کا چلنا ناممکن ہے۔ اس سائیکل کا پچھلا پہیہ مدرس ہے کیونکہ سائیکل کے چلانے میں بڑا کام پچھلے پہیے کا ہوتا ہے اور اگلا پہیہ پچھلے کی رہبری کرتا ہے۔ مدرس اہم ترین جزو ہے اور اسی کا اثر طلبہ کی زندگی پر براہ راست اور گہرا پڑتا ہے اس سے لئے خوبی (EFFICIENCY) کی سخت ضرورت ہے اگر اس کی اصلاح نہ کی جائے گی تو تعلیمی ترقی معدوم۔ ہمارے مدرسین کی جو حالت ہے وہ محتاج بیان نہیں اس قسم کے نظام کے لئے ٹرینڈ اور اپنے فن سے حقیقی دل چسپی رکھنے والے ہمدرد اصحاب کی ضرورت ہے اس لئے محکمے میں کوئی ایسا مدرس نہ ہونا چاہیئے جو فن تعلیم کے ضروری عملی اصولوں سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسین کی اتنی بڑی فوج فوراً کس طرح تیار ہو جائے۔ ٹریننگ کالج تو دے گئے ایک ہی نظر آتا ہے اور اگر ہو بھی گئے تو ان لوگوں کی یہ شکایت باقی رہ جاتی ہے کہ تنخواہیں قلیل ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کی شکایت بجا ہے۔ ممکن ہے کہ ارباب صدر کا یہ خیال ہو کہ آج کل گریجوئٹس خوشی خوشی چالیس پینتیس پر چلے آتے ہیں تو پھر یہ شکایت کیسی میں یہ عرض کرتا ہوں کہ محکمے کو ممکن ہے کہ اس سے بھی سستے گریجوئیٹس مل جائیں لیکن اُن کی دل چسپی اور اطمینان کا حال اگر انہیں سے پوچھا جائے تو وہ خود ہی بتائیں گے مگر اُن کے ہاتھوں بچوں کی تعلیم کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ میری ناقص رائے میں اس خرابی کے دور کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں پہلے یہ کہ مدرسین کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اطمینان اور دل جمعی سے اپنے مفوضہ کام میں حقیقی دل چسپی لیں اور اُن کی نیت ڈانواں ڈول نہ ہو۔ دوسری ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام مدرس ٹرینڈ ہوں اگر وقت واحد میں یہ بات ممکن نہ ہو تو جس طرح دوسرے محکموں میں ڈپارٹمنٹل امتحان ہوتے ہیں اسی طرح محکمۂ تعلیمات میں ڈپارٹمنٹل امتحان ہوا کرے۔ اس امتحان کے لئے نصاب ایسا ہو جس سے واقفیت ہر ایک مدرس کے لئے ضروری ہے وہ بہت لمبا چوڑا نہ ہو بلکہ مختصر اعلیٰ اور ادنیٰ تعلیم یافتہ دونوں کے لئے مساوی ہو اس کی تیاری کے لئے کسی خاص ٹریننگ کالج

کی ضرورت لاحق نہ ہو بلکہ خود خانگی طور پر تیاری کی جا سکے۔ اس امتحان میں کامیابی ملازمت کی پہلی شرط ہو دوسری شرط یہ کہ محکمہ ہر ایک کامیاب شدہ اُمیدوار کو ایک سال کی آزمایش کی شرط پر ملازم رکھے۔ اس عرصے میں ایک طرف محکمہ یہ معلوم کرے گا کہ مدرس اس کام کا ہے یا نہیں اور دوسری طرف خود وہ شخص اس بات کا فیصلہ کرلے گا کہ آیا میں اس پیشے کے قابل ہوں یا نہیں۔ ان دونوں سوالوں کا جواب پہلے ہی سال اثبات یا نفی میں طے ہو جائے گا اور جو مُدرس اپنے پیشے کو خاطر خواہ بنا نہیں سکتا اس کا اس پیشے کو خیرباد کہدینا مناسب ہے۔ ایسا مدرس جہاں تعلیم اور متعلمین کے لئے غیر مفید ثابت ہوگا وہاں خود اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

تجمل حسین صاحب بی اے صدر مدرس
مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج

آغوشِ مادر

(میں)

بچّے کی تعلیم و تربیت

ذیل کا مضمون، "ایرانشہر" کے فاضل مُدیر آقائے حسین کاظم زادہ کی تصنیف "راہ نَو در تربیت و تعلیم" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ فاضل موصوف نے خوشی کی بات ہے کہ فنِ تعلیم پر قلم اُٹھایا ہے؛ اُن کی یہ کوشش نظرِ استحسان سے دیکھے جانے کے قابل ہے اس کتاب کو موصوف نے تین جلدوں میں ختم کیا ہے متین صاحب کے زیرِ ترجمہ ہیں۔ اگر یہ ترجمہ مُفید ثابت ہو تو ہم اس کی دُوسری قسطیں بھی پیش کریں گے۔

(شریک مُدیر)

آپ جانتے ہیں کہ بچّہ جس وقت دنیا میں قدم رکھتا ہے، نہایت نحیف و ناتوان ہوتا ہے۔ وہ احتیاج کو رفع کرنے، تکلیف کو دور کرنے، بھُوک کی ضرورت ظاہر کرنے اپنے رنج و درد کا اظہار کرنے کے لئے، سوا آنسوؤں اور اپنی نگاہوں کے کوئی اور ذریعہ نہیں رکھتا۔ اس کے جسم کے اعضا کمزور اور اس کی ہڈیاں نرم اور لچلچی ہوتی ہیں۔ نہ وُہ بات

کرنی جانتا ہے اور نہ وُہ رستہ چل سکتا ہے۔ وہ ایک عاجز و ناتواں ہستی ہے جو محض مہر و شفقت کے لئے پیدا کی گئی ہے! اِس آخری زمانے میں اجرمانیہ میں ایک دردناک واقعہ پیش آیا، جو ہمارے لئے ایک اچھی اور سبق آموز مثال ہے۔ جرمانی روزناموں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہاں کے کسی شہر میں، ایک ماں اپنے بچے کو جو پُورے تین مہینے کا نہ تھا گھر میں چھوڑ کر کہیں باہر چلی گئی تھی، گھر آنے کے بعد کیا دیکھتی ہے کہ ایک چوہے نے بچے کی کھوپڑی میں سوراخ کر کے اُس کا بھیجا کھا لیا ہے۔

جس وقت کوئی شخص، ایک نومولود بچے کی اس ناتوانی، برہنگی، اور بیچارگی کی حالت کا تصوّر کرتا ہے تو وہ بڑے گہرے فکر میں پڑ جاتا ہے کہ اس کپکپا دینے والے، کمزور وجود سے کیا کیا کچھ بڑے اور حیرت میں ڈالنے والے کام ظاہر ہوں گے یا! جس وقت ہم اپنی حالت کا، اسی بچے کی حالت سے اندازہ کرتے ہیں تو ہم آج اُس کو قطرہ اور اپنے آپ کو دریا، اُس کو ذرہ، اور خود کو آفتاب تصوّر کرتے ہیں اور اُس کی اسی حالت کی حفاظت کرتے ہیں؛ یہ وُہ وقت ہے کہ شانِ کبریائی کے متعلق ہماری زبان، ہماری روح اور قلب کی ترجمان ہو کر کہتی ہے۔

ستایش بداں آفرینندہ باد   کہ ایں نیروے اندر تن و جان نہاد

واقعی! یہ ننھا اور کمزور وجود اور یہ گوشت کا لوتھڑا اور ہڈیوں کا ڈھانچہ کس قدر بھادد بھرا ہے اور کس طرح ترقی کی راہیں طے کرنے اور کمال حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے؟ اور کامیاب بھی اس طریقے سے ہوتا ہے، گویا وُہ ایک اور دُنیا سے غیر معمولی استعداد اور قوتیں اپنے ہمراہ لے آیا ہے۔ کیوں نہ ہو! اِس دنیا کے گشت لگانے والے سیاح نے رستے کا توشہ اپنے جسم کے چرمی تھیلے میں رکھ لیا ہے اور یہ دُنیا کا سفر کرنے والا سوداگر اپنے ہمراہ ایک بڑا سرمایہ رکھتا ہے؛ اِس سے مُراد اُس کی رُوح ہے، جس کا جمال، فطری، نسلی اور آبائی استعدادوں کے صفحات پر چمکتا نظر آئے گا۔ پھر یہی کمزور مسافر آگے چل کر، ایک دُنیا کو قبضہ میں لاتا اور گران قدر متاع کا مالک ہو جاتا ہے اور اِنہیں کے وسیلے سے دُنیا کو اپنے قبضے و اقتدار میں لاتا اور دریاؤں، سمندروں، دَروں، پہاڑوں اور کرّہ

ہوا پر مسلط ہو کر ان تمام اختراعات، وسائل صنعتوں، مشینوں اور ہنروں کو وجود میں لاتا ہے بلا شبہ یہ تمام کام اسی ناتواں وجود کے ذریعے ظاہر ہوئے۔ یہ سارے کام نکالے ہوئے اور بنائے ہوئے اُسی چھوٹے سے جرم کے ہیں جس کا نام انسان ہے اور جس میں ایک بڑی دنیا پوشیدہ ہے۔

یہ بڑی دنیا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، روح ہے اور اس کی تجلیات سے مراد وہ استعداد اور وہ قوت ہے جو بچے کی ذات میں فطرۃً موجود ہے اور یہی وہ سرمایہ ہے، جو خالق کی طرف سے اُس کو دیا گیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے زندگی کے بازار میں لین دین کرے۔ اور اپنی اصلی اور اولیں منزل پر لوٹنے کے لیے، کوئی زاد راہ یا کوئی تحفہ حاصل کرے۔

اسی اصول کے مد نظر، اس سرمائے کی حفاظت کرنا اور اس کو کام میں لانا آدمی کے فرائض میں سب سے پہلا فریضہ ہے اور فن تربیت بھی ہم کو یہی تعلیم دیتا ہے۔ کیوں کہ تربیت ایک علم ہے جو جسمانی قوتوں اور استعدادوں کی پرورش اور حفاظت کے طریقے ہم کو سکھاتا ہے۔ جیسا کہ افلاطون نے کہا ہے: "فن تربیت ان قاعدوں کا مجموعہ ہے جو ہماری روح (نفس) اور جسم کو درجۂ کمال پر پہونچا دیتا ہے۔"

جس دن سے بچہ دنیا میں قدم رکھتا ہے اس کی پرورش کا آغاز اُسی دن سے ہوتا ہے اور اسی روز سے وہ بڑھنے لگتا ہے اور اس کی تعلیم و تربیت بھی اُسی دن سے ہونی چاہیئے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے: "پیدا ہونے کے دن سے مرنے کے دن تک علم کی طلب میں رہو"[1]

جب کہ نومولود بچے کی دیکھ بھال اور نگرانی ماں کے ذمے کر دی جاتی ہے تو ماں ہی کو بچے کا سب سے پہلا معلم سمجھنا چاہیئے اور ماں بچہ کو جیسی کچھ تعلیم دے گی اور جس طریقے سے اس کو پرورش کرے گی بچے کی نشو و نما بھی اُسی طریقے پر ہوگی اور وہ اُسی نہج پر بار آور ہوگا، جس سے ماں کے فریضے کے مقدس و اہم ہونے کا ثبوت ملتا ہے

---

[1] اطلبوا العلم من المھد الی اللحد کا ترجمہ ہے ۱۲ (متین)

یہی وجہ ہے کہ بچے کی آئندہ قسمت یعنے اُس کی خوش نصیبی اور بدنصیبی ماں کی فہم و ادراک کے ساتھ وابستہ ہے، اُس کی اچھی یا بُری تربیت، جو وُہ اس کو دے گی، اُسی سے متعلق رہے گی۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ خدا نے جس محبت کی آگ کو ماں کے دل میں روشن کردیا ہے وُہ ایک ایسی آگ ہے جسے بیماریوں اور مصیبتوں کی گرد نہ بجھا سکتی ہے اور نہ معدوم کر سکتی ہے۔ حقیقتہً یہ کیا ہی قوی اور آتشیں عشق ہے یہ وہی ماں کی ماتا ہے جس کو بیسیوں قسم کے عذاب اور تکلیفات، اور بیسیوں قسم کی حرماں نصیباں، بھوک، بیماری، برہنگی اور رنج و درد اُس دل سے دُور نہیں کر سکتے۔

کیا ہی دل خراش اور عبرت انگیز وہ سرگزشتیں ہیں اور کیا ہی حیرت میں ڈالنے والے وُہ معجزے ہیں، جن میں ماں کی محبت کا ذکر زمانے کے صفحات پر بطور یادگار کے قائم ہے! کیسی خون کے آنسوں رلانے اور رقت پیدا کرنے والی وُہ داستانیں ہیں اور کیسی شیریں و روح پرور وُہ حکایتیں ہیں، جو ماں کے ایک صبر آزما دل کے متعلق بیان کی گئی ہیں، در آں حالیکہ وہ ابھی بالکل اُدھوری ہیں!

اگر یہ بھڑکتی آگ اور جگمگاتی شعاعیں ماں کے دل میں موجود نہ ہوتیں تو کیا انسان کمال کی اِس موجودہ حد پر پہنچ سکتا اور موجودہ ارتقاء کا ہزارواں حصہ کامیابی حاصل کر سکتا تھا؟ میرے عقیدے کے اعتبار سے یہ بات ناممکن ہے! آیا سوائے ماں کے کسی سے یہ ممکن ہے کہ راتوں کو جاگے، بھوک پر صبر کرے اور گرمی اور جاڑے میں بچے کو اپنی گود میں پالے اور اُس کو سُلائے؟

بہتیری جانیں ایسی ہیں، جو فقط ماں کی ماتا کی ذرا سی پرچھائیں پر تلف کرنے والے ہاتھوں سے رہائی پا جاتی ہیں، بہتیرے گھر ایسے ہیں جو صرف ماں کی محبت کی وجہ تباہی اور اور بربادی سے بچ گئے ہیں۔ ماں کا دل جماعتِ انسانی کے گھاؤ کے لئے مرہم ہے اور خاندانی زندگی کی عمارت کے لئے مضبوط بُنیاد۔ ماں کا دل اولاد کی آرزؤں کا کعبہ ہے اور اولاد کی محبت ماں کے دل کا قبلہ! اگر صرف اس خیال کی بنا ء پر کہ عورت البشری دُنیا میں

جس خدمت کو انجام دیتی ہے انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے مقدس وجود کا کیا درجہ ہے اور کہاں تک اس کا رتبہ حرمت و پرستش کے قابل ہے
باوجودیکہ ماں کی محبت کس قدر پاک، گہری، حرارت والی اور پائدار ہے مگر اولاد کی تربیت اور اس کو نیک بختی اور کمال کے رستے پر لانے کے لئے کافی نہیں۔ اس وجہ سے کہ زندگی کے جس ابتدائی دور میں بچّے کے جسم اور جان کا اختیار ماں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہزاروں قسم کے داخلی و خارجی اثر و نفوذ بچے کے لئے حدود اور اس کی ممکنات کا تعین کرتے ہیں۔

اس زمانے میں، خانگی زندگی کے طور و طریق اور شرائط، بچے کے قوائے دماغی، روح اور قلب پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ بچّے کا نفس، دل اور دماغ اتنے پاک و صاف اور روشن ہوتے ہیں کہ ذرا سی گرد و غبار اس کو گدلا، داغ دار اور تاریک بنا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے بڑی سے بڑی تکلیفوں اور دشواریوں کو، ماں یا وہ شخص، جو اس کا قائم مقام ہوتا ہے، فرض سمجھتا ہے۔ ماں کو چاہیئے کہ ان باتوں کو سمجھے اور ان کو اسی محبت مادری کے ذریعے بجالائے!

ہم بچوں کے اخلاق اور ان کی آئندہ قسمتوں کے بارے میں، خانگی تربیت کے مؤثر ہونے کو ثابت کرنے کے لئے مجبور ہیں اور اسی کے متعلق کچھ مطالب بھی بیان کریں گے اس وجہ سے کہ کنبہ یا خاندان، ایک ایسے کارخانے کی مانند ہے جہاں بچے کے اخلاق اور اس کی آئندہ قسمت سانچے میں ڈھالی جاتی ہے اور وہ سانچہ جس شکل کا ہوگا بچہ بھی اسی کا ایک نمونہ ہوگا۔ بڑا ہونے کے بعد اس شکل کا بدلنا بہت مشکل ہے۔ اسی لحاظ سے زندگی کے شرائط اور خانگی طرز تربیت پر نظر غائر ڈالنی چاہیئے اور یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ شرائط کس طرح بچے کے جسمانی، ذہنی، اخلاقی قوٰی پر اثر ڈالتے ہیں۔

اس وجہ سے کہ بچے کے پاکیزہ دماغ اور اس کے صاف اور ستھرے دل کے سامنے جو چیز بھی پیش کی جاتی ہے وہ فوراً قبول کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے ذریعے

غذا اور قوت پہنچاتے ہیں۔ اسی خیال کے مدنظر، جو چیز، جو فکر، جو حرکت، جو بات اور جو رفتار اُس کے دماغی اور روحی قویٰ میں ایک خاص اثر قائم کرے گی اُسی کے اثرات آپس میں مل کر اُس کے اخلاق، عادات اور صفات کو ایک خاص قسم کی شکل میں ڈھالیں گے!

اسی خیال کے نظر کرتے خانگی زندگی کے شرائط کا نظر انداز کرنا نہایت مشکل ہے اور ان ہی شرائط کی رو سے کسی ایک بچہ کے اخلاق کو روشنی میں لایا جا سکتا ہے اور اس کی آئندہ قسمت کی حد میں بھی قائم کی جا سکتی ہیں جس کے لئے چند امور غور طلب ہیں۔

(۱) گھر پر بچے کی خوراک اور پوشاک کا مناسب انتظام ہے۔ خوراک میں اس بات کو دیکھنا چاہیئے کہ آیا چکنی چیزی اور حیوانی غذاؤں مثلاً دودھ، مکھن، گھی، گوشت وغیرہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے یا نباتی غذاؤں مثلاً ترکاری، غلہ، پھل وغیرہ کو۔ لباس میں حفظان صحت کے اصول کو ملحوظ رکھا جاتا ہے یا نہیں، بچوں کی کافی طور پر دیکھ بھال ہوتی ہے یا نہیں۔ ماں اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہے یا نہیں۔ کس وقت بچے سے دودھ چھڑایا جاتا ہے۔

(۲) والدین نے اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے، اور اُن کا کیا پیشہ ہے اور وہ بچوں کو بچپن ہی میں اپنے پیشے کے سیکھنے پر مجبور کرتے ہیں یا نہیں؟ یہ بات یقین کرنے کے قابل ہے کہ والدین کے پیشے کے اعتبار سے بہت کچھ آلات، اوزار اور ہتیار گھر میں موجود ہوتے ہیں اور بچہ خواہی نخواہی اُن سے کھیلتا ہے۔ یا کم سے کم روزانہ والدین کو اُن کے ذریعے کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے دل میں اُس پیشے اور کام کی نسبت کچھ نہ کچھ شوق پیدا ہو کر اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا اور اُس کے قوٰے کو بچپن ہی سے کام کے قابل بنا دیتا ہے۔

(۳) گھر میں قسم قسم کے کھیل اور کھلونے بھی بچے کی ممکنات پر بہت کچھ اثر ڈالتے ہیں مثلاً: کھلونے زیادہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں یا ذہن او فکر سے؟ کون سے کھلونے اعضاء جسمانی اور قوائے دماغی میں سے کسی ایک کو بہت زیادہ کام میں لگاتے ہیں اور وہ کس درجے تک حفظان صحت کے اصول کے موافق ہیں۔ یہ کھلونے زیادہ ترغیبوں کے درمیان کھلی

ہوا میں کھیلے جاتے ہیں یا کمروں کے اندر۔ یہ کھیل علمی، فنی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کس پایہ کے ہیں؟

۴۔ گھر میں سزا و جزا کے لئے کیا طریقے مقرر ہیں۔ آیا بچے کو بھوت، پریت اور ہیجا کے خیالی شکلوں کے ذریعے ڈرایا جاتا ہے یا۔ لکڑی یا بید کی قسم کی چیزوں سے مارا جاتا ہے یا۔ اس کو کسی اور ذرائع سے سزا دی جاتی ہے۔ تحسین و آفرین کے موقع پر پیسے اور کھانے کی چیزیں لینے کی عادت ڈالی جاتی ہے یا۔ فنی اور اخلاقی کھلونے اور کتابیں وغیرہ دی جاتی ہیں یا۔ اُس کو تاریک اور مرطوب کمروں میں بند تو نہیں کیا جاتا ہے؟ مہربانی کے وقت اُس کو پیار کرتے اور گود میں لیتے ہیں یا نہیں، سزا اور جزا کے موقع پر کس قسم کے بُرے الفاظ اور کس قسم کی خوش کرنے اور دل بڑھانے والی باتیں کہی جاتی ہیں۔

(۵) خاندان میں کس قسم کے عقائد اور کس قسم کے رسم و رواج تربیت کے متعلق رائج ہیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہر وہ ماں باپ، جن کا تعلق خواہ کسی فرقے سے ہو۔ کچھ نہ کچھ عقیدے اور طریقے تربیت کے متعلق رکھتے ہیں مثلاً: کہتے ہیں کہ بچے سے زیادہ لاڈ نہ کرنا چاہیئے۔ بچے کو والدین کے روبرو زیادہ رہنے کا موقع نہ ملے اور وہ اُن سے زیادہ گفتگو بھی نہ کرنی پائے۔ ایسے ہی مہمان کے آنے اور جانے کے موقع پر کیا آداب مقرر ہیں، بولنا شروع کرنے کے زمانے سے لے کر مکتب میں، داخل ہونے کے زمانے تک، خاص خاص اوقات میں، عیدوں، جشنوں، ماتموں اور ضیافتوں میں بچے پر کس قسم کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، والدین ان آداب کو کس طریقے اور اُصول کے ساتھ سکھلاتے ہیں۔

(۶) والدین دراصل بچے کے متعلق کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ بچہ اُن کی نظروں میں کیا ہوتا ہے اور وہ کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔ آیا اس کے لئے تعلیم و تربیت کو ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کس حد تک۔ آیا وہ لڑکے اور لڑکی کی تعلیم کے درمیان کچھ فرق رکھتے ہیں یا نہیں۔ بچے سے دوسروں کے مقابل کس طور پر مخاطبت کی جاتی ہے والدین غصے کی حالت میں اپنے بچوں کو کس طرح پکارتے ہیں اور اس باب میں ہر طبقے کے آدمیوں کا کیا مسلک رہا ہے۔

(۷) والدین یا سرپرستوں نے تربیت کا مفہوم کیا سمجھ رکھا ہے، وہ کس طرح ہونی چاہیئے اور اُس کی غرض و غایت کیا ہے؟ مثلاً: آیا وہ چاہتے ہیں کہ بچہ خود دار، سنجیدہ، ملنسار، باحیا، شرمیلا، کم خوراک ہو اور کھیل کا راغب (کھلنڈرا) چلبلا اور شریر نہ ہو محض نیک رہی نیک ہو یا کسی اور طریقے پر؟

(۸) خاندان کی معاشرت اور اُن کے عادات و اخلاق میں یکسانیت ہے یا نہیں خاندان کو زیادہ تر کن صحبتوں اور کن سوسائیٹیوں میں نشست و برخاست کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ لوگ کس طبقے اور کس مذہب کے ہیں، اُن کا اس خاندان کے بچوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ رہا ہے اُن کے اور بچے کے والدین کے عقائد اور اخلاق میں کیا فرق ہے اور اسی طرح تربیت و اخلاق اور آداب کے خصوص میں والدین کے مابین کچھ اختلاف تو نہیں ہے؟ ان دونوں میں کون سی چیز بچے کی تربیت کے بارے میں بہت زیادہ اثر رکھتی ہے۔ اسی طرح پڑوسی، احباب اور رشتے دار، خاندان کے کاروبار اور بچوں کی تربیت میں کس حد تک دخل اور اثر رکھتے ہیں۔

(۹) خاندان بچے کو زندگی کی کس راہ اور کس میدان کے لئے تیار کرتا ہے مثلاً ایک دُنیا پرست یا ایک زاہد، عابد اور گوشہ نشین چاہتا ہے کہ روپیہ جمع کرے، تمام لوگوں اور اہل دُنیا کے ساتھ میل جول بڑھائے یا۔ قناعت، درویشی اور آدمیوں سے ترک تعلق کی تعلیم دے۔ بچے کو آبائی مسلک اختیار کرنے یعنے باپ کا جانشین بننے کے لئے تیار کرتے ہیں یا۔ اس کو اپنی اختیار کردہ راہ پر چلنے کے لئے کھلے بندوں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بچے کو اپنی زندگی خاندان کے مابین کتنے عرصے تک گزارنا پڑتا ہے۔ اور پھر الگ ہونے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ کس طریقے پر ملتے ہیں اور اُن میں کس طرح کی راہ و رسم رہتی ہے؟

(۱۰) خاندان کے عقائد اجتماعی، سیاسی اور ذہنی تربیت کے بارے میں کیا ہیں اور کن چیزوں کے ذریعے سے بچے کو اُن سے واقف کرانا چاہیئے مثلاً: آیا والدین بچے کو جس طریقے پر تربیت دینا چاہتے ہیں وہ آپ مستقل مزاج، صاحب فکر اور ہونہار ہو کر اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور کسی ایک کے فائدے کو اجتماعی اور قومی فائدوں پر مقدم رکھتا ہے

یا نہیں ، اسی طرح خاندان کے مذہبی اور سیاسی عقیدے، حکومت کے استقلال اور آزادی اور وطن کی خدمات اور اُس کے حقوق کے متعلق کیا ہیں، نیز اخلاقی تربیت سے وہ کیا مراد لیتا ہے، بشری احساسات میں کن کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ آیا اُس کی نظر میں دماغی قوی کی زیادہ قدر وقیمت ہے یا قلبی حیات کی، وہ بشری دنیا کے متعلق عموماً کیا عقیدہ رکھتا ہے، اپنے آپ کو بنی نوع کا خدمت گزار سمجھتا ہے یا نہیں۔ اُس کی نظر میں رُوحی اور اجتماعی توقعات اور فضائل و برکات کی راہ میں صداقت و فداکاری کی محبت کا احساس کیا قدر وقیمت رکھتا ہے، وہ اپنے ان تمام افکار و معتقدات کو کن ذرائع سے پرورش کرنا چاہتا ہے!

زندگی کے ان چند شرائط اور گھر کی تربیت کے اُن خاص خاص محرکات کے مطالعے سے، جو بچّوں کی آیندہ زندگی اور اُن کے اخلاق کے متعلق استعمال کیے جا سکتے ہیں، گھر کی تربیت کی اہمیت اور ذمّے داری کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے کہ قریب قریب اُس زمانے کے جب کہ بچّہ بڑا ہو کر مدرسے میں داخل ہوتا ہے یا۔ وُہ ابھی مدرسے نہ جا کر اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ خاندان کے آغوش سے اُترتے ہی اپنی راہ لیتا ہے، پھر اُس کی ممکنات کا تعین ہو جاتا ہے اور اُس کی آیندہ قسمت اس کے ماتھے پر لکھ دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے جن تمام امور کا، محرکات اور قوتوں کے زیر اثر ذکر کیا ہے، درآں حالے کہ بچّہ پیدا ہونے کے دن سے لے کر والدین سے جُدا ہونے کے دن تک اپنے والدین کے زیر سایہ پرورش پاتا ہے، ممکن ہی نہیں کہ وُہ اُن کو چھوڑ کر چلا جائے۔ اُس کی آیندہ قسمت ایک مقررہ و مخصوص قالب میں پڑی ہوئی ہے اور وہ سوائے تقدیر پر راضی رہنے کے کوئی علاج نہیں رکھتا، لیکن اس تقدیر کے تعین کا باعث والدین ہیں نہ کہ خدا!

اسی لحاظ سے، اگر ماں اس قدر ذکی، عقلمند اور صاحب ارادہ ہو، جو ان امور کو سمجھے اور فنِ تربیت کے قواعد کی اہمیت و ذمّے داری کی عظمت معلوم کرے تو اپنی اولاد کو اس طور پر تربیت دے گی، جو اُس کی اپنی زندگی ہی میں تندرست، اشراف،

صاحب عزم، سلیم الطبع، کارگذار، بے لوث اور زندہ دل افراد بن جائیں گے!

ہم یہاں جزئی امور سے بحث کرنا نہیں چاہتے البتہ یہ ثابت کرنے والے ہیں کہ ہم نے اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں ایسے کون سے کام اور محرکات ہیں، جو زیادہ مفید و مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں، چوں کہ ان مسائل کے متعلق ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالنے والے جواب نہیں دئے جا سکتے اس لئے آئندہ فصلوں میں تفصیل کے ساتھ ان مسائل پر بحث کی جائے گی۔ صرف ہم یہاں اس قدر ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب تک ہماری مائیں اور بیٹیاں صحیح تربیت کے فیض سے فائدہ نہیں اُٹھائیں گی ہم اپنی اس اجتماعی فریضے کی ذمے داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ لڑکیوں کو تربیت سے روک دینا، ایران ہو یا ہندوستان، نوع انسانی کی نسلوں کے ساتھ بڑی خیانت ہوگی۔ ہم بچوں کی خانگی تربیت کے شرائط کے باب میں تفصیلات کو داخل نہیں کر سکتے اور صرف چند نکات بچوں کے نفس کے حالات کی نسبت بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ مائیں، معلمیں اور سرپرست ہمیشہ اُن کو پیش نظر رکھ کر اُن کے میلانات کے بموجب عمل کریں اور یہ سمجھ رکھیں کہ بچوں کی تربیت کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی اولیں شرط اُن کے نفس کی حالتوں کا پتہ چلانا ہے۔ (باقی)

(ماخوذ از فارسی) از ابوالمحاسن محمد محسن خاں متین
(مدرس فارسی، وسطانیہ مستعد پورہ)

جدید روس میں تعلیم کا طریقہ

جدید روس کا مطالعہ آج ہمارے لئے مختلف حیثیتوں سے دلچسپی رکھتا ہے لیکن ایک ہندوستانی کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ اور مفید پہلو روس کی تعلیمی پالیسی، بالخصوص جہالت کے خلاف اس کے دلیرانہ جہاد کا اعلان ہے۔ بڑے بڑے زراعتی رقبے ہیں جن میں جاہل اور ان پڑھ کسانوں کی کثیر تعداد بستی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت آج ہمارے ہندوستان کی بھی ہے لیکن اس دشواری کا حل جو آج روس نے اپنے لئے سوچا ہے، وُہ ہمارے لئے ایک درسِ عبرت ہے۔

تعلیم کی اہمیت جدید روس کے اس مطالعے سے سب سے پہلا خیال جو ہمارے دِل میں پیدا ہوتا ہے وُہ یہ ہے کہ رُوسی لیڈروں اور اُن کے بڑے بڑے اشخاص نے نوجوانوں کی تعلیم پر کس درجہ زور دیا ہے۔ تمام دُنیا میں آج یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ سوسائٹی کی بہتر حالت بغیر تعلیم کے ناممکن ہے۔ رُوس کے بڑے بڑے اشخاص نے یہ طے کر لیا ہے کہ سوسائٹی کا مستقبل کیا ہونا چاہئیے اور انہیں مقاصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے عمل کرنا شروع کر دیا ہے انہوں نے اپنی توجہ کا سب سے بڑا حصّہ نوجوانوں کی تعلیم پر صرف کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کی قوم کے بہترین اشخاص نے اس کام کو اپنے ذمے لیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں جب کہ پیٹروگراڈ کے اندر خانہ جنگی کی آگ بھڑک رہی تھی اور ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ روسی تباہ ہو جائیں گے، انہوں نے صرف چند دنوں کے اندر اپنا تعلیمی پروگرام بنا کر شائع کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس دس سال کے اندر تمام ملک سے جہالت کو مٹا کر رہیں گے۔ یہ اُن کی صرف خواہش ہی خواہش نہ تھی۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر ایک پروگرام نہ صرف نوجوانوں کی تعلیم کا بلکہ اس جہالت کو دور کرنے کا بھی بنایا۔ لیکن اُنہیں اپنی اس کوشش میں پوری کامیابی نہ ہوئی بُقسمت ان کے خلاف تھی خانہ جنگی برابر جاری رہی۔ دُشمنوں کے محاصرہ نے ان کی حالت کو بہت قابل رحم بنا دیا

تاہم اگرچہ وہ جہالت کو بالکل نہ مٹا سکے پھر بھی اس دس سال کے اندر انہوں نے نہایت حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔

تعلیم کا زندگی سے لگاؤ | جدید روس کی تعلیم میں ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کے مدارس اور روزمرہ کے معاملات میں ایک گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ تعلیم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فضائے آسمانی میں ہو اور جس کا طالب علم کی زندگی یا بہ حیثیت شہری کے اس کی آئندہ زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ حقیقی تعلیم وہ ہے جو بچے کے ماحول اور گرد و پیش کے حالات و واقعات پر مبنی ہو اور جو اس کام کے لائق بنا دے، جسے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لہذا ایک مفید اور با معنی نصاب تعلیم تیار کرنے کی غرض سے وہاں کے ایک بڑے ماہر تعلیم نے سب سے پہلے صنعتی اور زرعی علاقوں کا ایک گہرا مطالعہ کیا نیز ہمیشہ اساتذہ پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے حالات زندگی سے پوری واقفیت اور لگاؤ رکھیں تاکہ نصاب تعلیم ان ضروریات سے ہٹنے نہ پائے۔

مختلف ذرائع تعلیم | اس غرض کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو جمہوریہ روس میں اقوام اور زبانوں کا اس سے کہیں زیادہ اختلاف ہے جتنا کہ ہندوستان میں ہے۔ لیکن باوجود مشکلات کے اُصول میں سر مو فرق نہیں آیا ہے۔ جمہوریہ کے ماتحت جتنے مدارس ہیں، اُن میں ہر زبان بولنے والی جماعت اپنی زبان استعمال کرتی ہے بعض صورتوں میں ایسا بھی ہے کہ ایک ہی شہر کے مختلف اسکولوں میں ذریعہ تعلیم مختلف ہے۔ کوشش اس امر کی کی جاتی ہے کہ ہر حصے کی مقامی زبان ترقی کرے۔ مختلف صوبوں کے سرکاری کام مختلف زبانوں میں ہوتے ہیں۔ سرکاری اخبارات اور کتابیں ان زبانوں میں شائع ہوتی ہیں۔ لینن گراڈ اور ماسکو وغیرہ میں اُستادوں کے علاوہ ان زبانوں کے سکھانے کی غرض سے متعدد مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ اس قسم کے مدارس کی تعداد اس وقت تک ۴۵ ہے بڑی بڑی یونیورسٹیاں ان قلیل التعداد جماعتوں کی زبانوں کے لئے مستقل انتظام رکھتی ہیں۔ روس میں اقلیتوں کی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کی

یہ خواہش اس درجہ ترقی پر ہے کہ جن حصوں میں صرف بولیاں تھیں اور ان کا کوئی خاص رسم خط نہ تھا، اُن کے لئے نئے نئے رسم خط ایجاد کئے گئے ہیں۔ جب ہم ماسکو کا محکمہ تعلیم دیکھنے گئے تو ہمیں بہت سی ایسی درسی کتابیں دکھائی گئیں جو مختلف رسوم خط میں تھیں اور ان میں سے بعض رسم خط عربی سے ملتے جلتے تھے اور باقی ایسے تھے جسے ہم بالکل ہی نہیں پہچان سکتے تھے۔

اقلیتوں کے تہذیب و تمدن کی حفاظت کا حکومت کہاں تک خیال رکھتی ہے، اس کا بہترین اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ سائبیریا کے علاقہ ارکٹسک میں ایک چھوٹی سی قوم ہے جس کا نام "کیر اگاس" ہے اور جس کی مجموعی تعداد مع کمسن بچوں کے (۴۰۵) ہے۔ یہ لوگ ایک قسم کی ترکی زبان بولتے ہیں اور خانہ بدوشوں کی طرح رہتے ہیں جن کا ذریعہ معاش صرف شکار ہے لیکن حکومت نے اس جماعت کے بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے اور ایک خاص اسکول اس غرض کے لئے کھولا ہے۔ یہ اسکول صرف جاڑوں کے موسم بھر جاری رہتا ہے اس لئے کہ گرمی میں بچے اپنے والدین کے ساتھ ادھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسری قوم "جیپسی" کی ہے جن کے لئے تین مدارس ہیں۔ ان میں کوشش اس بات کی کی جا رہی ہے کہ ان کے لئے لفظوں کے ہجے کا باقاعدہ اُصول بنا دیا جائے لیکن دقت یہ ہے کہ ان کے پاس حروف ہجے نہیں ہیں۔ اسی طرح پچاسوں اور دوسری قلیل التعداد جماعتیں ہیں جن کی زبان و تہذیب کے تحفظ کا حکومت پورا پورا خیال رکھتی ہے۔

اسی زمانہ میں لینن گراڈ کی مجلس سائنس نے بدھ تہذیب کی تحقیق و مطالعہ کے لئے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ ادارہ بدھ مذہب پر ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہا ہے اور عنقریب بدھ تمدن کی تحقیق و مطالعہ کے لئے ایک بین الملی کانفرنس بھی منعقد ہونے والی ہے۔

یہ معلوم کر کے بھی دلچسپی ہوگی کہ جمہوریہ کی بعض ریاستوں میں ان عورتوں نے جو اب تک پردہ میں رہا کرتی تھیں، بہ حیثیت معلمہ کے مدارس میں تعلیم دینے کا کام شروع کر دیا ہے۔

تعلیم عوام کے لئے نظام ایک تیسری سب سے بڑی خصوصیت روس کی تعلیم کی یہ ہے کہ اس کا تمام نظام تعلیم عوام کے لئے ہے۔ اکثر ممالک میں بہترین قسم کی تعلیم اُن خوش حال لوگوں کے بچوں کی ہوتی ہے جو اپنے خاص مدارس رکھتے ہیں۔ لیکن روس میں اس قسم کی تعلیم سے ہر شخص کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی اصل بنیاد اس اصول پر ہے کہ تعلیم اجتماعی اور اشتراکی ہونی چاہیئے یعنی یہ کہ اصل غرض انفرادی طور پر صرف حصول علم اور کسب کمال ہی نہیں ہے بلکہ دوسروں کو دینے اور اُن سے لینے کی صلاحیت پیدا کرنی ہے۔

عام اور مفت تعلیم سب سے پہلے احکام جو حکومت نے تعلیم کے متعلق نافذ کئے وہ اسکولوں کے کلیسا سے علیٰحدہ کئے جانے، لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دیے جانے اور غیر روسی قومیتوں کو اپنی زبانوں کے مدارس قائم کرنے کے متعلق تھے۔ یہ اصول بھی رکھا گیا کہ اسکول میں داخل کئے جانے سے پیشتر تین سال سے لے کر سات سال تک اور پھر اُس کے بعد آٹھ سال سے بارہ سال تک ابتدائی تعلیم، تیرہ سال سے سولہ سال تک ثانوی تعلیم یہ سب مفت، لازمی اور عام ہونی چاہیئے۔ اور اس کے علاوہ یہ بھی قرار پایا کہ ہر روسی شہری اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ پندرہ سولہ سال تک تمام بچوں کی تعلیم کا دینا خاندان کا نہیں بلکہ ریاست کا فرض ہے۔

شیر خوار بچوں کی تعلیم اس بنا پر تعلیم تین ہی سال سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل بچہ محکمہ حفظان صحت کی ذمہ داری میں ہوتا ہے۔ ایسی کام کرنے والی عورتیں جو حاملہ ہوتی ہیں، انہیں وضع حمل سے تین چار روز قبل اور بعد تمام کام سے بری کر دیا جاتا ہے اور پوری اُجرت دی جاتی ہے۔ انہیں بوقت ضرورت ہر طرح کی طبی امداد بھی بہم پہونچائی جاتی ہے۔ بچہ ہونے کے بعد بھی دوران کام میں انہیں کافی وقت دیا جاتا ہے کہ وہ بچہ کی اچھی طرح سے خبر گیری کر سکیں۔ ہر کارخانہ اور ٹریڈ یونین اس غرض کے لئے کچھ نہ کچھ مالی امداد دیتا ہے جس سے شیر خوار بچوں کی تربیت کے لئے اسکول، کنڈر گارٹن اور دوسرے کھیل کود کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ بچوں کو اسکول میں

داخل کئے جانے سے پیشتر اُن کی صحت وصفائی، غذا و آسائش پر خاص توجہ رکھی جاتی ہے اور ان کی تعلیم کے نصاب میں کھیل اور قصّے کہانیاں تفریحی مجلسیں اموسیقی اور ڈرامے بھی داخل سمجھے جاتے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں کے اندر اس قسم کے تقریباً دس ہزار اسکول کھولے گئے ہیں جو پھر بھی ملک کی وسیع ضروریات کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔

بالغوں کی تعلیم کے لئے ٹریڈ یونین بھی اپنی آمدنی کا دس فیصدی دیتی ہیں اور مالکان کارخانہ سے بھی ایک معاہدہ اس قسم کا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ مجموعی اُجرت کا ایک فیصدی اس فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔

صحت کا خیال | ابتدائی اور ثانوی تعلیم ایک ساتھ دی جاتی ہے اور ایسے اسکول کو یونی فائیڈ لیبر اُسکول، کہتے ہیں۔ اس کے دو حصّے ہوتے ہیں، پہلی منزل اور دُوسری منزل، پورا کورس سات سال سے نو سال تک ہوتا ہے۔ اس اسکول کی بعض خاص خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں مثلاً داخلہ کا کوئی امتحان نہیں ہوتا اور ترقی سال بھر کا کام دیکھ کر دی جاتی ہے جس کا اندازہ ہر جماعت کے مجموعی کام کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ تمام اسکولوں میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد طبی معائنے بھی ہوتے ہیں اور ہر لڑکے پر الگ الگ توجہ کی جاتی ہے۔ جو لڑکا کمزور ہوتا ہے اُس سے زیادہ کام نہیں لیتے جن لڑکوں کی نگاہیں کمزور ہوتی ہیں۔ ان کو اگلی صف میں بٹھایا جاتا ہے تعلیم میں عام طور سے ڈیلٹن کا طریقہ رکھا گیا ہے جس میں لکچروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حکمرانی کی تعلیم | طلبہ کو حکومت کرنے کا طریقہ سکھانے کے لئے خاص خیال رکھا جاتا ہے اچنانچہ اس غرض کے لئے اُن کی انجمنیں ہیں۔ خود اُسکول کا نظام اوقات بنانے میں طلبہ کا کافی حصہ ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک مدارس کا تعلق ہے لینن کی بیوی کروپسکایا کا خیال ہے کہ "طلبہ کی حکومت خود اختیاری بڑے لوگوں کی زندگی کا نمونہ نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ بچوں کی زندگی میں جماعتی کشمکش یا جماعتی تفوق نہیں چل سکتا۔ اسکول آئندہ سوسائٹی کا ایک نمونہ ہے جس میں جماعتیں نہیں ہوں گی"۔

بغیر کتابوں کے تعلیم | تفریحی مشاغل کا طریقہ اِن اسکولوں میں بہت عام ہے۔ اس کی

ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ ابتداءً ان کے پاس کتابیں اور دوسرے ضروری سامان پورے نہ تھے چنانچہ اب بھی طلبہ کو بڑی بڑی ٹولیوں میں عجائب خانوں، تاریخی جگہوں، تصویر خانوں اور قدرتی مناظر کی سیر کرانے کی غرض سے لے جایا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ تفریحی سفر دور دور جگہوں کے ہوتے ہیں اور اگر سرمایہ کافی نہیں ہوتا تو راستہ میں روپیہ پیدا کرنے کی تدبیر کی جاتی ہیں۔

ایک عجیب طریقہ | تعلیم کا ایک اور خاص طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک چیز لے لی جاتی ہے۔ اور اسی کے گرد و پیش تمام توجہ رکھی جاتی ہے، مثلاً گاؤں کو لے لیا تو گاؤں کی زندگی، فصلیں اور پیداوار، گاؤں والوں کی صحت و صفائی اور ان کی معاشرتی زندگی وہاں کی مقامی تجارت، گاؤں اور شہر کا باہمی تعلق، دیہاتی زندگی کے نقائص، اُن کے اسباب اور طریقہ علاج گاؤں کی حکومت اور گاؤں کی ترقی کے لئے دوسرے لوگوں کے اتحاد عمل کی ضرورت، غرض گاؤں سے متعلق تمام مسائل ہوتے ہیں جن پر توجہ کی جاتی ہے اس سلسلہ میں تمام طلبہ کو دیہاتوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور ان کے جو جو خیالات ہوتے ہیں، ان کو عمل میں لانے کا یہ ایک بہترین موقع ہوتا ہے۔

اسی طرح صحت کو لیجئے تو اس سلسلہ میں انفرادی، خانگی اور قومی ہر قسم کی صحت پر غور و فکر کیا جاتا ہے، اور طلبہ پر یہ زور ڈالا جاتا ہے کہ افراد کی اور خاندان کی صحت کا بہت کچھ دار و مدار قوم کی صحت پر منحصر ہے جسم، غذا اور ہاضمہ وغیرہ سے متعلق جملہ مسائل پر بحث کی جاتی ہے اور شراب و دیگر منشیات کے نقصانات طلبہ کو بتائے جاتے ہیں۔

ان مسائل کے لئے مختلف تعلیمی پروگرام استاد کے نام سے شائع کئے جاتے ہیں نیز اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ صرف ان کی عام ہدایت کے لئے ہیں۔ اس سے زیادہ مفصّل پروگرام انہیں خود دوسرے اساتذہ اور طلبہ کے مشورہ سے بنانا ہے۔ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ مصنوعی میلانات پیدا کرنے یا صرف پند و وعظ سنانے سے حتی الوسع احتراز کیا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے، طلبہ میں خود یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنے نتائج آپ نکال سکیں۔

اسکولوں پر اپنے قرب وجوار کے ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے اور یہی ماحول ان کے لئے معمل یا دار التجربہ کا کام دیتا ہے۔ دیہاتوں میں تو یہی زندگی کا اثر غالب رہتا ہے۔ اگر کوئی اسکول کسی کارخانہ کے قریب واقع ہے تو اس کارخانہ کا اس پر بہت اثر نظر آئے گا اور جغرافیہ، سائنس، حساب اور دوسرے ایسے مضامین پڑھائے جائیں گے جن کا کارخانہ میں بہت کام پڑتا ہو۔

شہری علاقوں میں تو تعلیم بالکل عام کر دی گئی ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ کاشتکاروں نے تعلیم کے عام کرنے کی طرف بہت کچھ دلچسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے اور بعض مقامات پر انہوں نے خود مدارس قائم کئے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اوسطاً کاشتکاروں کے بچے شہر کے بچوں سے زیادہ ذہین اور تیز ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کا قدرت سے زیادہ قریبی تعلق ہوتا ہے اور ان کی اس قدرتی ترقی میں ان کا نصاب تعلیم مزید معاون ہوتا ہے۔

روس کے بعض حصوں میں زمین اتنی زرخیز نہیں ہے جس سے کسانوں کی گزران ہو سکے لہذا ایسی صورت میں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی اور کام کریں۔ یہ کام سب سے زیادہ بننے تننے کا ہے اور گھر کے کچھ آدمی جن میں بچے بھی شامل رہتے ہیں برابر معمولی کرگھوں پر بننے کا کام کرتے ہیں۔

گاؤں کی تعلیم کا کسی قدر اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں تمام گاؤں کے اندر (۲۸۰۰) لیٹر بکس تھے لیکن ۱۹۲۶ء میں ان کی تعداد (۶۴۰۰) ہو گئی جو دورہ کرنے والے ڈاک خانوں کے لیٹر بکسوں کے علاوہ ہے۔ ان دورہ کرنے والے ڈاک خانوں کے کوچبان زراعتی معلومات کی چیزیں بھی تقسیم کرتے ہیں۔ ایک کسانوں کا اخبار جو ۱۹۲۳ء میں نکلنا شروع ہوا تھا، اس کی اشاعت اس وقت دس لاکھ ہے اور اس میں کسانوں سے متعلق ہر قسم کے معلومات سے بحث کی جاتی ہے ہزاروں خطوط اس اخبار کے نام آتے ہیں جن میں مختلف نوعیت کے استفسارات، حکام کے متعلق شکایات اور دوسرے

امور درج ہوتے ہیں۔ ان شکایات کی باقاعدہ تفتیش ہوتی ہے اور ضرورت ہوتی ہے تو
ان پر مناسب کارروائی بھی کی جاتی ہے۔

(ماخوذ از ہمدرد دہلی)

صوبہ گلبرگہ شریف میں سیر مقامات

(۱)

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کی پہلی سالانہ کانفرنس میں، سیر و تفریح پر انگریزی اور اردو میں مبسوط
تقریریں ہوئیں اور ایک پروگرام بھی پیش کیا گیا تھا کہ حیدر آباد کے طلبہ کن کن تاریخی اور تفریحی مقامات
کو بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ کے مسائل کس طرح مفید طریقے پر سمجھائے
جا سکتے ہیں۔ چنانچہ مدارس بلدہ میں اکثر پروگرام کے مطابق عمل کیا گیا اور سفر ایلورہ اور سیر
گول کنڈہ کے عنوان سے "ٹیچر" کی پچھلی اشاعتوں میں مضامین بھی چھپ چکے ہیں۔ ہماری
انجمن کے سرگرم ممبر مولوی عبد السلام صاحب ناظر مدارس و معتمد انجمن اساتذہ صوبہ گلبرگہ نے،
جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، "المعلم" ۱۳۳۷ف کے ایک نمبر میں اسی بحث پر مضمون لکھنے
کا وعدہ کیا تھا، جو اب پورا فرمایا ہے۔ ہم ذیل میں موصوف کا فراہم کیا ہوا مواد درج کرتے
ہیں۔ یہ سب واقعات نو سال پہلے کے ہیں! مگر بقول لائق مقالہ نگار اس سے ایک طرف
تحریک کی قدامت اور گزشتہ کام کا ظاہر کرنا مقصود ہے تو دوسری طرف تاریخی واقعات
کی اشاعت کے ساتھ، اُس کی حفاظت مدنظر ہے۔ تیسرے ان دونوں سے اہم منشا یہ
ہے کہ آئندہ عمل کے لئے مدارس میں تازہ شوق اور حرکت پیدا ہو۔

(شریک مدیر)

(۱) **شوراپور** | قصبہ شوراپور ایک پہاڑی مقام ہے۔ پہاڑوں کا سلسلہ مشرق و مغرب میں
چار میل تک چلا گیا ہے۔ پہاڑ کے مختلف مقامات میں متعدد کھنڈر پائے
جاتے ہیں اور شمال و جنوب میں پہاڑوں پر دو قلعے بنے ہوئے ہیں، جن کے درمیان ایک
تالاب ہے، اس کا بند ان دونوں کو ملاتا ہے اور اُس کے اوپر سے دونوں میں آمد و رفت

ہوتی ہے۔ ان قلعوں کے دامن اور تالاب کے بائیں جانب جنوب و مغرب میں ایک موضع ہے، جس کا نام داگن گیرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں جب کہ شوراپور موجودہ مقام پر آباد نہیں ہوا تھا، یہ مقام قدیم راجگان بیڈر کا جائے پناہ و سکونت گاہ تھا۔

نیا قلعہ جو دوسرے پہاڑ پر ہے اُس کی عمارت شاندار و قابل دید ہے۔ اُس کی فصیل سنگیں اور نہایت پختہ ہے۔ اس قلعے کے درمیان میں ایک بہت بڑا پتھر ہے جس کے اوپر ایک چھوٹی سی مسجد ہے گویا اس قلعے کی تخت گاہ یا بالاحصار ہے۔ اس میں کئی تہ خانے اور دو فصیلیں ہیں۔ ایک بیرونی اور دوسری اندرونی۔ بیرونی فصیل نہایت پختہ و مضبوط ہے اور اس کے پتھر نہایت عمدہ تراشے ہوئے ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حال میں یہ بنی ہے۔ بیرونی فصیل کے دروازے کے باہر ایک شاہ نشین گنبد نما ہے۔ یہاں سے قلعے کی سیڑھیاں جو داگن گیرہ یا دوسرے قلعے کو جانے کی شروع ہوتی ہیں تالاب کے بند تک چلی گئی ہیں۔ یہ بھی تراشے ہوئے پتھر کی ہیں۔ اُن کی کشادگی و پختگی کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ باوصف ویرانی قلعہ یہ ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ جیسے حال ہی میں بنی ہوں۔ اس قلعے پر کھڑے ہو کر مغرب و شمال کی جانب فصل ربیع و خریف کے موسم میں نظارہ کیا ہی بھلا ہے! کئی میل تک ہرے بھرے کشت زار کو دیکھ کر بے حد فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ان مقامات سے تاریخی حالات راجگان شوراپور اور فصیل، برج، خندق، تخت، کھنڈرات، پرانا شہر، شاہ راہ، مواقع مورچہ بندی، شاہ نشین، تہ خانہ، دروازۂ شہر، مینار، میگزین، چھاؤنی وغیرہ کے نمونہ جات معلوم ہوتے ہیں۔ شوراپور سے قلعہ داگن گیرہ تک اثنائے راہ میں، جو تین چار میل کا فاصلہ ہے، تمام جغرافی اصطلاحات کے نمونے جیسے سلسلہ کوہ، جھیل، چوٹی اور دامن کوہ وغیرہ مشاہدے میں آتے ہیں۔ علاوہ اس کے نباتات سے جھڑبیری اور درختوں کے جھنڈ وغیرہ بھی بخوبی مشاہدہ کرائے جا سکتے ہیں۔ مدرسہ ہذا کے طلبہ نے بمعیت اساتذہ صاحبان، بہمن ۲۹ ف کو ان تمام مقامات کی سیر کی۔ اثنائے راہ میں جاتے اور آتے ہوئے طلبہ ترانۂ حمد گاتے رہے۔

ہم سب شام کے (۸) بجے شوراپور واپس ہوئے۔

(منقول از مراسلہ مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شوراپور)

(۲) لاتور | بتاریخ ۲۸؍امرداد ۱۳۲۹ ف بروز شنبہ بہ نگرانی سید غلام محمود صاحب و وتارجی رائو صاحب جماعت ہائے تھرڈ فارم (الف اور ب) سکنڈ فارم و فرسٹ فارم کو سیر مقامات اور قدرتی مناظر دکھانے کے لئے ۹؍ بجے صبح روانہ کیا گیا۔ مددگار صاحبان کور کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ طلبہ کو پہلے راؤجی نانچند صاحب ساہو کی گڑنی بتائی گئی جس میں برہما پرپس و پمپ اور باغ میں قدرتی نظاروں کا ملاحظہ کرا گیا۔ بعد ازاں کھوری باغ دکھایا گیا اور اس کی وجہ تسمیہ بتائی گئی۔ وہاں سے ٹیلے پر چڑھنے کے بعد میدان اور ٹیلے کی ہوا کا فرق اور حرکت و گرد و غبار کے اٹھنے کی وجہ بیان کی گئی۔ اس کے بعد ریل کی سڑک پر سے گذرتے ہوئے پٹریوں کے درمیان جو کسی قدر فاصلہ ہوتا ہے اس کا سبب اور سگنل کا مقصد اور فوائد بیان کئے گئے اور شنٹنگ کی حد بھی بتائی گئی۔ اسٹیشن میں جانے کے بعد ریل ایک پٹری سے دوسری پٹری پر کس طرح جاتی ہے یہ بھی بتایا گیا۔ ٹرالی کے فوائد اور اس کے چلانے اور روکنے کا طریقہ ٹرالی کو چلا کر اور اس پر طلبہ کو بٹھا کر ان کے ذہن نشین کیا گیا۔ وہاں سے قریب (۱۱) بجے واپسی عمل میں آئی اور طلبہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ آج کی سیر کے حالات مختصر طور پر نوٹ کر کے لائیں۔

(منقول از مراسلہ عبدالرشید صاحب بی۔اے (علیگ) صدر مدرس وسطانیہ لاتور حال مہتمم تعلیمات ورنگل۔)

(۳) کوہیر | مدرسہ ہذا کے طلبہ کو بتاریخ ۹؍اسفندار ۱۳۲۹ف زیارت گاہ حضرت مولانا معزالدین صاحب ترک قدس سرہ کی سیر کرائی گئی، جس کے ذریعہ طلبہ کو معلوم کرایا گیا کہ دنیا بے ثبات ہے۔ یہاں جو شخص تعلیم میں کوشش کرتا ہے اور اس سے مستفید ہو کر نیک اعمال کے ساتھ رحلت کرتا ہے تو اس کو بقائے نام اور شہرت دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا قدس سرہ العزیز کو رحلت فرما کر قریب آٹھ سو برس کا زمانہ ہوتا ہے مگر حضرت کا نام زندہ جاوید ہے۔

(منقول از مراسلہ مولوی فاضل حافظ فضل احمد صاحب صدر مدرس مدرسۂ وسطانیہ کوہیر)

(۴) یادگیر | ۱۴؍ادے ۱۳۲۹ف کو مدرسہ ہذا کے طلبہ کو قلعہ یادگیر کی سیر بہ ہمراہی مولوی

عبداللہ صاحب کرائی گئی اور اگلے لوگوں کی ہمت، فن تعمیر اور تاریخی واقعات طلبہ کو بتلائے اور سمجھائے گئے۔ ماہ بہمن میں دریائے بھیما کی سیر کرائی گئی اور ماہ آئندہ میں گلبرگہ شریف کی سیر کرائی جائے گی، جہاں ایک ایک ولی کی درگاہ شریف ہے اور ایک خوبصورت مسجد قابل دید ہے۔ اس میں پتھر کا کام نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔

(منقول از مراسلہ مولوی عالم محمد اسرار الرحمن صاحب صدیقی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ یادگیر مال گرشکال۔)

(۵) تلجاپور | مدرسہ ہٰذا کے طلبہ کو ایک مشہور تاریخی مقام جو گھاٹ شیل کے نام سے موسوم ہے اور اندرون میل ہے سیر کرائی گئی۔ اس کے علاوہ اور ایک مشہور مقدس تیرتھ کی، جو مدگلشور کے نام سے موسوم ہے اور تلجاپور سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے، سیر کرائی گئی۔

(منقول از مراسلہ بی۔ وی۔ آپٹے (آنجہانی) صدر مدرس وسطانیہ تلجاپور)

(۶) نیلنگہ | بتاریخ ۳ فروردی ۱۳۲۹ف طلبہ مدرسہ ہٰذا کو حضرت پیر بادشاہ صاحب قادری کے گنبد کی سیر کرائی گئی اور گنبد مذکور کی نسبت تاریخی واقعات بتلائے گئے اور اطراف واکناف کی چیزوں کا خود مشاہدہ کرکے معلومات حاصل کرنے کا شوق دلایا گیا۔

سیر طلبہ کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے اس کی رو سے آئندہ بھی عمل ہوگا۔

(منقول از مراسلہ زین گوبند راؤ صاحب (آنجہانی) صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ نیلنگہ)

(۷) شاہ پور | بتاریخ ۲۲ اسفندار ۱۳۲۹ف بمعیت مولوی ولائت حسین صاحب اول مددگار مدرسہ ہٰذا جملہ طلبہ جماعت مڈل کو بغرض سیر قلعہ شاہ پور بھیجا گیا۔ قلعے کے تاریخی واقعات سے واقف کرایا گیا۔ اس کے بعد اور دوسرے مشہور مقامات کی سیر کرتے ہوئے اسی روز شام کو واپس ہوئے۔

(منقول از مراسلہ جی۔ ستارائڈو صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ پور)

مرتبہ محمد عبد السلام صاحب
معتمد انجمن اساتذہ صوبہ گلبرگہ شریف۔

ایڈیٹوریل

خطبۂ صدارت پنڈت ہردے ناتھ کنزرو ایم۔ ایل۔ اے

رعایائے حیدرآباد دکن کی تعلیمی کانفرنس کا پہلا اجلاس بتاریخ ۵ء اکتوبر ۱۹۳۸ء زیر صدارت پنڈت ہردے ناتھ کنزرو رکن جمعیتہ مقننۂ احاطہ بمبئی وی ویک دردھنی تھیٹر میں منعقد ہوا۔

موصوف کا پُراز معلومات صدارتی خطبہ مختلف حیثیتوں سے اہمیت رکھتا ہے، جو یقین ہے کہ ارباب حل و عقد کی توجہ اپنی طرف جذب کرے۔ ابتداً پنڈت جی نے تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا کہ اس کا تعلق جس قدر حکومت سے ہے اسی قدر رعایا سے بھی۔ ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ حکومت اور رعایا دونوں دلچسپی لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت دُنیا کی متعدد درس گاہیں پبلک کے سرمایہ سے چلائی جارہی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی قوم میں ہمدرد دل پہلو میں رکھنے والے افراد پیدا نہیں ہوئے، جو تعلیم جیسے اہم کام میں اپنا روپیہ صرف کریں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ایسی گنتی کی درس گاہیں ملیں گی، جو پبلک کے طرف سے قائم کی گئی ہیں اور یہ اَب بھی بالکلیہ سرکاری امداد سے مستغنی نہیں ہیں۔ وہ دن مُبارک ہوگا جب کہ ہمارے رؤسا اور متمول افراد فراخ دِلی اور معارف پرستی کا ثبوت دیں گے۔

پنڈت جی کے اس بیان کی نسبت، کہ پرائمری تعلیم پر اور دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کی طرح یہاں بھی زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے اور جو قانون خانگی مدارس کے قیام سے متعلق نافذ کیا گیا ہے، وہ تعلیم کو عام کرنے میں مانع ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ریاست بھر کے مدارس تحتانیہ میں جو تعلیم مفت ہے، وہ کوئی معمولی بات نہیں جبری تعلیم کے اصول بھی طے ہو چکے ہیں؛ وہ وقت قریب ہے کہ ابتدائی تعلیم جبری کر دی جائے گی اور موجودہ کی بہ نسبت زیادہ رُوپیہ صرف ہوگا۔ خانگی مدارس کا قانون، جو گشتی کی حیثیت رکھتا ہے بادی النظر میں مانع معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قانون کے اجراء کی اس وجہ سے ضرورت تھی کہ عام طور پر خانگی مدارس، خصوصاً اضلاع میں، فطرت اور اصولِ تعلیم کے خلاف

بچے، اُن کا قیام حد درجہ گندہ ماحول اور تیرہ و تار عمارتوں میں تھا جو بلاشبہ بچوں کے جسمانی اور دماغی نشو و نما کے لئے تباہ کن تھے۔ اس امر کی ضرورت تھی کہ ان مدارس کی نگرانی ذمہ دار ہاتھوں میں دی جائے تاکہ معلم اور متعلم کچھ تو جدید طریقوں سے باخبر رہیں اور فائدہ اٹھائیں سرکاری قانون کے نفاذ کا یہ منشا ہے کہ ملک میں تعلیم حقیقی معنوں میں منضبط طریقہ پر ہو اور حکومت کے خلاف یا فرقہ وارانہ جذبات نہ پیدا ہونے پائیں۔ ویسے جس قدر بھی مدارس پبلک کی طرف سے قائم کئے جائیں، قابل مبارکباد ہیں اور ہر حالت میں پبلک کی مساعی نظر استحسان سے دیکھی جانے کے لائق ہوں گی۔ لہذا اس قسم کا خیال رکھنا کہ سرکاری قانون تعلیم میں موانعات پیدا کر رہے ہیں، غلط فہمی میں پڑنا ہے۔

تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت جتاتے ہوئے، پنڈت جی نے اُس کی اشاعت کی زور کے ساتھ حمایت کی اور کہا کہ پردہ چاہے رہے، یا نہ رہے، بہر حال تعلیم کی بے حد ضرورت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اسکول جانے والی عمر کی لڑکیوں میں صرف (۵) فی صدی تعلیم سے مستفید ہو رہی ہیں باقی تعلیم سے بے بہرہ ہیں، جن سے نہ بچوں کی تعلیم اور نہ تربیت ہی ہو سکتی ہے، بے شمار بچے اُن کی لاعلمی سے چھ مہینے کے اندر ہی موت کی نذر ہو رہے ہیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کا رنامہ کچھ زیادہ شاندار نہ ہوگا۔ ہمارے لئے ایک ایشیائی ملک یعنی افغانستان کی مثال قابل تقلید ہے۔

قابل صدر نے تعلیم بالغان کی ضرورت کا بھی اظہار فرمایا۔ اس کے متعلق حیدرآباد ٹیچر کی پچھلی اشاعتوں میں مختلف مضامین آچکے ہیں۔ ملک سے جہالت کو دور کرنے کے لئے پرائمری تعلیم کافی نہیں ہے اور بالغ العمر اشخاص کی تعلیم کا بھی انتظام ضروری ہے تاکہ خواندہ افراد کی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو اور جن اشخاص نے محض ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے، وہ نسیاً منسیاً نہ ہو جائے۔

مذہبی تعلیم کے متعلق صدر موصوف نے رائے دی کہ یہ صرف والدین کی مرضی پر ہی چھوڑ دینا چاہئے اور مدارس میں مطلق اس کی تعلیم نہ ہو۔ بلکہ اُستاد کے نیک نمونے

سے اخلاق کی اصلاح کی جائے۔ اسی قسم کے خیالات، مسٹر واڈیا پروفیسر جامعِ میسور نے آل انڈیا فڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن کے دوسرے سالانہ[1] جلسے میں جو اُس کے صدر تھے ظاہر کئے تھے مگر یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ پروفیسر موصوف کے خیالات کی توثیق کانفرنس مذکور نے نہیں کی؛ کیونکہ بجائے مسٹر واڈیا کے تجاویز پر عمل کرنے کے یہ قرارداد شد و مد کے ساتھ منظور ہوئی کہ اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اختلاف تہذیب و مذہب اور خاص خاص روایات کے اثرات ہیں اور آئے دن کے فرقہ وارانہ جھگڑوں سے روز بروز تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو رہی ہے، اس لئے بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر ہندوستانی یہ تصور کرے کہ وہ بجائے کسی فرقے کا فرد ہونے کے اپنے محبوب ترین وطن یعنی ہندوستان کا فرد ہے لہذا مذہبی تعلیم، قومی اور روحانی نقطۂ نظر سے بہت کچھ نزاکت رکھتی ہے۔ لیکن یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آیا ماں اُبنسبت مدرسے کی تعلیم کے گھر پر بہتر تعلیم دے سکتی ہے، خصوصاً ہندوستان میں، جہاں تعلیم نسوان کا فقدان ہے جس کے لئے ایک عرصے سے چیخ پکار ہو رہی ہے۔ اگر غیر متعصب اساتذہ اپنے مذہب کی طرح دوسرے مذاہب کا بھی احترام قائم رکھتے ہوئے تعلیم دیں تو قومی اتحاد میں خلل واقع ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ملک میں ایسے مدرسین کی کمی ہے۔

اخیر میں پنڈت جی نے زبان کے مسئلے پر مُدلّل، دلچسپ اور نئے خیالات ظاہر کئے اور اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہی وہ چیز ہے، جس کے ذریعے سے موجودہ مُنافرت دُور کی جا سکتی ہے اور ہم آپس میں متحد ہو سکتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے ملک میں اگر کسی زبان کو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار کہا جا سکتا ہے تو وہ اُردو ہے اور اُس کے تمام اجزا ہندو مسلم اشتراک کا صاف مظہر ہونے کے علاوہ

---

[1] اِس جلسے کی روداد حیدرآباد ٹیچر کی جلد (۱) نمبر (۴) میں پیش کی جا چکی ہے۔ مولوی سید علی اکبر صاحب، ایم۔ اے۔ صدر انجمن اساتذہ نے جو انجمن مذکور کی طرف سے بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے تھے، مذہبی تعلیم کے عنوان پر روشنی ڈالی ہے۔

اُسے ہندوستان میں سب سے زیادہ وسعت اور اثر حاصل ہے۔

صدر موصوف کا خطبہ پورے ایک گھنٹے میں ختم ہوا جو بلحاظ فصاحت و معلومات خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور ملکی ضروریات کے مختلف مسائل پر حاوی ہے اس میں بیشتر اُن مسائل پر بحث کی گئی ہے، جو ہندوستان کے ماہرین تعلیم کو آج کل اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہیں؛ مگر ایک چیز، جس کی جھلک سارے خطبے میں موجود تھی وہ قومی اتحاد کا مبارک خیال تھا۔

خبریں اور نوٹ

ترکی محکمۂ ورزش کا منشا ہے کہ جرمنی ورزشوں اور کھیلوں کو اپنے ہاں رواج دے۔ چنانچہ سلیم بے معتمد ورزش برلن بھیجے گئے ہیں تاکہ وہاں کے طریقے معلوم کرکے رائج کریں۔

خوشی کی بات ہے کہ جبری تعلیم کو رواج دینے کا رجحان پایا جا رہا ہے۔ حال ہی میں ہاپڑ میونسپلٹی کے حدود میں جبری تعلیم کی منظوری دے دی گئی۔ اب صوبہ جات متحدہ میں ان میونسپلٹیوں کی تعداد ۳۲ ہے۔

سر حبیب اللہ تین سال کے لئے دہلی یونیورسٹی کے پرو چانسلر مقرر ہوئے ہیں۔

اندھرا میں (۲۱۶) کتب خانے ہیں، جن کا سارا انتظام عورتیں کرتی ہیں۔

مدرسہ وسطانیہ نارائن پیٹھ کے اسٹاف کی خواہش پر مسٹر بھال چندر راؤ صاحب بی۔اے، بی۔ٹی صدر مدرسہ مذکور اطلاع دیتے ہیں کہ مسٹر سید محمد جواد بی۔اے۔بی۔ٹی مہتمم تعلیمات نے ۵-۶ اور ۷ آبان ۱۳۵۱ف کو مدارس نارائن پیٹھ کا معائنہ بکمال شفقت اور دلچسپی فرمایا۔ بعد ختم معائنہ زیر صدارت مہتمم صاحب موصوف ایک جلسہ ترتیب دیا گیا، جس میں بچوں نے شاہی ترانہ گایا۔ نرسملو صاحب اور محمد خاں صاحب مددگاران مدرسہ نے مدحیہ نظمیں پڑھیں اور مدرسے کے نظم و نسق پر تقریریں ہوئیں مولوی رشید الدین صاحب مواج نے خاص طور پر حصہ لیا۔ صدر جلسہ نے اختتامی تقریر کرتے ہوئے مدرسے کے کام پر اظہار پسندیدگی کیا، جس کے بعد ڈرل کا معائنہ لیا گیا۔ بچوں نے سلامی دی اور جلسہ کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس، اس سال اجمیر میں ہوگا

مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری بی۔اے (اکسن) ناظم تعلیمات حیدرآباد نے، پچھلے مہینے اُردو گشتی کتب خانے کے تحت ایک "لکچر گھر" کا افتتاح فرمایا۔

تعلیم بالغان کے معاملے میں پنجاب اور صوبوں سے، آگے ہے۔ دیہاتی رقبوں میں تعلیم کے عام کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام کیا گیا ہے۔ دار المطالعے، میجک لالٹین کے لکچر اور عام فہم کتابوں کی اشاعت کے ذریعے سے عوام میں مطالعے کا ذوق پیدا کر دیا گیا ہے۔

(ماخوذ از رپورٹ تعلیمی ہند ۲۶-۱۹۲۵ء)

ترکی میں لاطینی رسم الخط کو ہر دل عزیزی حاصل ہو رہی ہے۔ ادبی ذخیروں کو جدید لاطینی حروف میں منتقل کرنے کے منصوبے ہیں۔ تمام باشندے عورت، مرد اور بچے ابجد خوان بنے ہوئے ہیں۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ سکھانے والے وزرا، ممبران۔ پارلیمنٹ اور بڑے بڑے عہدے دار ہوں گے، جو کمال پاشا کی نگرانی میں کام کریں گے۔

بروصہ میں تین افسر گرفتار کیے گئے، جو اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان میں سے دو بری ہو گئے اور تیسرے کو ایک سال کی سزا ملی۔

ایک سو پندرہ افغانی طلبہ کی جماعت، جس میں پندرہ طالبات بھی ہیں، قیصر ہند جہاز سے ترکی روانہ ہو گئی۔ لڑکے، فوجی تعلیم حاصل کریں گے اور لڑکیاں ڈاکٹری اور تیمارداری کا کام سیکھیں گی۔ تمام جماعت یوروپین لباس میں تھی لڑکیوں کے بال تراشے ہوئے تھے۔ اس میں اکثر اعلیٰ عہدے داروں کے لڑکے ہیں اور خاص اُسی مدرسے سے تعلق رکھتے ہیں، جو بادشاہ اور ملکہ کی نگرانی میں ہے۔ اعلیٰ حضرت نے رُوس، جرمن اور فرانس کو بھی طلبہ بھیجے ہیں۔

ہارٹوگ کمیٹی نے بتاریخ ۲ آذر ۱۳۳۸ف جامعہ عثمانیہ کی تعلیم کا معائنہ فرمایا۔ فلسفے اور معاشیات کے لکچر سُنے۔ دفتر معتمدی تعلیمات میں عثمانیہ یونیورسٹی کی ترجمہ کرائی ہوئی کتابوں کو سلیقے سے رکھا گیا

تھا، جسے کمیٹی نے مسرت کے ساتھ دیکھا اور یونیورسٹی کے عظیم الشان کارنامے پر اظہار خوشنودی فرمایا۔ سہ پہر میں ارکان کمیٹی نے سٹی کالج کا معائنہ کیا اور سائنس کی عملی تعلیم اور کنڈرگارٹن کے شعبے کو خاص طور پر دیکھا۔

مسٹر کے۔ ایس وکیل انسپکٹر مدارس بمبئی نے پچھلے دنوں اڈل مسلم گرلس اسکول بمبئی جو عطیہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں ہے اور انہی کا قائم کردہ ہے، معائنہ کیا۔ ان کی رائے میں بیگم صاحبہ بالکل نئے طریقے پر مدرسہ چلارہی ہیں، جس کے باعث کام زیادہ اور اچھا ہو رہا ہے۔ میونسپلٹی کے مدارس نسواں کے لئے جو قدیم طریقے پر سست رفتار کے ساتھ چلائی جارہی ہیں، یہ بہترین نمونہ ہوگا چار مہینے کی تعلیم میں بہت کچھ ہوچکا ہے اور آگے ہونے کی امید ہے۔ اخیر میں انسپکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی ہمدردی اور ایثار نہ صرف نظر استحسان سے دیکھے جانے کے لائق ہے بلکہ اور مسلم خواتین کے لئے قابل تقلید ہے۔

---

۲۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو حیدرآباد میں "یوم کشافہ" اسکاوٹ ڈے رکھا گیا تھا۔ نظام کالج کے میدان میں اضلاع اور بلدے کے کشاف کا اجتماع ہوا۔ تجدید حلف کے اسناد اور تمغے دئے گئے۔ ولی عہد بہادر نے قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشی۔ سہ پہر میں خصوصی مظاہرات دکھائے گئے۔ مسٹر پرنڈرگھاسٹ نے ولی عہد بہادر کی طرف سے یہ پیام لکھ دیا کہ ہم آج کے اسکاوٹ پریڈ سے خوش ہیں۔ ایک منٹ میں سائکل سوار نے دوسرے اسٹیشن سے حرف بحرف صحیح پیام پہنچادیا۔ نظام کالج کے ایک کشاف کو ایک شخص کی جان بچانے پر تمغہ شجاعت ولی عہد بہادر نے عطا فرمایا۔ ناظم صاحب کشافہ نے شہزادوں کا شکریہ ادا کیا اور پھولوں کے ہار پہنائے۔

انجمن اساتذہ بلدہ کے جلسہ انتظامی منعقدہ ۲۰ آذر ۱۳۳۸ ف میں، انجمن مذکور کے نائب صدر ریورنڈ ایف۔ سی۔ فلپ ایم۔ اے وارڈن سینٹ جارج گرامر اسکول باتفاق آرا منتخب ہوئے۔ دیگر ارکان انجمن حسب تصفیہ سابق ذکی رہیں گے۔ اس سال انجمن اساتذہ بلدہ کی طرف سے

آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن کے چوتھے سالانہ جلسے میں، جو بمبئی میں ۲ تا ۶ نومبر ۲۵ء ہوا۔
مسٹر ہارڈیکر ہیڈماسٹر دیویک دردھنی اسکول نے انجمن ہذا کی نمایندگی کی۔
سہ ماہی اول ۲۸ء کا پروگرام حسب ذیل مقرر کیا گیا۔
آذر ۳۸ف جلسہ عام کا انتظام کیا جائے گا۔
دے ۳۸ف کیا یہ ممکن ہے کہ پرائمری تعلیم کی مدت بجائے پانچ سال کے چار سال کردی جائے
بہمن ۳۸ف کیا اس کی ضرورت ہے کہ جماعات تحتانیہ اور وسطانیہ کے نصاب تاریخ وجغرافیہ
کی نظرثانی کی جائے۔ اگر ایسا ہے تو کیا تبدیلی ہونی چاہیئے؟

حیدرآباد بائی اسکاوٹس کی سرپرستی میں بصدارت نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم۔ اے
بیرسٹرایٹ لا معتمد تعلیمات دیویک دردھنی تھیٹر میں بتاریخ ۲۴ آبان ۱۳۳۸ف پنڈت ہردے ناتھ
کنزرو ایم۔ ایل۔ اے دہیر مجلس سیوا سمتی نے بہ عنوان اسکاوٹنگ اردو میں ایک نہایت دلچسپ
پرمغز اور سبق آموز تقریر فرمائی۔ اس تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ یہ انگلستان
شروع ہوکر دوسرے ممالک میں پھیلتے پھیلتے کس طرح عالم گیر ہوگئی۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ امریکن
طریقے کو انگلستان کے طریقے پر کس طرح فوقیت حاصل ہے۔ اور خوشی ظاہر کی کہ حیدرآباد میں بیشتر
امریکن طریقے کی پیروی کی جارہی ہے۔
اس کے بعد آپ نے اسکاوٹنگ سے متعلق جو غلط فہمی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے، اس کا
جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اخلاق کے سنوارنے میں ماہرین نفسیات نے اس کی خاص اہمیت دی
ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سے کوشش کی جاتی ہے کہ کھیل کا کھیل ہو اور ساتھ ہی نہ صرف تعلیم
ہو بلکہ اخلاق بھی سنوارے جائیں۔ آپ نے ان مقاصد کے علاوہ اس امر پر زور دیا کہ اسکاوٹنگ
کے ذریعے ابنائے جنس کی خدمت کرنے کی تربیت بہ آسانی دی جاسکتی ہے۔ الہ آباد کے اسکاوٹس
نے انسداد ملیریا کا بیڑا اٹھایا ہے اور محکمہ صفائی کا ہاتھ بٹارہے ہیں۔ وہاں کے اسکاوٹ صفائی
کا انتظام کرتے اور مٹی کا تیل چھڑکتے پھرتے ہیں۔ بچوں کے سرپرست اور والدین ممکن ہے کہ
اس کو باعث ننگ سمجھیں مگر اسکاوٹ بنی نوع انسان کی کسی خدمت کو ہرگز ذلیل نہیں سمجھتا۔

آپ نے فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد کا یہ زبردست آلہ ہے اس کو فرقہ وارانہ رنگ کبھی نہ دینا چاہیئے، بلکہ ہر ٹروپ میں ہر قوم و ملت کے اسکاوٹ رکھے جائیں۔ تاکہ آپس کا اتحاد بڑھے۔ ایسی تحریکات ہمیشہ سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ رہیں۔

اس تحریک کی کامیابی کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس کی کامیابی کا انحصار اسکاوٹ ماسٹروں کی شخصیت پر ہے ان کو چاہیئے کہ صداقت، ہمدردی، ایثار اور جملہ صفات کا جن کی اسکاوٹس میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے، خود پہلے مجسم نمونہ بنیں۔ اگر کسی مدرسے میں بہمہ صفت موصوف اسکاوٹ ماسٹر نہ ملے تو بہتر ہے کہ وہاں ٹروپ ہی قائم نہ کئے جائیں اسکاوٹنگ کے سب سے اہم جزو پر پنڈت صاحب نے یہ فرمایا کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے غیر سرکاری جد و جہد کی ضرورت ہے۔ سرکاری انتظام کا نتیجہ سرکاری دباؤ ہوتا ہے، جس سے وہ اسپرٹ پیدا نہیں ہوسکتی، جو اس تحریک کا خاص منشاء ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرکاری امداد نہ لی جائے اور سرکاری عہدے دار شریک نہ ہوں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ خانگی حیثیت سے حصہ لیں نہ کہ بہ حیثیت عہدہ۔

آخر میں آپ نے ممالک متحدہ آگرہ و آودھ کا ذکر کیا جہاں دو اسکاوٹ اسوسی ایشن ہیں۔ ایک بیڈن پاؤل رسوسی ایشن دوسری سیوا سمتی۔ سرکار انگریزی ان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے۔

حکومت ترکی کے وزیر معارف نے بالغ العمر اشخاص کی تعلیم کا اسکیم شائع کیا ہے۔ جس کی رو سے بارہ ہزار معلم ملازم رکھے جائیں گے۔ جو (۴۶) سال سے زیادہ عمر والے اشخاص کو تعلیم دیں گے۔ تاکہ ترکی میں کوئی بے پڑھا لکھا نہ دکھائی دے۔

شاہ افغانستان نے اپنے علاقے سے خاص خاص نوجوان کابل بلائے ہیں تاکہ انہیں جدید اصلاحات سے آگاہ کیا جائے اور وہ واپس جاکر عوام کو ان اصلاحات کی نوعیت سے آگاہ کریں اور قومی ترقی کے لئے حکومت کی امداد کریں۔

حساب جلسہ الوداعی نواب مسعود جنگ بہادر

نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کی خدمت میں ان کے وظیفہ پر علحدہ ہونے کے موقع پر ایک سپاس نامہ پیش کرنے کے متعلق غور و خوض کرنے کی غرض سے عہدہ داران و ارکان سررشتہ تعلیمات کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۴ سپٹمبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۹ آبان ۱۳۴۷ف منعقد کیا گیا۔ جلسہ مذکور میں باتفاق آراء یہ طے پایا کہ عہدہ داران و ارکان سررشتہ تعلیمات کی جانب سے اس غرض کے لئے بطیب خاطر جو چندہ پیش ہو، وہ قبول کیا جائے بشرطیکہ دس فیصدی مشاہرہ سے زائد نہ ہو۔

چنانچہ حسب تفصیل مندرجہ حاشیہ مبلغ (للعہ) سکۂ عہ اور (مارعہ) سکۂ کلدار چندہ پیش کیا گیا۔

مجلس انتظامی کی تجویز ہوئی کہ

۱۔ رقم وصول شدہ سے عصرانہ اور دیگر متفرق ضروریات کے لئے صرف اس قدر رقم صرف کی جائے جس کی کم سے کم ضرورت ہو۔

۲۔ اور باقی رقم کسی ایسے

	سکۂ عہ	سکۂ ک
۱۔ دفتر نظامت تعلیمات	(سماہعہ)	(
۲۔ مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ بلدہ	(مالعہ)	(٠)
۳۔ محبوبیہ گرلز اسکول بلدہ	(عسہ)	(مسہ)
۴۔ سٹی کالجیٹ اسکول بلدہ	(الاسہ)	(٠)
۵۔ جاگیردار کالج بیگم پیٹھ	(مالسہ)	(مامہ)
۶۔ انجینرنگ اسکول بلدہ	(مارسہ)	(٠)
۷۔ دفتر ڈائرکٹر آف بائز اسکاؤٹس	(لہعہ)	(٠)
۸۔ زنانہ کالج نامپلی	(مالعہ)	(عہ)
۹۔ عثمانیہ ٹرینگ کالج بلدہ	(مالسہ)	(٠)
۱۰۔ دفتر صدر مہتممہ صاحبہ مدارس نسوان بلدہ	(سمالعہ)	(٠)
۱۱۔ دفتر صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و اطراف بلدہ۔	(الملعہ)	(٠)
۱۲۔ دفتر صدر مہتمم تعلیمات صوبہ ورنگل	(المعہ)	(٠)
۱۳۔ دفتر صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف	(سمامعہ)	(٠)

طریقہ پر محفوظ کرائی جائے جس سے کہ زیادہ سے زیادہ منافعہ حاصل ہو۔	۱۴۔ دفتر صدر مہتممی تعلیمات صوبہ میدک	(الف) (۰)
	۱۵۔ دفتر صدر مہتممی تعلیمات صوبہ اورنگ آباد	(۰)
۲۔ اور منافعہ وصول شدہ سے نان گزیٹڈ ارکان سررشتہ تعلیمات کے لڑکوں اور لڑکیوں کے نام وظائف تعلیمی جاری کئے جائیں	۱۶۔ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد۔	(۰)
	۱۷۔ مدرسہ تعلیم العلمین مرہٹی اورنگ آباد	(۰)
نوٹ۔ ارکان سررشتہ تعلیمات میں اساتذہ مدارس تحتانی بھی شامل ہوں گے۔	۱۸۔ دفتر مہتممی مدارس صنعت وحرفت اورنگ آباد۔	(۰)

جملہ رقم وصول شدہ سے حسب صراحت حاشیہ مبلغ (...) سکہ	۱۔ تیاری کا سکٹ۔	(۰)
عثمانیہ اور (...)	۲۔ ایٹ ہوم۔	(...)
سکہ کلدار	۳۔ طبع اڈریس	(۰)
خرچ ہوئے اور (...)	۴۔ متفرق	(...)
سکہ ؏ اور (...) سکہ کلدار	۵۔ واپسی رقم از چندہ وصول شدہ	(۰)
بچ رہے ہیں۔		

اس رقم کی نسبت یہ طے پایا ہے کہ اس کو کسی کواپری ٹیو بنک میں امانتاً جمع کرایا جائے اور اس کے منافعہ سے ہر سال حسب قواعد منظورہ کمیٹی عامہ (...) ماہوار کا ایک وظیفہ تعلیمی جاری کیا جائے۔ اور یہ طے پایا کہ

۱۔ اس وظیفہ کو "وظیفہ یادگار نواب مسعود جنگ" کے نام سے موسوم کیا جائے۔ اور

۲۔ رقم مجتمعہ اور منافعہ محصلہ کی نگرانی اور حساب کتاب کے لئے بشمول ارکان ذیل ایک امانتی کمیٹی قائم کی جائے۔

۱۔ نائب ناظم تعلیمات ۲۔ صدر مہتمم تعلیمات بلدہ ۳۔ معتمد مجلس انتظامی۔

۳۔ بموجب قواعد منظورہ وظائف کے اجرائی کی غرض سے علاوہ امانتی کمیٹی مذکورہ بالا کے ایک مجلس انتظامی قائم کی جائے۔ فقط

شریک دستخط

ایچ۔ ڈبلیو۔ شا کراس۔ صدر نشین۔

ضروری اطلاع

صدارت عظمیٰ یعنے باب حکومت سرکار عالی نے ذریعہ مراسلہ نشان (۱۶۹)
مورخہ ۱۰ فروردی ۱۳۳۷ف اعظم اسٹیم پریس کو ازراہ قدر افزائی و رعایا پروری گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر مقرر فرمایا ہے سرکار عالی کی اس قدر افزائی کا کارپردازان و مالک مطبع کی جانب سے تہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد جملہ جلیل القدر عہدہ دار صاحبان سررشتہ تعلیمات و صدر مدرسین و اساتذہ صاحبان و طلبا مدارس خانگی و سرکاری کی

خدمت میں استدعا ہے کہ

حسب منشار باب حکومت سرکار عالی اس مطبع سے خدمات طباعت و جملہ سامان تعلیمی و کتب درسی و فارمس وغیرہ کے آرڈر سے سرفراز فرما کر مطبع ہذا کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

انشاء اللہ تعالیٰ یہ کارخانہ بھی اپنے معاملہ داروں سے بپابندی وعدہ اور اخذ اجرت واجبی اور اپنی سچائی اور خوش معاملگی و خوبی کار سے جو اس کی ترقی کا حقیقی راز ہے مالک و ملک کی خدمت گزاری میں کبھی دریغ نہ کرے گا۔

مخفی مباد کہ کارخانہ ہذا میں علاوہ متعدد لتھو مشنوں کے ایک جدید قسم کا مشن بھی ولایت سے اور آگیا ہے جس پر رنگ برنگ کے بیل بوٹے و بل فارمس و ہر قسم کے بلاک اور نہایت اعلیٰ درجہ کے رنگین تصاویر بہت ہی ارزان اجرت پر طبع ہو سکتے ہیں۔

خاکسار

سید عبدالقادر

مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و تاجر کتب و پبلشر نظام گزٹ چار مینار
(حیدرآباد دکن)

teacher's eyes; and if he, as is often the case, has a town bias, he unconsciously inculcates it in his pupils. Training of a technical nature can be given of course and the men should be qualified along scientific lines—and Dr. Mann's suggestions for an Agricultural College in Hyderabad with facilities for training teachers will qualify along technical lines—but to secure teachers with a genuine interest in the country and its pursuits, who by walks and excursions will make their subjects live and beget real interest in them, this demands men with a vocation and where shall we find them?

The very buildings should be modelled to secure this, and of course ample ground and grants for tools should be provided in order that all lessons, wherever possible, may be given practical expression. The "Project method" would seem to lend itself admirably to outdoor work for this type of education, and has been tried very successfully in the Punjab. The school hours, at present not the best for rural areas, should be altered to suit local conditions and the varying seasons. Why stereotype them after the urban model? Hygiene in all its aspects—personal and general—should have its definite place, and here especially example should follow precept. In a right understanding of the elementary laws of hygiene the salvation of the villages depends. The Royal Agricultural Commission has stated in emphatic terms in its findings that "substantial progress in the campaign against malaria and disease can only be achieved by concerted action by the people themselves".

The village school can be a big factor in this campaign, especially if the children's health is catered for in every way and a medical inspection carried out at regular intervals. The school itself and its children can, at any rate, be made an object lesson to the village and influence by silent example. To quote again the findings of the recent Agricultural Conference: "Village schools should be strong centres of rural uplift" and so take their place in the village reconstruction movement.

Dr. Mann's suggestions for the establishment of such special agricultural schools to take the place of the Upper Primary or Lower Secondary standards in certain areas, having been adopted by the Bombay Government, were found to be successful, and above all popular with the people—a most important thing in view of past experience. The difficulty was the supply of the right type of teacher and this seems to us the all—important question for the success of any scheme. Boys will see things through their

Editorial.

Rural Education in India.

"What form of education should be presented in the rural areas of any part of India?"

In his very informative lecture, published elsewhere in this issue, Dr. Harold Mann deals with this vital question of our day. He points out that the problem of rural education has not yet been solved either to the satisfaction of the people or of the educationalists themselves and indicates where he thinks the solution lies—viz:, not by introducing agriculture as a subject in village schools, but by a much wider revolution. The education itself must be ruralised throughout. This is a much bigger thing.

It implies first that the education imparted must be completely in harmony with the life and occupation of the country side. This is important not only for the securing of the parents' interests and co-operation and the training of the child's faculties along definitely agricultural lines, but also, we think, for a deep-seated psychological reason—viz:, that if in the early stages a boy does all his work in a curriculum with a predominantly urban bias and outlook and is given no explanation of the various phases of life that pass under his own eyes, he is apt to conclude that town life is the ideal—else why all this emphasis on it?—and so the city-drift is often unconsciously begun. Hence the necessity of a rural emphasis throughout, including of course the "ruralising" of readers and arithmetic books which at present are far too urban in their outlook. In fact, to quote another agricultural expert, Dr. Rudolph Anstead of Madras, we should "make nature study the central idea of education in such primary schools, round which all other subjects should pivot." Only so can the right relationship be secured.

Review.

The first number of a new magazine "Teaching" has been issued by the Oxford University Press under the editorship of Prof. H. R. Hamley, M. A., M. SC., Principal of the Secondary Training College, Bombay. The journal is to be issued quarterly, and is meant to supply the needs of teachers in the Bombay Presidency. The Editorial states that the magazine "will be divided into sections covering, during the year, the various branches of the profession so that every teacher can get, at least once a year, some last word on his own special subject". "Only questions of practical use to teachers in their daily work are to be admitted".

Judged by the first issue, the journal fulfils its claims and supplies useful articles on important subjects such as Silent Reading, Geography, Elementary Mathematics, Educational Psychology, Appreciation, Domestic Science, Nature Study etc. The articles on Appreciation, Domestic Science and Nature Study, subjects rather neglected in India, appeal to us as being very practical and helpful to those interested in developing these rather over-looked subjects. The book list at the end, which is meant to provide teachers with a bibliography of the best works on teaching at a reasonable cost, is to be a regular feature of the magazine and should prove very helpful. The magazine is well got up in a style worthy of the Oxford Press as regards printing and appearance.

2. To manage and control the amount so invested and the income so derived, a trust of the following members should be formed :—

Deputy Director, Divisional Inspector of Schools, Balda, and the Secretary.

3. Besides the above trust, a Managing Committee should be formed to award the above scholarship according to the Rules approved by the Working Committee."

Sd/- H. W. SHAWCROSS,
President.

		O. S.			B. G.		
18.	Office of the Inspector Industrial School, Aurungabad	77	2	0			

Expenditure.

		O. S.			B. G.		
1.	Preparation of the Casket ...	1277	1	2			
2.	At Home	481	2	5	240	0	0
3.	Printing of Address	129	6	9			
4.	Miscellaneous	473	9	0	2	0	0
5.	Amount returned out of the subscriptions received	146	3	0			

The Managing Committee resolved :—

1. To spend from the amounts thus received as little as possible towards the "At Home" and other sundries.

2. To utilise the balance in such a manner as would produce the highest income.

3. To award a Scholarship out of the income thus derived for the benefit of the sons and daughters of the non-gazetted members of the Educational Service.

Note.—Teachers of the Aided Schools are included in Educational Service.

Out of the total amount collected, a sum of O. S. Rs. 2867-6-4 and B. G. Rs. 242-0-0 as detailed above was spent. Thus a balance of O. S. Rs. 11,516 and B. G. Rs. 30-8-0 has been left.

It was resolved to credit the amount in the Co-operative Bank and award every year a scholarship of Rs. 14/- per mensem, according to the rules sanctioned by the Working Committee.

It was further resolved that :—

1. The scholarship should be known as "the Nawab Masood Jung Memorial Scholarship."

It was decided not to accept subscriptions of more than 10 per cent of the salary.

Subscriptions received amounted to O. S. Rs. 14,383-7-4 and B. G. Rs. 272-8-0, as detailed below:—

		O. S.			B. G.		
1.	Director of Public Instruction's Office	357	8	0			
2.	Chaderghat High School	188	0	0			
3.	Mahbubia Girls' School, Hyderabad	20	0	0	30	0	0
4.	City Collegiate School, Hyderabad	1031	0	0			
5.	Jagirdars' College, Begumpet	190	0	0	150	0	0
6.	Engineering School, Hyderabad	230	0	0			
7.	Director of Boys Scouts' Office	71	0	0			
8.	Zenana College, Nampally	259	0	0	92	8	0
9.	Osmania Training College, Hyderabad	136	0	0			
10.	Inspectress of Girls' Schools, Office, Hyderabad....	649	10	5			
11.	Office of the Divisional Inspector of Schools, Hyd.....	1699	4	5			
12.	Do. Warangal	1860	6	0			
13.	Do. Gulburgah	3350	0	0			
14.	Do. Medak	1212	15	6			
15.	Office of the Divisional Inspector of Schools, Aurungabad	2616	4	10			
16.	Intermediate College, Aurangabad	270	0	0			
17.	Mahrathi Training School, Aurangabad	165	4	2			

suggestions were most helpful. He hoped means would be found to put them into practice. The trouble is that many teachers look upon the teaching of infants as a kind of lower grade work. This false perspective should be corrected. In Western lands often the best teachers were put in charge of Primary classes. It was considered that their abilities would help most in that department. The Professor's remarks applied equally well to parents, for strange to say, children were often neglected in the home—servants taking the place of parents. He assured parents that a study of their own children would well repay observation. He hoped that one result of the Professor's words would be a better realization of the kingdom of the child and the part we had to play in it, especially that of providing the right institutions as portrayed by the lecturer. The Branch Secretary, Mr. G. A. Chandawarkar, M. A., proposed a vote of thanks to the lecturer and Chairman and the proceedings came to a close.

Farewell Entertainment to Nawab Masood Jung Bahadur

Statement of Accounts.

WE give below a summary of the proceeding of the meetings of Masood Jung Farewell Committee, which has been sent to us by the President of the Committee for publication :—

"The Officers and Members of the Education Department met in a committee on the 24th September 1928—19th Aban 37 F., to consider the question of giving a farewell address etc. to Nawab Masood Jung Bahadur, the then retiring Director of Public Instruction.

It was unanimously agreed to accept subscriptions from the officers and members of the department who come forward to help the Committee.

number but universities abounded and were even increasing in number; but no amount of higher education could atone for loss of education and training in the earliest years. The superstructure of education would always be top-heavy and without right foundations while this state of affairs existed. Child education imparted on scientific lines was a *sine qua non* of genuine educational progress.

This demanded a better recognition of the rights of children and the provision of better facilities whereby their little personalities could express themselves and in this also we were sadly lacking. While vast sums were spent on higher studies, little was spent on similar facilities for the child, who also *thinks*, *learns* and *acts*, as any careful observer will notice. His impressions indeed are more abiding at that early age, so why not mould them then, as we try to do later at great cost?

The environment therefore should be made congenial to their childish interest; we should try and respond, for instance, to their inquisitive sense, to the sense of rights and ownership, (within limits, of course) and also to the desire to help so often repressed in a child. His own experiences at Poona, where he was trying to create such an environment for a number of children, had showed him how much could be done by a sympathetic understanding of the child and its ways. He wished to interest others in this most necessary work—a national work he considered it—and urged all his hearers to co-operate in this task and try and establish institutions for child education in all their cities and villages.

The Chairman, in thanking Professor Hudlikar for his stimulating lecture, said that he had called attention to a most important aspect of education which was at present a weak point in our educational scheme. The Professor had given a great deal of time to studying this subject in other countries where the child had come into his own, and his

class-room instruction. In conclusion, Mr. Kunzru referred briefly to the need for adult and vocational education.

* * *

Hartog Committee's Visit to Hyderabad Deccan.

The Hartog Committee paid a short visit to Hyderabad early in October in order to obtain first-hand information about the Osmania University. On 7th October His Excellency the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, G. C. I. E, entertained the members of the Committee at dinner, to which the Professors of the Osmania University and the Nizam College as well as senior officers of the Education Department had also been invited. Replying to the toast of the Committee proposed by His Excellency the Maharaja Bahadur, Sir Philip Hartog, Chairman of the Committee, referred briefly to the Osmania University and said that he had been impressed favourably by those graduates of the University with whom he had come into contact at Dacca while they were pursuing their post-graduate studies there. On the following day the members of the Committee visited the Osmania and City Colleges and lunched with Nawab Waliuddowla Bahadur, Minister of Education.

* * *

Prof: Hudlikar's Lecture on 'Child Education'.

Under the auspices of the Hyderabad Teachers' Association — Residency School Branch — Professor S. B. Hudlikar, M. A., Ph. D., delivered an instructive lecture on "Child Education" at the Vivek Vardhini Theatre on October 16, 1928, Revd: F. C. Philip being in the chair.

We hope to publish the lecture in detail in a subsequent issue but would like to draw attention to certain outstanding points stressed by the lecturer.

The Professor pointed out that Child Education was a much neglected subject in India. Kindergartens were few in

only for boys but also for girls. To confine our attention to the education of boys alone and to neglect the education of girls would be like building on sand. We should take a lesson from Afghanistan, where King Amanullah and Queen Suriya are devoting as much attention to the education of girls as to the education of boys. Referring to the Osmania University, Mr. Kunzru expressed his appreciation of the principle underlying it. He said that Urdu, which is the medium of instruction in this university, arose from the contact of Hindus with Mussalmans. It is a language which is understood all over India and the only language which can be called our national language. But for the difference in script, Urdu and Hindi are essentially one and the same language. At the same time, the learned speaker stressed the need for paying greater attention in the schools to the other vernaculars of the Dominions. He then dwelt on the importance of private effort in education and in this connection criticised the circular issued by the Education Department requiring that no private school should be opened without permission. He said that such a circular would be justified only if education were made universal. He also expressed the opinion that public libraries should be freed from the supervision which was now exercised over them. Speaking about religious instruction, the Pundit objected to the system of examining the text-books of the Osmania University from a religious and Islamic point of view. He said that he was not one of those who believed that the salvation of India depended on Hindus becoming stronger Hindus and Mussalmans becoming stronger Mussalmans. The great need of the country was that the Hindus and Mussalmans should become good Indians. He therefore suggested that the imparting of religious instruction should be left to the parents. With regard to moral instruction, he said that the personality and example of the teacher was a much more important factor in the formation of the character of the pupils than precept and

Scouting knows no distinction of religion, caste or creed. The movement has therefore special significance for India. The formation of scout troops on a communal basis should never be permitted.

It is very important that scouting should be organised and conducted unofficially. Scouting appeals to the heart. Official control can never produce the right scouting spirit. Government should however help with funds, as it does in the United Provinces and elsewhere, and the co-operation of Government officials in their private capacity should be welcomed.

Finally, the success of scouting depends chiefly on the character and personality of the scout masters. The scout masters should be men who practise what they preach. If in any school scout masters of this type are not available, such a school would do well not to start a troop at all.

* * *

The Hyderabad People's Educational Conference: Pundit Hridayanath Kunzru's Presidential Address.

At the First Hyderabad People's Conference, held on the 25th October, 1928, Pundit Hridayanath Kunzru, M. L. A., delivered a most thoughtful and eloquent presidential address. He dwelt at length on the importance of primary education. It was gratifying, he said, that the expenditure on education had increased from about a lakh in 1911 to 74 lakhs in 1925-26. But he expressed the opinion that the portion of the expenditure devoted to primary education at present was not sufficient. He emphasised the need for making primary education compulsory. He thought that in view of the prosperous condition of the finances of the State, there ought to be no difficulty in introducing compulsion. At the same time, he pointed out that the co-operation of the public was necessary. As in British India, compulsion should be begun in urban centres and then gradually extended to rural areas. Continuing, he said that compulsory education was necessary not

back from there to Hyderabad last May. The function terminated successfully with a short speech by Mr. S. M. Hadi B. A., (Cantab:), Director of Boy Scouts, who thanked the Princes for the honour which they had done to the scouts by graciously accepting their invitation to be present that evening. Mr. Hadi rightly remarked that the interest of the Sahebzadas was a good augury for the future of scouting in H. E. H. the Nizam's Dominions.

* * *

Pandit H. Kunzru's Lecture on Boy Scouting.

Another important event connected with Boy Scouting in Hyderabad is the lecture delivered recently on the Boy Scout Movement by Pundit Hridiyanath Kunzru, M. L. A., Chief Commissioner of the Seva Samithi Boy Scout Association, United Provinces. The following is a brief summary of his speech:—

The Boy Scout movement is based on the most up-to-date principles of education. Boy scouting gives the boys ample opportunity of expressing their personality; it builds up their physique and character by providing useful and instructive games and encouraging activity and movement among them. Scouting has also proved to be an excellent training in citizenship. Scouts should never miss an opportunity of service to the public. At Allahabad the scouts have recently undertaken to help the Public Health Department in stamping out malaria. Their work consists in pouring kerosine oil over stagnant pools. Scouts in Hyderabad could similarly assist in freeing their city from plague.

A scout troop should be small, so as to enable the scout master to study each member of the troop thoroughly and to exercise his full influence over them. The strength of a troop in the Seva Samithi Organisation, United Provinces, is generally 25.

missed in the Nizam College, especially on the College play-ground.

Mr. Marmaduke Pickthall having been granted two years' special leave, Mr. Sajjad Mirza, M. A., (Cantab:) has been appointed Principal of the Chaderghat High School for the period, while Mr. Syed Husain, B. A., B. T., Head Master, Parbhani High School, is to act as Divisional Inspector of Schools, Gulburga in Mr. Sajjad Mirza's place.

Mr. G. Tate, B. A., has retired after having served as Head Master of the Aizza Aided High School, Hyderabad Deccan, for nearly 50 years. A farewell entertainment was given to him on the 15th October, 1928, when the staff and pupils presented him with an address in which they expressed their high appreciation of the work done by him during his long career. Nawab Nizamat Jung Bahadur, C. I. E., O. B. E., Secretary of the School, was in the Chair.

* * *

Scout Day Celebrations in Hyderabad Deccan.

The Hyderabad Boy Scouts celebrated the Annual Scout Day on the 20th October, 1928 at the Nizam College. Sahebzada Azam Jah Bahadur, Heir-apparent, and his brother Sahebzada Moazam Jah Bahadur graced the occasion with their presence. 21 Scout troops and 3 Rover troops took part in the celebrations. After the march past, which was very impressive, interesting displays were given by the various troops, including the extinguishing of fire by the 3rd Rovers Troop with the help of a fire engine and transmission of telegrams in Urdu by the 1st Rovers Troop. The Princes showed great interest in all that they witnessed. At the conclusion of the displays, Sahebzada Azam Jah Bahadur distributed special prizes—a silver medal to Mumtaz Ali, a scout of the Madrasae Aliya, for saving a man from drowning and a silver medal each to Mr. Sivan and the three other members of his party who cycled to Mysore and

recently paid off through the splendid efforts of Rev. C. E. Parker who had kindly undertaken to raise subscriptions in America while on furlough. Severe difficulties were still being felt to meet the increased demands of the school and special appeals had been made to H. E. H. the Nizam's Government for a grant-in-aid.

Mr. H. R. Parker, I. C. S., the Chairman, spoke on the ideals of education, complimenting the school on its broad methods of work. He specially emphasised the work done by the boys during the plague. Since then, the Hon'ble the Resident has sent a gift of Rs. 100/- to the boys. Mr. Parker himself donated a cup to the school for athletics. Prizes were then distributed for general proficiency and distinction in athletics and tournaments and the function closed.

Notes and News.

WE offer our congratulations to Mr. Khan Fazal Mohamed Khan, M. A., (Cantab:), on his appointment as Director of Public Instruction, H. E. H. the Nizam's Dominions. Mr. Fazl Mohamed Khan was Principal of the City High School from 1914 to 1919 and Deputy-Director of Public Instruction from 1919 to 1924. In the middle of 1924 he reverted to his permanent post in the Punjab, where he is still in service. Till his arrival, Mr. Syed Mohamed Husain Jaferi, B. A. (Oxon:), will continue to act as Director.

A number of other important changes have also taken place in the Education Department. Mr. H. W. Shawcross, M. A., (Cantab:), Principal of the Jagirdar College, has retired after 15 years' service and his place has been filled by Mr. P. F. Durand, B. A., (Cantab), Professor of the Nizam College. A more suitable choice could not have been made, though we think that Mr. Durand will be greatly

Tournament was then played off amidst the usual spirit of rivalry and enthusiasm. This was followed by a beautiful display of pole-drill by the big boys. The large crowd of visitors and friends then went into the auditorium where an entertaining programme was given by the boys, which included a scene from Shakespeare and a musical drama, entitled the Sleeping Beauty, while Urdu and Telugu songs provided a delightful variety.

The Principal in his report referred to the improved system of teaching adopted in the school. The mathematics department specially had been placed on a modern basis with a graded system of instruction carried on in close co-operation and regular consultation by the teachers. A Circulating Library containing books on general and technical subjects and a Reading room with news-papers and magazines of varied descriptions had been introduced to keep the teachers well-informed, while a short course of training every term at the Teachers' Institute afforded splendid facilities to the teachers to keep themselves in line with modern and up-to-date methods of education. In addition to maintaining the usual academical efficiency of the school, systematic efforts were being made train up the boys to practical and every-day requirements. While gardening, poultry-keeping, tailoring, hair-dressing, book-binding, etc., enabled the boys to earn their own way, distinct efforts were being made to create an incentive in them to manual labour and occupation. Ideals of citizenship and civic morals also had been fostered and kept aloft. During the last Epidemic 20 boys took turns in helping at the plague hospital at Gowliguda. The services of the boys were enlisted entirely on a voluntary basis and the school could justly be proud of the admirable way the boys pledged themselves to this duty of extreme sacrifice and love.

The Principal then announced with great pleasure how the larger debt incurred on buildings and property had been

right. Live so that when you come to die you may be able to say 'I never wronged a living creature or did wanton damage to another's property in all my life.' Then you will never grow old. If you live to eighty years, you will still possess the hopeful mind of youth, the sympathy of youth, the zest of youth. And you will be a blessing to all those who come in touch with you.

I have spoken in what some of you may think too high a strain, but I always mean what I say. No strain of language can be too high for the hope for mankind which is present in each rising generation, a hope too often damped by disillusioned older people. I do not wish to damp the hope that burns in you and students of all the other schools in these Dominions, for I share it. Do not look back at us, go forward and look forward fearlessly and try your efforts to make these fair Dominions so bountifully endowed with God's povidence better and greater than you found them, so as to be a source of pride to their gracious Ruler and of happiness and prosperity to a loyal, contented and united people."

Mr. H. R. Parker, I.C.S., Under-Secretary to the Resident and Chairman of the School Committee, thanked Sir Akbar Hydari for his kindness in presiding, and in apologising for the Resident's absence stated that he had been asked to announce that a sum of money would be placed by the Hon. the Resident at the disposal of the Warden to be expended on prizes for children who had not won them, but had done meritorious work in lessons or games or conduct throughout the year.

The Methodist Boys' High School.

Founder's Day of the Methodist Boys' School was celebrated on the 21st September 1928 in the school auditorium. Mr. R. H. Parker, I. C. S., presided over the function.

The programme began early with an "at home" to the Old Boys. The Finals of the Inter-class Volley Ball

which Latin and Greek were almost the only subjects studied. The world has moved on since then and it is moving on so rapidly just now that people like myself who have seen more than fifty summers and more placid times might well be forgiven for feeling some disquiet and alarm. A time seems to be coming when the man who cannot drive a motor car and fly an aeroplane will be regarded much as we regard some wretched cripple unable to make use of arms and legs, and when a man who cannot read and write will be unheard of. Some of us who can remember when there were no bicycles even and who found life pleasant in those days, who have known men who could not read or write who yet possessed quaint wisdom and some noble qualities, are tempted to think longingly of the old days.

I am not one of those who sigh for them. I can still take the standpoint of you boys, with all the world before you, and we can see what a gloriously hopeful world it is. No generation has ever had such opportunities, such wonderful facilities and possibilities presented to it as you will have. Use those opportunities not only for yourselves but also for those less favoured by fortune than yourselves. Do not regard your education merely as a piece of personal equipment. It must shed a light around you. Seek to spread it. Remember that a nation which comprises a majority of uneducated people must always be a backward nation in this new world to which we are advancing and that the nation which is most completely and most highly educated will be the foremost nation, and when your "so-called education"—I prefer to call it "period of mental training"—ends, do not give up learning. It is then you really should begin to learn. Learn all you can, seek knowledge everywhere. Be students in the true sense of the word till your life's end. Be of those who any day would rather suffer than commit wrong. Seek always to liberate and enlighten; never to darken and enslave. Never despair. If you are wrong, men made them so and men can put them

of the School. I must in the first place refer you to that portion where Mr. Philip has emphasised the necessity of boys having an adequate knowledge of English. This is entirely in accordance with the principles underlying the policy of the Educational Department of His Exalted Highness the Nizam's Government and marks out the distinct place which St. George's Grammar School holds in the Educational system of Hyderabad. The Nizam's Government feel that the language of thought from the most elementary classes up to the highest stages of instruction should be one; and as in this school the medium of instruction is English, that should be the language with which its pupils should be made so conversant as to be able to think in it. The Nizam's Government is giving a generous help to this institution because it feels that the products of such an education have also a place to fill in the polity of India.

It is always a pleasure to me to visit the school in which my own boys studied, for I know the value of the education here imparted. The policy of these Dominions has always been the policy of the open door in matters educational, a policy which has benefited us in the past even more than it is benefiting us at the present time, when an efficient and thoroughly modern system of universal education, inclusive of all classes and communities, is rapidly being perfected among us. In old days when there was no such system, the work of imparting modern education was done almost exclusively in schools such as St. George's by missionaries of various denominations. It would be difficult indeed to overrate the service such institutions have rendered. We should be ungrateful if we do not welcome them, but we are able to welcome them on something more like equal terms to-day.

This school bears the name of Grammar School. But education all over the world has made enormous strides since the foundation of the English Grammar Schools in

children and the attention paid to backward children; (*c*) physical education; (*d*) co-ordination of the different subjects of the school curriculum; (*e*) the principle of activity; (*f*) parental co-operation; (*g*) vocational education; (*h*) examination system; (*i*) training of teachers and last, but not least, the training in mother-craft and household management given to girls.

Prize-Day Celebrations at Hyderabad Dn.

St. George's Grammar School.

St. George's School held its Annual Prize function on the 30th September, 1928 and the event passed off very successfully. The physical drill and gymnastic items showing the physical side of education imparted by the school were much appreciated by the visitors.

The Warden's Report showed a year of progress in every way—in numbers, fee receipts and extension of the curriculum, especially in the science department. The Boys' School new building which was completed free of debt has proved a valuable addition to the school, and has provided better facilities for efficient teaching. The Report also showed that physical education had been stressed during the year by the institution of First Aid classes, and boys so trained won the St. John's Ambulance shield in open competition. The testing of the childrens' eye-sight by a qualified practitioner had also proved very beneficial to students generally.

The prizes were then presented by Sir Akbar Hydari, who presided on the occasion and gave a most helpful address to the students,stressing the wonderful opportunities existing for the present-day youth. He spoke as follows:—

"I consider it a peculiar privilege to have been invited to preside over this function this evening, and the reasons why I consider this to be such a great privilege are apparent from certain portions of the report which has just now been read out to you by the respected and indefatigable Warden

rivalry, good mutual influence and the absence of the feeling among the boys and girls that they belong to different sexes.

Conclusion.

The German system of education has been criticised on the ground that the curriculum is heavy and that the demands made on the time and energy of the student are great. There is a great deal of truth in this criticism. But it must be remembered that the German schools are staffed by men who possess the professional skill in the highest degree and who are consequently able to minimise the strain on the pupils. Another criticism is that the German system is still far too rigid and far too uniform. It cannot be denied that in spite of the recent reforms, the German school system does not possess that elasticity which is necessary for progress and which one finds in England. Nevertheless, it is sensitive to the findings of science, and it is this scientific attitude of the Germans towards all problems of life which, coupled with their love of knowledge, makes the future of German education bright. There are a great many improvements which Germany wishes to introduce, but they have to wait till the finances of the country become more satisfactory.

In conclusion, I must confess that I left Germany with great admiration for her educational system. This system bears ample testimony to her power of organisation and to her thoroughness. We can not copy it and we should not, because the social and economic conditions in India are quite different from those in Germany. Our institutions must grow out of our own needs, character, national genius and traditions. Nevertheless, we can learn a great deal by studying the institutions of other countries, and, in my opinion, the features of the German educational system which are especially instructive to us in India are: (*a*) medical care of students; (*b*) education of defective

The Use of the Cinema and Wireless in Schools.

Visual instruction is a regular feature of school work in Germany. The cinema is used for illustrating lessons in geography, natural history, geology, hygiene and other subjects. The educational films which I saw in Berlin were remarkably instructive. The firm which produces such films has educational experts on its staff and therefore they are well planned on educational lines. My impression is that Germany is far ahead of England in the production of films for the use of schools.

The use of the wireless in schools is not so common in Germany as in England. This instrument of education is, however, employed by the Germans to some extent in teaching foreign languages. For transmitting lessons in English, the services of both an Englishman and a German are engaged. The Englishman speaks only in English, while the German gives explanations and puts questions in German. At a later stage of the broadcasting course, the German withdraws, leaving the Englishman to do all the talking [1].

Co-education.

The educational authorities do not view co-education with favour except in the elementary stage. They object to it during the period of adolescence on the ground that the psychological and intellectual development of boys follows a different course from that of girls. Nevertheless, secondary schools where boys and girls are educated together are not unknown in Germany. One of these is the Waldschule in Berlin, mentioned in the first article of this series [2]. In his annual report for 1926-27, the director of this school claims that co-education has produced many beneficial effects in his school, among which he mentions healthy

---

1. *Vide* "New Ventures in Broadcasting," published quite resently by the British Broadcasting Corporation.

2. See Hyderabad Teacher, April, 1928, Vol: II No. 4, page 278.

The maximum salary of a director of a secondary school is about Rs. 600 a month besides allowances. The grade for teachers of elementary schoolsis roughly Rs. 145 to Rs. 230 and for Middle school teachers Rs. 175 to Rs. 160 a month.

Burden of Teaching Work.

The number of periods allotted to a teacher in the German schools depends on his age, as the following table will show:—

GRADE OF SCHOOL.	No. of periods for teachers up to 45 years of age.	No. of periods for teachers between 45 and 55 years of age.	No. of periods for teachers between 55 and 65 years of age.
ELEMENTARY.	29	27	24
MIDDLE.	28	26	24
SECONDARY.	25	23	20

Women teachers are generally given less work and their salaries are also lower.

School Buildings.

Those who attended the Second Annual Educational Exhibition organised by the Hyderabad Teachers' Association last July may have seen the pictures of German school buildings which I had lent for the occasion. No school can be opened in Germany unless a suitable house has been provided for it beforehand. Great care is taken to see that the building has sufficient accommodation, light and air. The only defect which I noticed in the school buildings which I visited in Berlin and Weimar was that the play-grounds attached to them were not adequate. The open space one finds in these schools is .enough for drill and certain German games, but not for games like football and hockey, to play which the students have to go outside the school. The buildings are kept so neat and clean that not even a scrap of paper can be seen on the floor, waste-paper baskets being provided in the class-rooms as well as the corridor. The furniture is also maintained in an excellent condition.

directors and senior teachers of secondary schools and administrative officers of the education department. The members are appointed by the Ministry of Education. Success in the State Examination does not entitle a candidate to become a teacher. The university does not provide any facilities for the study of education in its practical aspects. He has therefore to undergo two years of pedagogical training to qualify himself for service in a secondary school. This training he receives in a seminar attached to a higher school. During the first year, besides doing further theoretical work, he learns how to apply to the practical problems of the secondary schools the principles which he has studied. In his second year, he gives regular instruction as a trial teacher under the guidance of the director of the school. At the end of the period of preparation, he appears in a professional examination, written and oral, and on passing this examination, he is declared eligible for appointment in a higher school.

It is difficult to conceive of a more thorough preparation for the teaching work than that which intending secondary school teachers in Germany receive. As a result of four years of special study at the university and two years of practice, they gain full mastery over their subjects, and what is equally important, acquire the pedagogical skill required for teaching them.

Salaries of Teachers.

A secondary school teacher receives a salay rising with biennial increments from about Rs. 225 to nearly Rs. 340 a month, but to this salary is added an allowance for house rent and if he is married, a bonus for wife and children. The bonus for wife works out at about Rs. 100 a year, while the scale for the annual bonus paid for children is as follow:—

For a child up to 6 years ...	.... Rs.	145
,, ,, between 7 and 14 years	.... ,,	162
,, ,, ,, 14 and 21 ,,	.... ,,	180

whose mental or physical development is not normal. At the end of 2 years a state examination is held, success in which entitles a student to appointment in an elementary school.

Kindergarteners. The course of training for kindergarten mistresses extends over 18 months. Provision for training such teachers is generally made in the kindergartens, where the students get excellent opportunities of not only understanding the child mind but also of learning the mother-craft, to which great value is attached in Germany. The compul-ory subjects include hygiene, music, drawing, modelling, needle-work, cooking and physical education. Girls of the age of 16 and more are admitted after they have passed the 8th year examination of a girls' secondary school. A girl who does not possess this qualification must pass the entrance examination of the training school which she wishes to join.

Secondary School Teachers Those desiring to become teachers in a secondary school have to pass the State Examination, which requires four years of study in a university after the completion of high school education. At the end of his third year at the university a student may, if he likes and if he can afford it, take the degree of doctor of philosophy. But this degree does not exempt him from the State Examination. The course for this examination includes German language and literature, pedagogy and philosophy with psychology, logic and ethics and subjects which the candidate expects later on to teach. The last-named are divided into two groups—the language-history group and the science-mathematics groups Every candidate must take up at least three of these school subjects, two as his main subjects and one as his subsidiary subject. Later on, when a student enters service in a higher school, he is allowed to teach the subsidiary subjects only in the lower classes. The examination is both oral and written. The board of examiners consists of university professors,

ground at night. Arriving there, they live the simplest possible life, mixing with the country folk, singing folk-songs, dancing folk-dances, swimming, reading and discussing questions of interest. Servants are entirely dispensed with, the entire work-cooking, cleaning and washing-being done by the young students themselves. When they depart, they leave their home as tidy as they had found it on their arrival. Internationally, the Youth Movement aims at the promotion of a better understanding among the students of different nations. The German Youth Movement was recognised by the "Internationale Confederation des Etudiants" in 1925.

Teachers

Teachers' Training.

The efficiency of the German schools is due largely to the care and attention bestowed on the training of teachers. An untrained teacher is almost unknown in Germany.

Elementary School Teachers. No one can become a teacher in an elementary school in Germany unless he has completed the full course in a nine-year secondary school and thereafter received training for two years in a pedagogical academy. These academies are not only centres for the study of pedagogical subjects, but also centres of culture in a wide sense, satisfying the intellectual, artistic and spiritual aspirations of the students and preparing them for service. In each academy club-rooms and games are provided in order to promote social life among the students, while the libraries and study-circles help them to cultivate their individual intellectual interests. Besides the theory and history of education and psychology, they are taught music, athletics and handicrafts. They have also to acquire a thorough knowledge of the subjects included in the curriculum of the elementary schools. Practical training is given in the neighbouring Volksschulen. Special attention is paid in all training institutions to the methods of dealing with boys

Social Activities and Games.

It must be remembered, however, that in Germany the influence of a teacher over boys is largely confined to the class-room. Out of school hours, he does not get as much opportunity of mixing with them as a teacher in an English Public school does This is chiefly due to the fact that the German schools are day schools. But even apart from this, "England lays more stress on the character-forming parts of education, Prussia on the mind-forming parts." This remark was made by Sir Michael Sadler a quarter of a century ago, and it is still true, though not to the same extent as when it was made I say, "not to the same extent", because strenuous efforts are being made in Germany at the present day to develop all such activities as are helpful in the promotion of *esprit de corps* among the students. Outdoor games, for instance, play a far more important part in the life of a German student now than they did before the war. Football and hockey are growing in popularity. I have watched some German games also which are conducive to the cultivation of the team spirit. Germany has now entered the field to compete with England as a sporting nation.

The Boy Scout movement is still in its infancy in Germany, but the Youth Movement is spreading rapidly. The object of the latter movenent is to improve the health of the students, to promote good fellowship and spirit of service among them, to teach them habits of self-reliance and self-help, to develop their sense of responsibility and, above all, to provide opportunities for the expression of personality. Boys, and sometimes boys and girls, belonging to the *Wandervogel* (Wandering Birds) and other juvenile organisations buy, through public and private means, a house in the mountains or by the sea. During the holidays, they travel on foot to their country home, visiting places of interest on the way and sleeping on the bare

Oberprima—really correspond to the Junior and Senior Intermediate classes in India rather than to Forms V and VI or the Pre-Matric and Matric classes. But even in *Obersecunda*, which is really the 11th year class if the four years spent in the Elementary school are taken into account, the standard in mathematics, history and geography is higher than the standard required for the School Leaving Certificate Examination in India. Unlike the School Leaving Certificate in India, the Leaving Certificate in Germany is a guarantee of the capacity required for university studies. Another important difference is that the boy studying in a higher school in Germany knows whether he will join a university after leaving school and, if so, what course he will take up there. Moreover, he may choose only that course for which he has previously prepared at school.

Discipline.

A visitor to the German schools cannot help being struck by their excellent discipline. Even the pupils of the highest class, who are 19 years of age and sometimes older, have to stand up for answering questions addressed to them either by the teacher or a member of the class named by him. The lessons are conducted in a most systematic and orderly manner. The boys always appeared to me eager to respond and anxious to learn. My presence in the classes which I attended seemed scarcely to disturb them. One finds the boys both in and out of the class-rooms happy and cheerful, but not noisy.

It is instructive to examine the causes of the discipline of the German schools. It is certainly not due to the fear of the teacher. The masters are seldom harsh to their pupils; on the contrary, they treat them kindly. The real cause is to be found in the habits of industry and submission to authority which are formed in the German boys at an early age. But credit is also due to the teachers who know how to deal with the boys and how to command their respect and win their love.

enable the pupil to apply correctly in independent work the ideas and knowledge which he has gained. Therefore in all the various divisions of this branch of study the aim must be to secure a clear comprehension of the propositions to be developed and of their proof, as well as practice and skill in their application".

Natural Sciences.

Elementary botany, zoology and biology are taught in the lower and middle classes and chemistry and physics in the middle and upper classes.

In connection with natural history, the pupils are taught to observe the simplest and most familiar forms of plant and animal life in their locality. Many schools possess excellent collections illustrative of the various departments of natural science. Great weight is attached to class excursions and the drawing by the pupils of objects studied in the class Laboratory work consists mainly in the students watching the experiments performed by the teacher rather than in their performing the experiments themselves. This is due to the fact that science in the higher schools is taught not as an end in itself but as a means of cultivating in the pupil the habit of keen and accurate observation, strengthening his reasoning powers and developing his ability of expressing clearly what he has observed.

Drawing.

Drawing is taught in all the classes. The pupils are specially trained to reproduce in rapid sketches the results of their observations. The course includes manual training—paper cutting, card-board work, book-binding etc. The programme of work in each class is closely correlated with the course of study in other subjects especially geography, mathematics and science.

It is not easy to compare the course of studies in the German higher schools with that in the Indian high schools. The two highest classes in the former—*Unterprima* and

countries and an appreciation of the place of the earth in the universe. Both geology and astronomy form a part of the study of geography, the former being employed for explaining the climatic and economic conditions and the distribution of population. As far as the astronomical part of geography is concerned, the pupils are encouraged to observe the phenomena visible in their locality and concrete materials are used to explain the information thus obtained by them. Great importance is attached to the observation of the weather and to the study of weather charts.

The Code for Prussian Schools lays special stress on the study of economic geography and on map-drawing. It also points out the advantages of arranging excursions to industrial centres, big workshops, harbours, factories, railway junctions and big towns.

Geography is taught in a remarkably efficient manner in the German schools. I watched lessons in geography in U I in one school and U II in another. In both these classes I was struck by the detailed knowledge possessed by the boys of the physical and commercial geography of the different provinces of Germany. The maps which they had drawn were also excellent.

Mathematics.

Mathematics are taught as a unit in the German schools, Arithmetic, Algebra, Geometry and Trignometry being closely interwoven. Plane geometry is taught from *Quarta* (3rd year class of a Secondary school) to *Obertertia* and solid geometry and trignometry in the four highest classes. The standard in Algebra is so high that the course for *Untersecunda* (6th year class) includes quadratic equations and of *Obersecunda* permutations and combinations and the binomial theorem. The application of mathematics to practical problems of life is emphasised in all the classes. "The chief object of mathematical instruction", says the Code, "is to provide such a training of the intellect as will

richness of German culture. Great personalities such as spiritual leaders, statesmen, inventors and explorers should be set before the pupils as examples of those who have served the interests of the country".

"Civics should be taught in connection with political history so as to create among the students an understanding and love of the Fatherland. Attention should also be paid to economic and "kultur" history, and with reference to the latter, the State should be depicted as the most powerful of all "kultur" institutions".

The only allusion to the "spirit of international reconciliation", the cultivation of which in schools should, according to the Weimar Constitution[1], be one of the aims of education , is to be found in the following passages.—

"The relation of German history to the history of the world should be clearly pointed out and the great deeds of foreign peoples should be duly acknowledged".

"A philosophical point of view is necessary for a thorough understanding of the inter-relation of historical events. The history of fine arts shows best how the different nations have learnt from one another".

It is evident from the suggestions offered in the Code that hardly any freedom is given either to the teachers or to the students to form their own judgments. Their judgment is mostly formed for them by the educational authorities.

Geography.

Geography is taught side by side with history, and for this reason history and geography are often classed together as a single subject and taught by the same teacher.

The aim of instruction in geography in the lower classes is to give the pupils a thorough knowledge of their environment, detailed information about Germany and German-speaking regions, general familiarity with foreign

1. See the first article of this series published in the HYDERABAD TEACHER for April, 1928, Vol. II, No. IV.

Unterprima, and from the end of the *Thirty Years' War* down to the present time in *Oberprima*.

Abundant use is made of pictures, charts and maps in teaching history. Excursions to places of historic interest also play an important part in instruction in this subject.

In a Reformgymnasium in Berlin I attended a lesson on Greek history in *Obersecunda*. The teacher had notes of lessons on his desk, but he knew his subject so thoroughly that he had little occasion to refer to them. At first he devoted a few minutes to repetition. This is done in connection with nearly every lesson in Germany, the object being partly to divert the attention of the pupils from the previous hour's lesson and partly to connect the new matter with the old. The lesson for the day was the War between Macedonia and Persia. The teacher explained it with the aid of a map and wrote a short summary on the blackboard as he proceeded. He frequently put questions to the class to make sure that they were following him. Towards the end of the hour he called a few boys to the platform, one after another, to give a summarry of the lesson. I noticed that just at this point the attention and interest of the class began to flag.

The German method of teaching history is to select the most important events of each epoch, though special attention is paid to the German history of the 19th century. The chief aim continues to be the fostering of a national spirit, as the following suggestions offered in the the Code for the Prussian Secondary Schools, referred to above, will show: [1]

"The study of history should help to create in the young men a love of their country. The social and economic history of the German people and their characteristics and achievements should be carefully impressed on the minds of the students. They should be made to appreciate the entire

1. I am indebted to Dr. Syed Jafer Husain of the Osmania University for this translation.

There can be no doubt about the soundness of the methods employed in Germany for teaching English. But in order that they may be successful, it is necessary that the teacher should be thoroughly acquainted with the language, literature and culture of the English people. My impression is that teachers of the type of Miss Schmidt, whom I have mentioned above, are exceptions rather than the rule in Germany at the present day. Though the importance of the study of English in the German secondary schools has increased in recent years, I believe that they possessed more efficient teachers of English before the war than they do now. The reason is that for a long time after the war the Germans were not allowed to visit Allied countries, and subsequently when this restriction was removed, financial difficulties prevented teachers from visiting England. Recently, however, the system of exchange of students which has been established with England and U. S. A. is making it possible for intending teachers to gain a better command over the English language by residence in England.

History.

The course of study in history in *Sexta* consists of stories from the national history, beginning with incidents connected with the pupils' own environment. History is worked from the present back into the past until in *Quinta* the students reach the legendary history of Greece and Rome. The process is reversed in *Quarta*, where the chief events of Greek history are studied to the death of Alexander the Great and of Roman history to the death of Augustus. In *Untertertia* the chronological order is followed to the end of the Middle Ages. The course for *Obertertia* is from the end of the Middle Ages to the accession of Frederick the Great, from which point the work is continued to modern times in *Untersecunda.* In the three highest classes is carried out an intensive study of the different periods—of Greek and Roman history in *Obersecunda*, then mediaeval and modern history to the end of the Thirty Years' War in

U II. Shakespeare: *The Merchant of Venice.*
Dickens: *Oliver Twist.*

O I. Shakespeare: *Hamlet.*
Bernard Shaw: *St. Joan.*
Seeley: *Expansion of England.*

The aim of teaching English in the German higher schools is not merely instruction in English language and literature, but also study of English national life and culture through language and literature. Students of English are expected to know something about the industrial and social history of England as well as the development and present condition of the British Empire. For this purpose, the teaching of English is correlated with the course of study in history and geography. The text-books, especially the selections, also give them a knowledge of the customs and culture of the English people. The study of English national life thus helps the students to understand English literature, while the study of English literature gives them a knowledge of English national life.

The main features of actual class instruction in English in the middle and high sections are reading, linguistic exercises connected with the reading material, discussion of the contents of each lesson, written composition and translation. The use of German is avoided as far as possible. Grammar is taught inductively and incidentally, and not as a separate study. The pupil learns his grammar as he meets it in the text, his attention being drawn to the rules during the reading. Grammar is considered to be not an end in itself, but a means of strengthening the pupil's command over the language.

English in the German schools is taught not merely as language but also as literature. The boys are trained to appreciate good literature and their critical faculties are brought into play by their being asked by the teacher such questions as "What do you think of this story"? "Why is this passage beautiful"?

three months. At the end of the period, the teacher showed me their written work, which was extremely neat. It was all in ink and had been done entirely in the class.

I was much impressed by the thoroughness with which both the lessons mentioned above were taught. The teacher Miss Schmidt had a surprisingly good command over English. Her pronunciation and accent at first led me to imagine that she was an Englishwoman, but subsequently she told me that they were due to the fact that she had spent many years in England. But it was not her knowledge of English alone which made her lessons so effective; she knew how to teach English.

The text-books used in the middle classes are generally selections from authors like Stevenson, Kipling and Irving. They also contain poems, short biographies and short dramas. Students of the high section have to study besides Shakespeare, poetical passages from Milton, Wordsworth, Coleridge, Byron, Shelley, Keats and Scott, while the authors selected for prose are Carlyle, Emerson, Dickens, Chesterton, Shaw and Wilde. The tendency is to prefer modern authors to classic writers. I give below the names of the books that were in actual use in the Prussian Reformgymnasien last year:—

O II. *Tales and Stories from Modern Writers.*
U I. Doyle: *The Memoirs of Sherlock Holmes I.*
Dickens: *A Christmas Carol.*
Jerome: *Three Men in a Boat.*
O I. Shakespeare: *Hamlet.*
Galsworthy: *Strife.*
Aronstein: *Selections from English Poetry.*

The books which the students of the Realgymnasium at Weimar were studying last year were as follows:—

U II. Burnett: *Little Lord Fauntleroy.*
O II. Wells: *The Invisible Man.*
Irving: *Tales of the Alhambra.*

and subsequently to make sure that the pupils had understood the explanations given in English, the teacher made them translate difficult words and sentences into German. After this, the blackboard was rubbed and the pupils were asked to write down in their exercise books the words and sentences which they had learnt. A few minutes were then spent in giving the pupils practice in conjugating such new verbs as they had come across in the lesson. Finally, the class sang in chorus a previously learned song which contained words with which the pupils had become familiar.

In *Quinta* the lesson began with conversation about the weather. After this subject had been exhausted, the teacher engaged the class in conversation on the last school excursion. Errors of grammar and idiom committed by the pupils in their answers were carefully corrected. It was evident that the girls loved taking part in excursions, for when the teacher informed them that an excursion had been arranged for that week, their faces beamed with joy. The class was then introduced to the lesson on "School Excursions" in the reader. Particular attention was paid to reading and pronunciation. Words with which the girls were not quite familiar were written on the board and the pupils were made to use them in sentences of their own. The teacher explained to them the words 'thirty feet high' by telling them that the walls of the building mentioned in the book were twice as high as the walls of the class-room. She also made them convert thirty feet into metres. To ascertain that the girls had really understood the meanings of the difficult parts of the lesson, she got them to translate them orally into German. She followed this up by giving them in German sentences bearing on the lesson for translation into English. Finally, she called a pupil to the platform who put questions to the rest of the class on the subject-matter of the lesson. The power of expression which the pupils displayed was remarkably good, considering that they had been studying English only for a year and

simply to show them how a certain word is written. Throughout the conversational lesson, special stress is laid on pronunciation.

I shall now describe how English is taught *ab initio* in the Elisabeth Staat Gymnasium for Girls, Berlin, where the pupils generally take it up as the first language, and consequently commence it in *Sexta*. The girls in this class had been studying the language only for 3 months when I visited the school. Within this short period, they had learnt by the Direct Method to converse on the objects in the class-room and had already been introduced to the first reader containing, among others, the following lessons:—

1. Numbers.
2. Easy sums.
3. Objects in the Class-room.
4. Commands and answers,
5. *(a)* Rhymes; *(b)* Cat and Mouse (Poem).
6. *(a)* School Room; *(b)* What the Teacher does.
7. At School: Work and Play.
8. School Excursions.
9. Washing and Dressing.
10. On the Way to School.
11. Our Home.
12. Proverbs.

The first four or five lessons are taught in *Sexta* and the remaining ones in *Quinta*. The lesson for the day in the former class was "The Class-room". The teacher at first questioned the class in English on the objects in the class-room and wrote down on the blackboard the answers thus elicited. "This is a desk"; "That is the wall"; "There are six pictures in the class-room" and so on. She then read out the lesson in the reader in a loud and distinct voice. The pupils followed her, one after another, and each mistake made by them was corrected by her. The class were made to repeat in concert words which presented any difficulty to them. The meanings were carefully explained,

Hyderabad Teacher to know what standard is aimed at in Germany in those subjects which are common to the German higher schools and to the high schools in this country and how the teaching is conducted. I was especially interested in the teaching of English, which was, in fact, the only subject in which I could follow the lessons thoroughly; but I watched instruction in other subjects also and was able to form some idea of it with the kind assistance of the head-masters and teachers concerned.

English.

In the initial stages, the teaching of English in the German secondary schools is based on two great principles: *viz.*, practice in using English sounds, especially those which are not found in German, and practice in conversation. After the sounds have been practised with the aid of a phonetic chart, the children are taught to count in English. As they are already familiar with the symbols, their attention is not diverted from the sounds. The lesson on the numerals also gives the teacher an opportunity of speaking to the pupils in English. He begins by such sentences as "Can you count up to 30 in English"? "Read the numbers on the board". Other sentences follow corresponding to actions on the part of the teacher, for example, "I take the book"; "I write". The pupils watch his actions and repeat the words after him. He then gives them commands, taking care to use only those words with which they have become acquainted. Explanations in German are given only where they are absolutely necessary for making the meaning clear. After having thus acquired practice in listening, the pupils soon learn to express simple facts in English. The sentences learnt by them are written on the board in ordinary characters and not in phonetic characters, though the use of the phonetic chart is continued for reference. The children are not required to find out from the letters what the sound of a word is; the aim is

The German School System

III

BY

SYED ALI AKBAR, M. A. CANTAB:

Divisional Inspector of Schools, Hyderabad-Deccan.

Secondary Schools (Continued from the previous issue.)

Size of Classes.

THE higher schools of Berlin are big institutions with 600 to 750 pupils on the rolls. The size of the classes is generally larger than is consistent with efficient work. One sometimes finds as many as 55 boys in a class. In the Oberrealschule Schiller Strasse, Charlottenburg, which is one of the leading gymnasien in Berlin with 700 pupils on the rolls, I found that there were only 35 teachers for 24 classes. The Director, who had studied at Cambridge before the war and spoke English perfectly, informed me that the educational authorities recognised the disadvantages attached to large classes, but owing to the financial stringency, they were unable at present to increase the number of teachers.

Expenditure.

The expenditure of a German higher school depends on its size and on the number of classes. The annual expenditure of the school which I have mentioned above is 330,000 marks (Rs. 2,22,750), out of which 290,000 mark are spent on the salaries of the teaching staff.

Courses of Study and Methods of Instruction.

The Educational Code for the Prussian Secondary Schools *(Richtlinien für die Lehrplane der hoheren Schulen Preussens)* issued by the Prussian Ministry of Education in 1927 gives detailed information regarding the scope of different subjects and lays down the principles to be followed in teaching them. It may interest the readers of the

be made to learn from their mistakes. Written exercises must be scrutinised, both in regard to logical statement and to accuracy. It is not sufficient to discover merely whether the sums are right or wrong. Where errors are due to misunderstanding the question, or to faulty reasoning, or to unsuitable arrangement of the work, the children either individually or in groups may need some help from the teacher before they are able to rectify their mistakes; but slips in calculations can, as a rule, be discovered or corrected by the children themselves. It is not an adequate substitute for individual correction for the teacher to work through all sums on the black-board regardless of the number in the class who have already obtained the correct answer. Generally speaking, sums inaccurately worked should subsequently be 'got right' by the child or children concerned; to allow the child to leave his work uncorrected is to encourage him to think that it is not necessary to get sums right.

In conclusion a few remarks from Garlic's 'New Manual of Method' are mentioned below:—

"Good teaching will seek to reduce the labour involved in the work to a minimum; to supply easy and short rules, clear and intelligent method, sufficient and suitable explanation backed by well-chosen examples. The newer and abbreviated methods will enable the teacher to get rid of cumbrous operations which breed fatigue and disgust for the subject. Assistance will be so given as to encourage self-effort; the method of teaching adopted will strengthen concentration which is all essential in arithmetic, and it will insist upon the work being set out in a neat legible and clear style, whilst numerous suitable exercises will ensure rapid and accurate computions and solutions".

of the pupils should be on similar lines, though care should be taken that in applying symbolic expressions, they do not merely replace letters by figures without reflecting on the relations expressed by the formulæ used. Any sum attempted should, as a rule, be correctly solved, before another is begun.

While practising independently, the pupils should feel that they have to rely on themselves, and only in case of real failure, should the teacher step in and use the blackboard for explanation. In their work they should be trained to do their sums not only neatly but quickly, that is, as quickly as is consistent with accuracy. The first essential is accuracy, the second rapidity.

Rapidity and accuracy can only be secured when the pupils have undergone systematic training and have thoroughly memorised all essential tables and can perform quite automatically all the necessary mental calculations. 'Drill' to secure the power of rapid, accurate and automatic mental calculations should occupy the first 10 to 15 minutes of every arithmetic lesson.

Two suggestions with regard to the attainment of accuracy may be made:

(*a*) Children should be required to review and check the working of each sum they may work, and when possible, they should compare each answer with an approximate answer previously obtained mentally; *e. g.*, before starting to multiply 15 annas and 10 pies by 86, they should realise that the correct answer to the sum must approach but cannot exceed Rs. 86.

(*b*) Children should frequently be set to work quickly the sums which prevent no difficulty as to method; in this way they may be led to combine speed with accuracy, and a valuable opportunity is afforded for revision.

In arithmetic, as in all written work, systematic correction is of the greatest importance and children should

Interest on Rs. 100 for 1 year = 'r' (rupees).

„ „ 'P' „ „ $= \frac{P \times r}{100}$ (or $\frac{P\ r}{100}$)

„ ('I') „ „ „ t years $= \frac{P}{100} \times r \times t$ (or $\frac{prt}{100}$).

$$I = \frac{p \times r \times t}{100} \text{ or } \frac{p\ r\ t}{100}$$

Amount (A) = (Principal + Interest) = P + I.

$$\therefore \quad A = P + I.$$

$$\therefore \quad A = P + \frac{prt}{100} = P\ (1 + \frac{rt}{100}).$$

Each of the above formulæ is, of course, arrived at by the use of first principles. When once a pupil has become familiar with such formulae he can apply them in working out problems and save much labour and time.

Formulae for areas and volumes are vitally necessary at this stage, as much of the new work in higher forms deals with them. Often quite simple sums are worked wrongly by advanced students because they are not familiar with formulæ. In order that these short cuts may be properly fixed in their memory, it is necessary that they should work many sums of the same type.

Such exercises are the most convenient and suitable stepping stones to Algebra. In the pupils' mind the symbols will stand for well-understood quantities and the operations performed will be grasped as relating these quantities in certain definite ways.

In working problems the pupils should be trained to grasp the method of solution as a whole and not piece by piece. In black-board work the invariable rule should be to call on pupils to state in general terms how the whole problem is to be solved. After a time with careful and sympathetic criticism they will become expert in doing this in a very precise and concise manner. General terms should then be written down symbolically as the first statement in the working of the sum. The written work

stating below how a formula for finding out simple interest on a certain sum for a given period at a specified rate can be arrived at.

Concrete example :—X borrows Rs. 400 from Y and repays it with interest at 12% per annum 3 years hence. How much interest will X pay for the sum borrowed?

In the above question, Rs. 400 is the money borrowed, which, in mercantile language is called the 'Principal'. The rate of interest for 100 for one year is 12. It is termed as the rate per cent. The time is 3 years.

The working of the sum would be as shown below :—

Interest on Rs. 100 for 1 year = Rs 12.

,, ,, Rs. 400 ,, ,, $= \frac{400 \times 12}{100}$

,, ,, ,, ,, 3 years $= \frac{400 \times 12 \times 3}{100}$

= Rs. 144.

At the end of 3 years X will have to pay Rs. 144 along with Rs. 400 which he had borrowed. In all Y will get from X Rs. 400 + Rs. 144 = Rs. 544. This sum (*i. e.* Principal + Interest) is known as Amount.

The above answer will be expressed in symbolical form in the following way :—

Let 'P' be the Principal in Rupees, 'r' the interest on Rs. 100 for one year, and 't' the number of years for which the interest is to be found out; let 'I' stand for the interest required. The above answer *viz.* Rs. $\frac{400 \times 12 \times 3}{100}$ will in symbolical form be expressed as $\frac{P \times r \times t}{100} = I$ or $I = \frac{P \times r \times t}{100}$.

The formula $(I = \frac{P\,r\,t}{100})$ for finding out interest on a certain sum, at a given rate, for a certain period may be sought in the following manner :—

which they have performed. At this stage it is unnecessary to prescribe the method of arranging a sum. Any method is good, so long as the arrangement and the accompanying wording clearly express in the children's own way the meaning of the operations involved. That the arrangement should be intelligible and clear is almost as important as that the answer should be correct. Later on, when there is no doubt as to the child's grasp of the nature of the operation, it is easy to suggest by suitable examples the most convenient and concise methods of arranging the various sums.

Just as in the work of the lower standards it is necessary for the children to have at their fingers' end the various instruments of arithmetic *viz*: multiplication tables, tables of money, measure and weight etc., so in the work of the upper standards it is necessary for the boys to have at hand various formulæ and the equivalent values which shorten labour and time in working out sums. All this makes up what is called the 'Vocabulary of Arithmetic'; those who have it not can be but poor mathematicians. The aliquot parts of rupees and pounds, maunds and seers, miles, yards etc. are all very much required and should be learnt once for all. Similarly, fractional values of certain decimals (as mentioned in the previous article) and percentages should be well-known to the pupils working at arithmetic. Thus the equivalents of thirds, quarters, eighths and of $2\frac{1}{2}$, 4, 5, 10, $12\frac{1}{2}$ per cent should be known so as to be ready for immediate use. The allied percentages of $7\frac{1}{2}$, 12, 15, $37\frac{1}{2}$ and so on can be obtained rapidly from $2\frac{1}{2}$, 4, 5, $12\frac{1}{2}$ and thus direct memorisation will not be considered so necessary.

The simple interest formulæ have their uses in problems in which rate, interest or time has to be found. It is not too much to expect that the pupils of Form III and above should be able to derive the formulæ by the inductive method and apply the same while working out the problems. I am

form of problems should now become a feature of teaching, though even now it will generally be necessary to spend at least one lesson a week in purely mechanical operations. A weekly revision-test is also necessary to ensure that the first principles are not forgotten.

The efficient handling of the subject demands that it should be taught inductively and applied deductively. Every new rule or truth should be taught by the inductive method and the rule should not be applied to the working of examples until the reasoning underlying those truths is perfectly clear to the class. There must be no scrappiness in the teaching. This should not, however, mean that the class will remain at one type for several weeks together; the danger to be avoided is that of doing merely half a dozen sums of a type and then passing on to a totally different kind of sums before the mind has had time to assimilate the rule and its application.

Following the teaching of new rules, the mental and black board work should gradually increase in complexity so that the pupils may be able to apply the rules in many and varied ways. In this way they would gain a fair command of the new principle and would be able to advance to quite independent work at more difficult examples, which should be as varied in their nature as possible. Teachers should take care that each example gives some fresh food for thought and that the pupils honestly strive to work it for themselves. Independent work is quite essential. The teacher or a clever pupil should show the way only when an honest, sincere attempt has ended in failure. By this means the teacher can train his pupils in self-reliance, confidence and power—qualities very necessary to all successful and effective life.

So long as the first sums which are attempted are sufficiently easy and the work is done with the help of apparatus, there is no harm in allowing the students to write down the 'short hand' statement of the operations

Pencil drawing however has its potentialities as a means of expression and was more appreciated in the first half of the last century than it is to-day. The desire for colour and the young artists' eagerness to adventure with brush and canvas may account for this, but for fine technique, the pencil is a pre-eminently fascinating medium. Tone after tone, varying in the smallest degree, and perfect graduations are possible. Any manner of broken surfaces can be rendered with whatever density or luminosity it is desired to give.

The subject of perspective is often confusing because it is the drawing of appearances and not of facts. We know that the opposite side of the table is as wide as the head side, but the further side really appears shortened to the eye and should be so drawn.

The analysis of natural forms such as flowers, birds, and so on provides additional starting points for study and observation.

The Teaching of Arithmetic in Secondary Schools

BY

D. C. BHOGLE B. A., B. T.

WHEN after the completion of the Primary course, a child enters a Secondary school, his mind should be awakening to the possibilities of Arithmetic. The mind of the average child is now ready to deal with the logical difficulties that will arise and he should be able to conquer them without much trouble. Under suitable stimuli, even the average child will discover that there is something after all in the dry bones of the subject. There is, of course, much new work to be done. The setting of sums in the

Drawing

BY

MISS R. D. LOVE. (*Mahbubia Girls' High School.*)

THE whole trend of modern teaching of drawing is towards the elimination of copy. The Cambridge syllabus of to-day is one example of this. A few years ago only a small copy to enlarge a shaded figure was given; to-day this section comprises besides Common Object, Memory and Design, Historic Art Painting, Perspective, Geometry, Still Life, Architecture and Drawing from Life, requiring as highly trained a teacher as any other section. South Kensington, London, is another example, and for many years the great stumbling block to progress in England was the system of teaching in vogue in the schools, based largely on the copying of lines, and conventional symbols known as Freehand drawing or the "wire line". Its cramping influence has stifled the artistic talent of thousands of children. At that time any one was considered good enough to teach drawing. That day is past.

As regards the importance of drawing in schools, it prepares the ground for the ultimate development of a system of Art Education indigenous to the country, and secondly is the basis of the arts of painters, designers, architects, as also of engineers, draughtsmen, scientists, artisans and all workers in trade workshops.

Its function is to develop the general mental power of the child, to teach him to observe, remember, or to visualise. Young children's hands find the flexible brush more suitable than the unyielding point of the pencil. Interest is maintained by the closer copy of nature and taste is developed by the charm of colour. An orange is a yellow disk, and to see it under the guise of a curved black line implies a process of mental abstraction which is by no means natural to young children.

human being's moral power and strength of character increases and the converse is equally true. If we could infuse the spirit of this kind of discipline into family and school life, making it systematic and continuous from the earliest years, there would be fewer "slackers" growing up into inefficient bloodless manhood and womanhood. India will become greater as her kindergartens become greater in number and more efficient. Then let the Training Colleges for kindergarten teachers be built in every city making them accessible to young men and women who long to serve their country.

When I grow up, oh, what shall I be?
A merchant dealing in silks and tea?
A tailor?
A sailor?
Or even a jailor?
A fireman rather appeals to me.
When I grow up, oh what shall I be?
An actor people will crowd to see?
Engineer?
Mountaineer?
Or a bold buccaneer?
S'pose I shall just have to *wait and see.*

---

of Gopal, and Gopal the freedom of Abdulla. The understanding of punishment, the study of nature, the lilt of music, the feeling of being able to do things, to actually complete a useful thing in a manual class, to knit, to sew, to draw, to dramatise, to pretend, to compete, the joy or sorrow of Prize Day—all these tend to build up a character that will nobly serve India.

Even the First Aid outfit in the teacher's office is a source of interest and perhaps plants in a youthful breast the longing to serve suffering humanity, a longing that may develop into reality some day. The learning about children of other lands, their customs, their joys their griefs and their history surely cements the future of the League of Nations.

Not less important are the habits of cleanliness to be practised every day. Who knows but that the daily observance of hygienic ways in the school room, play ground, extending to the homes may produce a citizen who will free Hyderabad from the plague grip and the horror of cholera and other deadly diseases by the installation of municipal sanitary streets, compounds and public buildings.

A pedagogue of many years' experience has said that she thought a kindergarten in every section of a large city would close up its penitentiaries, its insane asylums, its almshouses, probably many a hospital, and that there would be no beggars in our streets.

Doing right would not be such a hard matter if we practised it a tenth part as much as we practise the piano for instance; and the kindergarten should give plenty of room for children in this direction.

"Do noble things, not dream them all day long",

Should be its rule—to develop moral feeling and the power of moral doing, we should guide every action. To punish wrong feeling and wrong doing no matter how necessary for the social state does not develop right feeling and doing. With every free conscious choice of right, a

Round about our schools there should be much scope for a play-ground—a play-ground in the true sense of the word, a place for play, play that will strengthen the body, play that will build up character by love of clean sport, fairness, kindness, gentleness, and a desire to win for the honour of the school as a whole. Richly endowed are those schools which possess a swimming pool, a may-pole, a "slippery-dick", a cricket outfit, gardens and gardening tools, or even a see-saw. Let us ever instil in the young mind the joy of "playing the game".

Inside, the school walls should be adorned to catch the wandering youthful eye, with charts, friezes, pictures, and let them be varied, firing the imagination and delighting the child. Oh! how much can be learnt through the eye!

Even for five-year-olds we can have libraries. Any school can have a room set apart for picture books and story-books to suit all tastes and ages of the pupils.

And can a child be ever too young to grapple with correct word pronunciation of his own language or of a foreign language which he is required to master? In some of our Hyderabad schools English is taught from the kindergarten class, and the babes conquer the difficulties which if left to later years are insurmountable. Mathematics approached through number games, presented under happy conditions lose all their fierceness, and concrete methods of teaching number form a sturdy basis later on for geometry, trigonometry and calculus if the mind is thus prepared.

It is never too early to form friendships, as life at its most is but a span, and many a friendship is formed in the kindergarten which lasts for ever. This comradeship develops the finer feelings, the give and take of life, self-sacrifice, the ability to enjoy fun and produce laughter. A child's laughter! the true music of the universe.

The law of liberty must be evident in every school, freedom being a birthright. Abdulla must honor the freedom

How important then are our Kindergartens, the Preparatory and Primary departments in our scheme of education!

Scholastic pressure is becoming greater each year. The universities are demanding more, and for that reason the pressure is becoming greater down the line even upon the kindergartens and first grades. That pressure has a tendency to crowd out all activities other than those necessary to prepare for the class that follows. As teachers we must combat this tendency and realise that the mere teaching of subjects may prove harmful unless the building of character goes hand in hand with it. The more knowledge an unscrupulous man acquires the greater the possibilities for evil. Science is placing before us tremendous possibilities for good or evil. And the net result to society and to the country depends on the character of the individual. The foundation is laid on the early years and for that reason the kindergartens are of vital importance for the proper equipment of future generations.

The question arises: At what age should a child enter upon kindergarten school life? England, America, Australia and other countries have provided a syllabus for children from the age of five in the ordinary Governments schools, though each of these Governments has prepared special syllabuses also for orphan children who are younger, and for children whose mothers are obliged to earn their living. However the age of 5 seems to be the time when the average child should come under directed influence in the way of learning and play. Especially in India, it seems to me, should children come in their early years into the regular school life, for otherwise they would spend a great part of each day in the care of servants.

Our schools must then be equipped to receive these young children who very soon, for school life is short, must take their place as citizens of India.

sound basis. In the first place, it must be felt that as good an intellectual training can be given through subjects of interest to a cultivator as through subjects which have only an interest to people in towns. Secondly, I feel that if education is to appeal to the rural classes it must be given by teachers who are naturally capable of appreciating agricultural questions or who have been trained to do so. And thirdly, I feel that the schools in the village must be made to have much closer connection with the life not only of the children but also of their parents and all those whose main occupation in life is agriculture.

The Kindergarten as a Foundation

BY

MISS D. WEBSTER.

St. George's Preparatory School.

THE children of to-day are the citizens of to-morrow. The children, boys and even girls—for the latter are soon to come into their own in our schools—are to be the citizens of India in a few short years. It is generally recognised that schools help considerably in the forming of this citizenship, but do we realise how early in a child's life this training can commence?

The syllabus of every school must supply the material for this foundation building. A house built on sand cannot last, a tree cannot stand the sweep of gales if its roots are not strong and firmly fixed. So, to secure strength in a nation the foundations of education should be properly laid.

The second difficulty was even greater, and I am not sure it has been met yet. This was the absence of trained teachers with any knowledge of agriculture and all that it means. In fact in my part of the country the trained teachers employed have been even more urban than might have been expected.

Hence the necessity of giving special training to teachers who would teach in schools with an agricultural outlook in the country. These have been difficult to find. And so it was decided in Bombay to give as many trained teachers as possible a special year's course in agriculture and in agricultural teaching before sending them to rural schools. A very similar course has been adopted in the Punjab. But the number of teachers that can be so trained is small and hence a development of this type of training in the schools is pretty slow. But I may say that in Bombay there are about 70 Upper Primary or Lower Secondary schools with an agricultural bias now established. In the Punjab there are a slightly greater number, while a similar system is being introduced in several other Indian Provinces.

How far is some system of this sort capable of being established in the Nizam's Dominions? I think myself there is every opening for it, and I understand that this is also the opinion of a large number of those who are in authority in this State. I have recently drawn up for Government a draft scheme for an agricultural College here in Hyderabad and I have proposed that it should definitely lay itself about for the further training of trained teachers for rural schools attached to which should be gardens or small farms in which the boys would get actual agricultural experience as a part of their ordinary mental and intellectual training.

It is very likely that development in this direction will be slow but I am confident that three things will have to be done before we feel that rural school education is on a

Bombay. On the whole these have been a great success, and have become very popular in all the language areas of Bombay, and most of them are always full to the limit of their accommodation. They have not however been approved by the recent Royal Commission on Agriculture, though I think they do represent the fulfilment of a definite need, especially in the raiyatwari tract of India.

But these do not represent the solution in any sense of the problem of rural education. It is only since 1920 in any part of India that any effort has been made really to ruralise education among the agricultural classes. The biggest efforts in this direction have however been made in the Punjab and in Bombay, and the method has been in both cases to convert the Upper Classes in Primary schools into centres in which the training shall definitely have an agricultural outlook. When a development of this sort was considered two difficulties immediately presented themselves. The first was that almost all the vernacular books in schools had been prepared by people who definitely had a non-agricultural outlook. Thus, for instance, all the reading books are full of stories which have little or no connection with rural life. The books on Arithmetic deal not with those things which are continually coming before a cultivator in the country but rather with things which could not possibly occur under his circumstances. So that it is necessary, if such assistance as I have indicated is to be a success, to ruralise the text books in reading, in Arithmetic and in every other subject taught before it can be done. Comparatively little progress has been made along these lines. But one of my old students in Bombay has prepared an agricultural Arithmetic which is now in very large use and has been translated into at least two vernaculars of the Bombay Presidency. Reading•books are gradually being produced which while equally valuable from an educational point of view yet deal with matters which are of special interest to people in the rural areas.

that he would not keep his boy at school beyond the Third Standard, and when asked why not, he said that if he did, the boy would be lost to agriculture.

Not only is our present system of rural education considered unsatisfactory by the local people but it is also considered as of doubtful value by most educational authorities in the country. In almost every educational or agricultural conference I have attended, the criticism of the present methods of rural education have been continuous and it was this fact which led me in my earlier days in the Bombay Presidency to take a very special interest in this subject.

The demand has usually taken the form of a request that Agriculture should become a subject in rural schools. This was certainly the case in the Bombay Presidency and in my experience was put forward with very great vehemence at an Agricultural Conference held in Poona in the year 1910. At that the Director of Public Instruction who happened to be there refused to entertain the idea and said with a good deal of justice that with the staff of teachers at his disposal any attempt to introduce agriculture as a subject in rural schools would be a farce. The teachers could not teach it and would become a laughing stock of the country people.

Seeing that the educational authorities at that time would not direct the school studies in an agricultural direction, I proposed, not as a substitute, but as a means of doing something in the direction desired, the establishment of special agricultural schools to take the place of the Upper Primary or Lower Secondary standards in certain areas. This proposal was accepted by the Bombay Government and a number of such schools has been established. These are purely vernacular schools definitely vocational in character which provide both boarding and lodging for a limited number of boys of the rural classes in many of the districts in

Rural Education

BY

HAROLD MANN, D. Sc.

THE object of education, I take it, is to enable a boy or a girl to make the very best use of the faculties they possess. Now it is possible to use the best faculties of any man or a woman in almost any kind of human activity, and as in this State,—as in most parts of India, an enormous proportion of the population is connected and is likely always to be connected with agriculture, the main object of education should be, it seems to me, to enable those under its influence to utilise their faculties to the greatest possible extent in connection with the carrying on of agriculture and the improvement of the rural conditions.

So far I think everybody would be in agreement but when we try to think out how best education can be presented and what form of education should be presented in the rural areas of any part of India there is at once a very great deal of difference of opinion.

And yet I think that no one whom I have ever met has been really satisfied with the present system of education adopted in the rural areas of the country. It is certain that the people themselves in these rural areas are not satisfied, otherwise the efforts to promote compulsory education in so many parts of India would not have generally or so completely failed on account of the apathy of the population of the rural areas. Or again, an incident which happened not very long ago in Bombay could never have occurred. In this one of the leading Patels of an area in the Konkan stated

*A lecture recently delivered at a meeting of the Hyderabad Teachers' Association.

But speech betrays him for a popinjay "
Sudarsana, by these thoughts comforted,
From the flower-decked bank arose. Anon he called
The Brahmans and the wisest of the realm.
"O Pundits, help me in my sore distress.
I seek a Guru for my thoughtless sons
To form and guide their minds, though idle grown
As glass in golden setting shines a gem
E'en so a fool gains lustre midst the wise.
Who then amongst you all will redirect
Their wandering footsteps to the Vedic path?"
Forthwith there rose a wise and learned sage
Great Vishnu-Sarman, who lowly bowed and spake.
"My lord, be pleased to grant to me this task.
Before the year the half its course hath run
Your sons on wisdom's path will surely tread:
No fools are they but merely wayward grown.
All know 'tis useless waste of time and toil
For wisemen to instruct unworthy fools.
The heron, taught for years, can never learn
The parrot's art of speech. But you're no sire
Of stupid sons. No common glass is found
In ruby mines. Your sons I'll quickly teach."
Then spake Sudarsana with heartfelt joy,
"O wise and holy sage! Thy wish I grant.
Be thou the Princes' guru and their guide
To knowledge of what's due to King and realm.
As polished stones on mountain sides will shine
Like precious jewels in the Sun's bright beams,
So unwise minds will catch the glistening light
Shed forth by wisdom's Sun. The insect hid
Within the wreath may find itself upraised
To seat of honour on a wiseman's brow.
The river water's sweet where first it springs
But on its winding seaward course grows foul
A young man's inborn qualities of good
May turn to foulness if the influence
Of worthless, evil comrades run unchecked;
Be't thine to dam such streams from my dear Sons."

Obedient, healthy, virtuous and wise!
Honoured by all is he. But a foolish son
Is to his father as a feeble string
Stretched in a bow whose shaft is stout and true.
Wherein is man distinguished from the beasts
Save by a virtuous soul and well-taught mind?
Better unborn than, lacking these, to live.
But who may strive against his natal stars
That destiny determine? Lo! the fates
Of the very Gods themselves are firm decreed.
Stark nakedness great Shiva's destined lot;
To sleep upon the serpent's outstretched hood
The fate of Vishnu. If, then, foolish sons
Are my appointed fate, 'tis vain to mourn
And useless to rebel. What is, is best.
Nay, nay, it cannot be: such thoughts are weak,
A coward's plea; contentment such as this
Is often naught but idleness disguised,
A cloak to hide our duty unfulfilled.
Whate'er is worth possession must be won
By effort, e'en as oilseed must be crushed
Before 'twill yield its gifts for toiling man.
Each man must show himself the lord of fate.
Fortune's the servant, not the master here.
Ne'er should the manly and the strong put forth
The Plea "It is my fated destiny",
For destiny though evil must be fought.
The Potter moulds the clay to his desire.
Man's fate is but the clay upon the wheel
For courage and strong will to shape anew.
Not by mere wishing but by work man wins
His way. The sleepy tiger finds no food.
The neglectful father is his sons's worst foe.
Though sprung from wise and virtuous parentage
The children must be taught ere they themselves
Attain to knowledge and their sires' repute.
Of what avail high birth and handsome looks
If these be found conjoined with ignorance?
A fool in fine clothes dressed, whilst dumb, may please

A Poetical Introduction to The Hitopadesa

BY

FRANK R. SELL, M A.,

Professor of English, University of Mysore.

Pataliputra's virtuous King Sudarsana
Walked in his palace garden fresh with flowers
And heard a Brahmin sing melodious verse
In praise of learning and the noble wealth
That wisdom gives e'en to the poorest man.
"O knowledge, priceless amongst the boons of life,
Once gained, ne'er lost; from wicked robbers safe,
Not vended in the mart, as merchandise
That perishes with time or rust's decay,
Thy praises now I sing that all may know
How knowledge wins us truest happiness
And makes the lowly wise the peer of kings.
It teaches prudence that for great tasks fits
The man who has it to perform them well
And thus leads on to honour, power and wealth.
These rightly used, Heaven's richest blessings gain.
Wisdom's clear eye the dark, th'invisible
Illumines and discerns with power divine.
Youth, wealth, high rank and thoughtlessness thy foes
Hinder most grievously all thus endowed
From drinking deep of thy life-giving stream.
Each foe sufficient rampart 'gainst thy might.
For him who harbours all these four, no hope!"
Sudarsana sighed deeply when he heard
This song and sinking down upon a bank
Sweet with the scent of flowers, thus sadly mused.
"Ah woe is me, the sire of idle sons'
Who pay but little heed to the guru's words
But pass their time in games and vain pursuits!
What profits it a King if foolishness
Possess his sons to undo and bring to naught
By ignorance his statesmanlike reforms?
How greatly blessed that King who has an ....

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

PAGE.

A POETICAL INTRODUCTION TO THE HITOPADESA BY FRANK R. SELL, M. A., PROFESSOR OF ENGLISH, UNIVERSITY OF MYSORE 62

RURAL EDUCATION BY HAROLD MANN, D. SC. 65

THE KINDERGARTEN AS A FOUNDATION BY MISS D. WEBSTER, ST. GEORGE'S PREPARATORY SCHOOL 69

DRAWING BY MISS R. D. LOVE, MAHBUBIA GIRLS' HIGH SCHOOL, HYDERABAD - DECCAN 74

THE TEACHING OF ARITHMETIC IN SECONDARY SCHOOLS BY D. C. BHOGLE, B. A., B. T., ASSISTANT MARATHI NORMAL SCHOOL, AURANGABAD - DECCAN 75

THE GERMAN SCHOOL SYSTEM III BY SYED ALI AKBAR, M. A., (CANTAB :), DIVISIONAL INSPECTOR OF SCHOOLS, HYDERABAD - DECCAN 82

PRIZE-DAY CELEBRATIONS AT HYDERABAD - DECCAN 101

NOTES AND NEWS 106

FAREWELL ENTERTAINMENT TO NAWAB MASOOD JUNG BAHADUR: STATEMENT OF ACCOUNTS 113

REVIEW : "TEACHING" 117

EDITORIAL RURAL EDUCATION IN INDIA 118

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. III.] October, 1928 A. D. / Azur, 1338 Fasli. [No. 2.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab).

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, BY T. RAMAKRISHNA AND SONS.

1928

جلد ۳ رجسٹری شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۲ شمارہ ۳۰

اسفندار ۱۳۳۸ ف م جنوری ۱۹۲۹ء

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم اے نائب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

دائرہ ادارت:۔

سید علی اکبر۔ ایم اے۔ (کنٹب) مدیر مسئول

سید فخر الحسن۔ بی اے۔ بی ٹی (علیگ) مدیر

عبدالنور صدیقی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتمی تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقہ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بتفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۲ روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)
۲۔ ۱۲ ر علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (")
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(س) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔
(ش) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہوا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے۔

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	صہ	صہ۸ ر	ے
نصف صفحہ	صہ	عال۱۲ ر	صہ ر
ربع صفحہ	عال۸ ر	عہ۶ ر	۱۲ ر
فی سطر	۱۰ ر	۸ ر	۶ ر

حیدرآباد ٹیچر

بابت اسفندار ۱۳۳۸ف م جنوری ۱۹۲۹ء

جلد ۳ شمارہ (۳)

فہرست

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	پیام	جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم اے (کنٹب) ناظم تعلیمات سرکار عالی۔	۱
۲	افتتاحیہ		۲
۳	مسئلہ تعلیم طلباء کم استعداد۔	جناب غلام محمود صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ دارالشفاء بلدہ	۵
۴	میسور کا نظام تعلیم	جناب سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ	۱۵
۵	بچوں کا نفس	جناب محمد محسن خاں صاحب متین۔ مدرس مدرسہ وسطانیہ مستعد پورہ بلدہ	۲۳
۶	حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس	جناب محمد سلطان صاحب معلم اردو مدرسہ فوقانیہ نامپلی	۳۲
۷	سزائے جسمانی	جناب محمد مارماڈیوک پکتھال صاحب پرنسپال مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ مترجمہ جناب عبدالشکور صاحب۔ بی اے مدرس وسطانیہ گوشہ محل بلدہ۔	۴۱
۸	مدرسہ وسطانیہ عثمانیہ چنچل گوڑہ میں نئی تحریکات و تجربے	سید فخرالحسن۔	۴۵
۹	تعلیم۔ ایک خواب۔	مترجمہ جناب ابوتراب محمد احمد صاحب۔ مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ بلدہ	۵۲
۱۰	شذرات		۶۴
۱۱	تنقید و تبصرہ		۶۶

ایجنٹوں کی ضرورت ہے   نہایت معقول کمیشن دیا جائے گا۔

کئی سال سے ایک ایسے اٹلس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس کی چھپائی اچھی ہو۔ نقشے صحت کے ساتھ تیار کئے گئے ہوں اور جو آسانی سے پڑھے جا سکیں اس قسم کے اٹلس کا ایک سلسلہ کلکتہ نے شایع کیا گیا ہے جس کے متعلق سارے ہندوستان کے معلمین نے اچھی رائے قائم کی ہے۔ دیسی زبان کے عام طرز کے اٹلس اس ملک میں جو باہر سے منگائے جاتے ہیں ان سے یہ سلسلہ کہیں بہتر ہے۔ ہمارے پیش نظر اٹلس کے متعلق ایک اور وسیع تجویز ہے۔ جو اردو، تامل، برقی، گجراتی، تلگو اور انگریزی پر شامل ہوگی ہندوستان کے نقشوں کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے ضلعوں اور صوبوں کے نقشوں پر خاص اہمیت دیگئی ہے۔ تعلیم سے تعلق رکھنے والے حضرات کے پاس سے ہزاروں کی تعداد میں رائیں وصول ہوئی ہیں جس خوش اسلوبی کے ساتھ ہمارے نقشے شائع ہوئے ہیں ان پر اظہار خوشنودی اور پسندیدگی فرمایا گیا ہے۔

بنگالی زبان کے اٹلس ذیل کے نقشوں پر مشتمل ہیں۔

بارہ آنے قیمت والے سلسلے :۔

فلسکیاپ کے نقشے (۱) جغرافیائی اصطلاحات وانسانی نسلوں کا نقشہ (۲) دنیا کے نصف کرہ (۳) ایشیا کا سیاسی نقشہ (۴) ہندوستان کا نقشہ جس میں بلندی و پستی گہرے اور ہلکے رنگ کے مدد سے تبلائی گئی ہے (۵) ہندوستان کا طبعی نقشہ (۶) ہندوستان کا تجارتی نقشہ (۷) ہندوستان کے بارش اور آبادی کا نقشہ (۸) ہندوستان کا سیاسی نقشہ (۹) بہار، ممالک متحدہ ممالک متوسط اور راجپوتانہ کا نقشہ (۱۰) پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحدی شمال مغرب کا نقشہ (۱۱) مدارس بمبئی میسور۔ اور سیلون کا نقشہ (۱۲) بمبئی۔ راجپوتانہ۔ اور ممالک متوسط کا نقشہ (۱۳) بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ کا نقشہ (۱۴) برما اور آسام کا۔ (۱۵) یورپ کا نقشہ (۱۶) افریقہ کا نقشہ (۱۷) آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کا نقشہ (۱۸) شمالی اور جنوبی امریکہ کا نقشہ۔

ایک روپیہ قیمت والے سلسلہ

اس میں بارہ آنے والے قیمت کے سلسلے بشمول ۱۲و ۱۳ داخل ہیں۔ دنیا کا نقشہ مرکیٹر کے نہج پر (۵) ایشیا کا نقشہ جس میں بلندی و پستی گہرے اور ہلکے رنگ کے مدد سے تبلائی گئی ہے (۶) ایشیا کا طبعی نقشہ (۷) ایشیا کا سیاسی نقشہ (۲۰) جزائر برطانیہ کا نقشہ (۲۲) آسٹریلیا کا نقشہ۔

ہندی اور اردو کے اٹلس بھی اس طرز پر تیار کئے گئے ہیں۔ ممالک متحدہ اور متوسط اور پنجاب کے نقشے خاص طور پر بنوائے گئے ہیں۔

بنگالی، اردو، ہندی اور ہار آور انگریزی زبان کے ارضی کرے (۶) انچ قطر کے موجود ہیں۔ بنگالی زبان کے دیوار پر لٹکانے کے نقشوں کا مکمل سٹ عنقریب شایع ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ہی اور اردو کا سٹ نکلے گا۔

پبلشرس و پروپرائٹرس "دی کلکتہ فائن آرٹ کاٹیج" ۷۶۔ دھرم تلا اسٹریٹ کلکتہ

جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم اے (کنٹب)

ناظم تعلیمات سرکار عالی کا پیام

(اساتذہ حیدر آباد کے نام)

خوش قسمتی سے ایک وقت میں حیدر آبادی معلّم تھا۔ یہ خیال کہ میں اب بھی انہی میں سے ہوں میرے لئے باعث افتخار ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں پھر حیدر آبادی معلّمین، سر رشتہ تعلیمات اور اس بڑی ریاست کی خدمت کرنے کے لئے حیدر آباد واپس آیا ہوں۔ میرا دل اساتذہ حیدر آباد کی ہمدردی و رفاقت کے جذبات سے لبریز ہے اور میری تمنا ہے کہ انہیں اپنے نیک کام میں پوری کامیابی حاصل ہو۔ میں ان کو ان کے مؤقر رسالہ حیدر آباد ٹیچر کی معرفت پیام ہمدردی و رفاقت بھیجتا ہوں۔

(دستخط) فضل محمد خان

۳ ماہ اسفندار ۱۳۳۸ف

افتتاحیہ

سیر رسالہ ہم نے جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم اے (کنٹب) ناظم تعلیمات سرکار عالی کا وہ پیام رفاقت وہمدردی درج کیا ہے جو انہوں نے اس رسالہ کی معرفت اساتذہ حیدرآباد کے نام بھیجا ہے۔ موصوف طبقۂ اساتذہ میں غیر معروف و محتاج تعارف نہیں ہیں۔ آپ ۱۹۱۵ء سے سٹی ہائی اسکول بلدہ کی پرنسپالی کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۹۱۹ء میں نائب ناظم تعلیمات کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں آپ ملازمت سرکار عالی سے علحدہ ہو کر پنجاب واپس چلے گئے۔

جب آبان ۱۳۳۷ف میں نواب مسعود جنگ بہادر اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو کابینۂ وزارت کی نظریں آپ ہی پر پڑیں اور آپ پانچ سال کے غیاب کے بعد ذاتی صعوبتوں اور قربانیوں کو گوارا کر کے اور اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر محض اس خیال سے حیدرآباد واپس تشریف لائے کہ "حیدرآبادی معلم، سر رشتۂ تعلیمات اور اس بڑی ریاست کی خدمت کریں"

خانصاحب کے حسن سلوک اور مکارم اخلاق کا سکہ دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کی مردم شناسی اور قدردانی، آپ کی کنہ جوئی و حقیقت بینی، آپ کی معنی خیز کم سخنی اور سب سے بڑھ کر آپ کی صداقت شعاری وہ انمول صفات ہیں جو ایک طرف سر رشتہ کی لگاتار ترقی کی ضامن ہیں اور دوسری طرف ماتحتین و مدرسین کے لئے حوصلہ افزا دلفروز ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دور مسعود کی تبلیغی مساعی کے بعد موجودہ ادارات اور جدید اسکیموں میں استقلال و پائیداری پیدا کرنے کے لیے خانصاحب کی معاملہ فہم دکاردانا شخصیت کی رہنمائی ورہبری کی ازحد ضرورت تھی۔ یہ اساتذہ حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ ان کا ناظم انہی میں سے ہے اور ان کے حالت، ان کی ضرورت، ان کے درد دکھ اور جذبات و احساسات کو سمجھتا اور ان کا پاس کرتا ہے۔

جناب خاں صاحب کے پیش نظر اس وقت کئی اہم تجاویز ہیں مثلاً انضمام عثمانیہ میٹرک و ہائی اسکول فائینل اور پیشہ وری تعلیم کی ترویج۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ ان اہم مسائل کے ساتھ ساتھ طلبہ کی صحت و تندرستی اور امکنہ مدارس کی تعمیر کے بظاہر غیر اہم مگر حقیقتاً اہم تر مسائل توجہ گرامی سے محروم نہ رہیں گے۔

ہم اساتذہ حیدرآباد کی جانب سے خاں صاحب کے پرخلوص پیام کا شکریہ پیش کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ معلمین حیدرآباد کے دلوں میں ان جذبات کی بیحد قدر ہے اور وہ اپنے طرز عمل، اپنی فرض شناسی، اپنی جفاکشی اور اپنے خلوص سے خود کو اس رفاقت و ہمدردی کا سزاوار ثابت کریں گے۔

———(٠)———

وہ دن دور نہیں جبکہ ترک جہالت کی تاریکی میں گھرے تھے۔ لیکن مصطفی کمال پاشا کے جوش عمل اور دور اندیشی نے جمہوریہ ترکیہ کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ چند روز ہوئے کہ کابینہ نے عربی حروف تہجی کی جگہ لاطینی رسم الخط کے استعمال کا حکم دیدیا ہے اور ساری قوم کو گویا کہ از سر نو تعلیم حاصل کرنی پڑ رہی ہے۔ لیکن اس جدت کی دشواری کے باوجود ترکی میں اوسط خواندگی سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے نئے رسم الخط سیکھنے کے لئے ساری قوم طفل مکتب بن گئی ہے۔ سڑکوں پر، گوداموں میں گاڑیوں اور ریلوں پر غرض کہ ہر جگہ ترک لاطینی کی نئی پرائمر پڑھنے میں مصروف ہیں۔ گاؤں گاؤں مدرسے کھل گئے ہیں اور عورتیں بچے جوان، بوڑھے یکساں جوش کے ساتھ تعلیمی کیف سے سرشار ہیں۔ چند سال قبل ترکیہ میں صرف ۱۰ فیصدی خواندہ اشخاص تھے اب قریب قریب پوری قوم خواندہ ہوگئی ہے اور اکثر لوگ اخبار پڑھ سکتے ہیں۔

ترکی کا تجربہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ ہندوستان جس رفتار سے تعلیمی ترقی کر رہا ہے وہ بہت سست ہے اور اگر یہی حالت رہی تو صدیاں گذر جائینگی قبل اس کے کہ ساری قوم خواندہ ہو۔ ترکی سے ہم کو دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کو اپنے رسم الخط میں ایسی اصلاح کرنی چاہئے جس سے عوام الناس کو آسانی سے پڑھنا آجائے۔ دوسرے

یہ کہ بڑھا طوطا رام رام، کی مثل غلط ہے۔ بلکہ برعکس چونکہ زیادہ عمر والوں کی سمجھ پختہ ہوتی ہے اوران کو دلچسپی اور غایتِ تحصیل کا علم رہتا ہے اس لئے وہ تعلیم سے جلد تر بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم تعلیم بالغاں کے مسئلہ پر غور و تامل کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر تعلیم بالغاں پر ترکوں کے آدھے جوش کے ساتھ بھی زور دیا جائے تو چند سال میں ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت رہ جائے جو تعلیم سے نابلد ہو۔

بڑھتی ہوئی مانگ اور مدارس تحتانیہ کی ضرورتوں اور سہولتوں کے مدنظر ہم نے حیدرآباد ٹیچر کے اُردو حصہ کی علٰحدہ طباعت و اشاعت کا انتظام کیا ہے جس کی سالانہ قیمت معہ محصول ڈاک صرف (عہ ۱) ہوگی۔

رسالہ منیجر صاحب حیدرآباد ٹیچر۔ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایا جائے۔

اعلان

اساتذہ انجمن حیدرآباد کی تیسری سالانہ کانفرنس جمعرات اور جمعہ مورخہ ۲۹ و ۳۰ امرداد سنہ ۱۳۳۸ ف مطابق ۴ و ۵ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء منعقدہ ہوگی جو ارکان کانفرنس کوئی تحریک پیش کرنا یا کوئی مضمون پڑھنا چاہتے ہوں وہ مسٹر جی پیرکاشں راؤ ایم۔ اے ایل ٹی مددگار دار العلوم بلدہ اور معتمد پروگرام کمیٹی کو ۲۲ اردی بہشت سنہ ۳۸ ف مطابق ۲۶ مارچ سنہ ۳۸ء تک مطلع فرماویں۔

جو حضرات انجمن کے ممبر نہیں ہیں وہ حسب دفعہ (۴) ضمن ب مبلغ چار روپیہ سکہ ع ادا کرنے پر انجمن کے رکن بن سکتے ہیں جس میں حیدرآباد ٹیچر کا ایک سال کا چندہ بھی شامل ہوگا۔

سید محمد شریف مشہدی

معتمد عمومی

مسئلہ تعلیم طلباء کم استعداد

ذیل کا مضمون غلام محمود صاحب نے اپنے خاص ہمہ گیر انداز میں لکھا ہے اور عملی تجربہ اور ذاتی مشاہدہ سے طلباء کی کمزوری کے اسباب و علل کی سچی تصویر کھینچی ہے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ طلباء کم استعداد کا مسئلہ نہایت اہم اور حل طلب معاملہ ہے۔ اور مدارس و مدرسین کی ناکامیوں کا حقیقی سبب ہے۔

ہمارے نزدیک کمزوری کے جتنے اسباب ہیں ان کا انسداد کچھ نہ کچھ مدرسین کی تھوڑی سی اخلاقی جرأت سے ہو سکتا ہے۔ مگر جو سبب کہ مدرسین کے دائرۂ اثر سے باہر ہے وہ غیر حاضری کا مہلک مرض ہے جس کو حیدر آباد میں ام البلیات کا رتبہ حاصل ہے مدرس کم زور لڑکے کو شریک کرے۔ صدر مدرس تو فیر تعداد کی دھن میں دوسری ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو جائے، والدین بچہ کو قابلیت سے بالاتر درجہ میں داخل کرکے وعدہ خلافی کریں پھر بھی کچھ امید کی جھلک باقی رہتی ہے لیکن اگر کسی بچہ کو غیر حاضری کا گھن لگ گیا تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

طریق چارہ گری میں ہم کو ذرا سا اختلاف ہے مولوی صاحب کی رائے میں آخری صورت یہ ہے کہ کم زور طلباء کا امتحان لے کر درجہ اُتار دیا جائے۔ ہمارے خیال میں کسی طالب علم کو تنزل کر دینا اصولاً اور انتظاماً دونوں طرح رعایتی ترقی اور رعایتی شرکت سے زیادہ نامناسب و مضرت رساں ہے۔ یہ سچ ہے کہ طبیب ماؤف عضو کو نشتر سے کاٹ کر جدا کر دیتا ہے۔ لیکن اُستاد کا آلۂ کار فولادی نشتر دل سے افضل ہے۔ وہ فاسد حصۂ جسم کو کاٹ کر پھینک نہیں دیتا بلکہ ایسا نسخہ تجویز کرتا ہے جس سے دوران خون بڑھتا ہے اعصاب اور رگوں میں پھر تڑپ اور ہیجان پیدا ہوتا ہے، اور سڑے ہوئے گوشت میں دوبارہ زندگی اور صحت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

بعض کم زور لڑکے در اصل نہ تو کم استعداد ہوتے ہیں اور نہ ان کے ملکات ذہنی میں

کوئی نقص ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ان کی توجہ دوسرے مشغلوں کی طرف بٹی رہتی ہے اور پڑھنے لکھنے میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ان میں جوہر قابل موجود ہے لیکن سنگریزوں میں دبا ہوا، ان میں قوتیں ہیں لیکن ان کا مصرف بیجا ہے۔ اگر استاد کامل ہو تو تعلیم میں دلچسپی پیدا کر کے اور ان کے جذبات و رجحانات کو لگام دے کر رفتہ رفتہ جس طرح ایک سرکش راہوار سدھایا جاتا ہے اسی طرح ان کی قوتوں کو راہ راست پر لگائے۔

اور لڑکے اجتماعی تعلیم کے شکار ہیں۔ غبی اور ذکی، ڈھیٹ اور شرمیلے لڑکے سب ایک لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور لڑکے کو جس قدر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ نصیب نہیں ہوتی، اس کی پیاس نہیں بجھتی، اس کے شکوک رفع نہیں ہوتے اور علمی میدان میں وہ جہاں کا تہاں رہتا ہے۔ امریکہ والوں نے اجتماعی تعلیم کی اسی کوتاہی کی تلافی کے لئے طریق بٹاویہ) ایجاد کیا ہے۔ ایک ہی جماعت میں دو مدرس ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایک اجتماعی تعلیم دیتا ہے اور دوسرا فرداً فرداً ہر بچہ کی مشکلات دور کرتا ہے۔ انفرادی توجہ سے کمزور بچے حسب ضرورت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اجتماعی تعلیم میں ممکن نہیں۔

ایک اور شکل یہ ہے کہ نظام اوقات تعلیم میں کچھ ڈھیل دی جائے اور جو بچے کسی خاص مضمون میں کمزور ہیں وہ یا تو نیچے کی جماعت میں اس مضمون کا درس لیں یا ایک خاص کمرہ ایسے تمام بچوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے جس کی نگرانی کسی لائق و تجربہ کار معلم کے سپرد ہو اور جہاں یہ کمزور بچے اپنی تعلیمی خامیوں کو دور کر سکیں البتہ دوسرے مضامین میں وہ اپنے درجہ کے ہم سبق رہیں۔

اب رہے وہ طلبا جن میں کوئی اندرونی فتور ہے تو ان کو ادبیاتی تعلیم دینا تضیع اوقات ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان کے لئے علٰحدہ مدارس ہوں اور ان کو وہ کام سکھائے جائیں جس کے وہ قابل ہوں۔ کچھ بچے ایسے نکلیں گے جن میں کوئی ذہنی خرابی نہیں ہوتی بلکہ ان کی ظاہری خامیوں کی جڑیں روح کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ روحانی خلل سے بسا اوقات اعصابی اور ذہنی ابتری پیدا ہوتی ہے اور جب تک اس خلل کو دور نہ کیا جائے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ رفع خلل کی تین صورتیں ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ کافی ہوتا ہے کہ بچوں سے ان کے

جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم اے (کنٹب)

ناظم تعلیمات سرکار عالی کا پیام

(اساتذہ حیدرآباد کے نام)

خوش قسمتی سے ایک وقت میں حیدرآبادی معلم تھا۔ یہ خیال کہ میں اب بھی انہی میں سے ہوں میرے لئے باعث افتخار ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں پھر حیدرآبادی معلمین، سررشتہ تعلیمات اور اس بڑی ریاست کی خدمت کرنے کے لئے حیدرآباد واپس آیا ہوں۔ میرا دل اساتذہ حیدرآباد کی ہمدردی و رفاقت کے جذبات سے لبریز ہے اور میری تمنا ہے کہ انہیں اپنے نیک کام میں پوری کامیابی حاصل ہو۔ میں ان کو ان کے موقر رسالہ حیدرآباد ٹیچر کی معرفت پیام ہمدردی و رفاقت بھیجتا ہوں۔

شرحد ستخط فضل محمد خان

۲ اسفندار ۱۳۳۸ف

افتتاحیہ

یہ رسالہ ہم نے جناب خان فضل محمد خاں صاحب ایم اے (کنٹب) ناظم تعلیمات سرکار عالی کا وہ پیام رفاقت وہمدردی درج کیا ہے جو انہوں نے اس رسالہ کی معرفت اساتذہ حیدرآباد کے نام بھیجا ہے۔ موصوف طبقۂ اساتذہ میں غیر معروف و محتاج تعارف نہیں ہیں۔ آپ ۱۹۱۵ء سے سٹی ہائی اسکول بلدہ کی پرنسپالی کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۹۱۹ء میں نائب ناظم تعلیمات کے عہدہ پر فائز ہوئے ۱۹۲۴ء میں آپ ملازمت سرکار عالی سے علحدہ ہوکر پنجاب واپس چلے گئے۔

جب آبان ۱۳۳۷ف میں نواب مسعود جنگ بہادر اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو کابینۂ وزارت کی نظریں آپ ہی پر پڑیں اور آپ پانچ سال کے غیاب کے بعد ذاتی صعوبتوں اور قربانیوں کو گوارا کرکے اور اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر محض اس خیال سے حیدرآباد واپس تشریف لائے کہ "حیدرآبادی معلم، سررشتۂ تعلیمات اور اس بڑی ریاست کی خدمت کریں"

خانصاحب کے حسن سلوک اور مکارم اخلاق کا سکہ دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کی مردم شناسی اور قدردانی، آپ کی کنہ جوئی وحقیقت بینی، آپ کی معنی خیز کم سخنی اور سب سے بڑھ کر آپ کی صداقت شعاری وہ انمول صفات ہیں جو ایک طرف سررشتہ کی لگاتار ترقی کی ضامن ہیں اور دوسری طرف ماتحتیں و مدرسین کے لئے حوصلہ افزا دخروافروز ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دورِ مسعود کی تبلیغی مساعی کے بعد، موجودہ ادارات اور جدید اسکیموں میں استقلال و پائیداری پیدا کرنے کے لیے خانصاحب کی عاملہ فہم دکاروانا شخصیت کی رہنمائی ورہبری کی از حد ضرورت تھی۔ یہ اساتذہ حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ ان کا ناظم انہی میں سے ہے اور ان کے حالات، ان کی ضرورت، ان کے درد دکھ اور جذبات واحساسات کو سمجھتا اور ان کا پاس کرتا ہے۔

جناب خاں صاحب کے پیش نظر اس وقت کئی اہم تجاویز ہیں مثلاً انضمام عثمانیہ میٹرک وہائی اسکول فائینل اور پیشہ وری تعلیم کی ترویج۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ ان اہم مسائل کے ساتھ ساتھ طلبہ کی صحت و تندرستی اور امکنہ مدارس کی تعمیر کے بظاہر غیر اہم مگر حقیقتاً اہم تر مسائل توجہ گرامی سے محروم نہ رہیں گے۔

ہم اساتذہ حیدرآباد کی جانب سے خاں صاحب کے پرخلوص پیام کا شکریہ پیش کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ معلمین حیدرآباد کے دلوں میں ان جذبات کی بیحد قدر ہے اور وہ اپنے طرز عمل، اپنی فرض شناسی، اپنی جفاکشی اور اپنے خلوص سے خود کو اس رفاقت و ہمدردی کا سزاوار ثابت کریں گے۔

———(٭)———

وہ دن دور نہیں جبکہ ترک جہالت کی تاریکی میں گھرے تھے۔ لیکن مصطفیٰ کمال پاشا کے جوش عمل اور دور اندیشی نے جمہوریہ ترکیہ کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ چند روز ہوئے کہ کابینہ نے عربی حروف تہجی کی جگہ لاطینی رسم الخط کے استعمال کا حکم دیدیا ہے اور ساری قوم کو گویا کہ از سر نو تعلیم حاصل کرنی پڑ رہی ہے۔ لیکن اس جدت کی دشواری کے باوجود ترکی میں اوسط خواندگی سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے نئے رسم الخط سیکھنے کے لئے ساری قوم طفل مکتب بن گئی ہے۔ سڑکوں پر، گوداموں میں گاڑیوں اور ریلوں پر غرض کہ ہر جگہ ترک لاطینی کی نئی پرائمر پڑھنے میں مصروف ہیں۔ گاؤں گاؤں مدرسے کھل گئے ہیں اور عورتیں بچے جوان، بوڑھے یکساں جوش کے ساتھ تعلیمی کیف سے سرشار ہیں۔ چند سال قبل ترکیہ میں صرف ۱۰ فیصدی خواندہ اشخاص تھے اب قریب قریب پوری قوم خواندہ ہوگئی ہے اور اکثر لوگ اخبار پڑھ سکتے ہیں۔

ترکی کا تجربہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ ہندوستان جس رفتار سے تعلیمی ترقی کر رہا ہے وہ بہت سست ہے اور اگر یہی حالت رہی تو صدیاں گذر جائینگی قبل اس کے کہ ساری قوم خواندہ ہو۔ ترکی سے ہم کو دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کو اپنے رسم الخط میں ایسی اصلاح کرنی چاہئے جس سے عوام الناس کو آسانی سے پڑھنا آجائے۔ دوسرے

یہ کہ بڑھا طوطا رام رام، کی مثل غلط ہے۔ بلکہ برعکس چونکہ زیادہ عمر والوں کی سمجھ پختہ ہوتی ہے اور ان کو دلچسپی اور غایتِ تحصیل کا علم رہتا ہے اس لئے وہ تعلیم سے جلد تر بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم تعلیم بالغاں کے مسئلہ پر غور و تامل کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر تعلیم بالغاں پر ترکوں کے آدھے جوش کے ساتھ بھی زور دیا جائے تو چند سال میں ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت رہ جائے جو تعلیم سے نابلد ہو۔

بڑھتی ہوئی مانگ اور مدارس تحتانیہ کی ضرورتوں اور سہولتوں کے مدنظر ہم نے حیدرآباد ٹیچر کے اردو حصہ کی علحدہ طباعت و اشاعت کا انتظام کیا ہے جس کی سالانہ قیمت معہ محصول ڈاک صرف (عہ) ہوگی۔

رسالہ منیجر صاحب حیدرآباد ٹیچر۔ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایا جائے۔

اعلان

اساتذہ انجمن حیدرآباد کی تیسری سالانہ کانفرنس جمعرات اور جمعہ مورخہ ۲۹ و ۳۰ امرداد ۱۳۳۸ف مطابق ۴ و ۵ جولائی ۱۹۲۹ء منعقد ہوگی جو ارکان کانفرنس کوئی تحریک پیش کرنا یا کوئی مضمون پڑھنا چاہتے ہوں وہ مسٹر جی پرکاش راؤ ایم۔ اے ایل ٹی مددگار دارالعلوم بلدہ اور معتمد پروگرام کمیٹی کو ۲۲ اردی بہشت ۱۳۳۸ف مطابق ۲۶ مارچ ۱۹۲۸ء تک مطلع فرمادیں۔

جو حضرات انجمن کے ممبر نہیں ہیں وہ حسب دفعہ (۴) ضمن ب مبلغ چار روپیہ سکہ ع ادا کرنے پر انجمن کے رکن بن سکتے ہیں جس میں حیدرآباد ٹیچر کا ایک سال کا چندہ بھی شامل ہوگا۔

سید محمد شریف مشہدی

معتمد عمومی

مسئلہ تعلیم طلباء کم استعداد

ذیل کا مضمون غلام محمود صاحب نے اپنے خاص ہمہ گیر انداز میں لکھا ہے اور عملی تجربہ اور ذاتی مشاہدہ سے طلباء کی کمزوری کے اسباب وعلل کی سچی تصویر کھینچی ہے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ طلباء کم استعداد کا مسئلہ نہایت اہم اور حل طلب مسئلہ ہے۔ اور مدارس و مدرسین کی ناکامیوں کا حقیقی سبب ہے۔

ہمارے نزدیک کم زوری کے جتنے اسباب ہیں ان کا انسداد کچھ نہ کچھ مدرسین کی تھوڑی سی اخلاقی جرأت سے ہو سکتا ہے۔ مگر جو سبب کہ مدرسین کے دائرۂ اثر سے باہر ہے وہ غیر حاضری کا مہلک مرض ہے جس کو حیدر آباد میں اُم البلیات کا رتبہ حاصل ہے مدرس کم زور لڑکے کو شریک کرے، صدر مدرس توفیر تعداد کی دھن میں دوسری ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو جائے، والدین بچہ کو قابلیت سے بالاتر درجہ میں داخل کرکے وعدہ خلافی کریں تب بھی کچھ اُمید کی جھلک باقی رہتی ہے لیکن اگر کسی بچہ کو غیر حاضری کا گھن لگ گیا تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

طریق چارہ گری میں ہم کو ذرا سا اختلاف ہے۔ مولوی صاحب کی رائے میں آخری صورت یہ ہے کہ کم زور طلباء کا امتحان لے کر درجہ اُتار دیا جائے۔ ہمارے خیال میں کسی طالب علم کو تنزل کر دینا اصولاً اور انتظاماً دونوں طرح رعایتی ترقی اور رعایتی شرکت سے زیادہ نامناسب ومضرت رساں ہے۔ یہ سچ ہے کہ طبیب ماؤف عضو کو نشتر سے کاٹ کر جدا کر دیتا ہے۔ لیکن اُستاد کا آلۂ کار فولادی نشتروں سے افضل ہے۔ وہ فاسد حصۂ جسم کو کاٹ کر پھینک نہیں دیتا بلکہ ایسا نسخہ تجویز کرتا ہے جس سے دوران خون بڑھتا ہے اعصاب اور رگوں میں پھر تڑپ اور ہیجان پیدا ہوتا ہے، اور سڑے ہوئے گوشت میں دوبارہ زندگی اور صحت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

بعض کم زور لڑکے دراصل نہ تو کم استعداد ہوتے ہیں اور نہ ان کے ملکات ذہنی میں

کوئی نقص ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ان کی توجہ دوسرے مشغلوں کی طرف بٹی رہتی ہے اور پڑھنے لکھنے میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ان میں جوہر قابل موجود ہے لیکن سنگریزوں میں دبا ہوا، ان میں قوتیں ہیں لیکن ان کا مصرف بیجا ہے، اگر استاد کامل ہو تو تعلیم میں دلچسپی پیدا کر کے اور ان کے جذبات و رجحانات کو لگام دے کر رفتہ رفتہ جس طرح ایک سرکش راہوار سدھایا جاتا ہے اسی طرح ان کی قوتوں کو راہ راست پر لگائے۔

اور لڑکے اجتماعی تعلیم کے شکار ہیں۔ غبی اور ذکی، ڈھیٹ اور شرمیلے لڑکے سب ایک لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور لڑکے کو جس قدر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ نصیب نہیں ہوتی، اس کی پیاس نہیں بجھتی، اس کے شکوک رفع نہیں ہوتے اور علمی میدان میں وہ جہاں کا تہاں رہتا ہے۔ امریکہ والوں نے اجتماعی تعلیم کی اسی کوتاہی کی تلافی کے لئے طریق (بٹاویہ) ایجاد کیا ہے۔ ایک ہی جماعت میں دو مدرس ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایک اجتماعی تعلیم دیتا ہے اور دوسرا فرداً فرداً ہر بچہ کی مشکلات دور کرتا ہے۔ انفرادی توجہ سے کمزور بچے حسب ضرورت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اجتماعی تعلیم میں ممکن نہیں۔

ایک اور حل یہ ہے کہ نظام اوقات تعلیم میں کچھ ڈھیل دی جائے اور جو بچے کسی خاص مضمون میں کمزور ہیں وہ یا تو نیچے کی جماعت میں اس مضمون کا درس لیں یا ایک خاص کمرہ ایسے تمام بچوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے جس کی نگرانی کسی لائق و تجربہ کار معلم کے سپرد ہو اور جہاں یہ کمزور بچے اپنی تعلیمی خامیوں کو دور کر سکیں البتہ دوسرے مضامین میں وہ اپنے درجہ کے ہم سبق رہیں۔

اب رہے وہ طلبا جن میں کوئی اندرونی فتور ہے تو ان کو ادبیاتی تعلیم دینا تضیع اوقات ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان کے لئے علٰحدہ مدارس ہوں اور ان کو وہ کام سکھائے جائیں جس کے وہ قابل ہوں۔ کچھ بچے ایسے نکلیں گے جن میں کوئی ذہنی خرابی نہیں ہوتی بلکہ ان کی ظاہری خامیوں کی جڑیں روح کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ روحانی خلل سے بسا اوقات اعصابی اور ذہنی ابتری پیدا ہوتی ہے اور جب تک اس خلل کو دور نہ کیا جائے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ رفع خلل کی تین صورتیں ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ کافی ہوتا ہے کہ بچوں سے ان کے

خواب کہلوائے جائیں۔ چونکہ خواب خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے روحانی اضطراب کی ٹوہ لگتی ہے۔ اکثر خواب کے ذکر ہی سے رفع خلل ہو جاتا ہے۔ مگر بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جو خواب کے بیان کرنے میں لجاتے ہیں اس لئے ان کو ہپناٹزم کے ذریعہ بے ہوش کر دینا مناسب ہوتا ہے جب شعور کا دربان سو جاتا ہے تو غیر شعوری دماغ کے زندان تاریک سے وہ بانی شر و فساد نکل بھاگتے ہیں جنہوں نے روح کے سکون کو برباد کر دیا ہے۔ تیسری تدبیر تحلیل النفس ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نفس کا تجزیہ اور تشریح کر کے سراغ لگایا جائے کہ فساد و خلل کا مرکز کہاں ہے۔ ازالہ خلل کیلئے خصوصی ترغیب کی قوت کافی ہوتی ہے

اس میں شک نہیں کہ ہمارے مدارس میں نہ تو ایسے موزون کمرے اور نہ مناسب فرنیچر ہے کہ طریق بتا دیہ پر عمل ہو سکے اور نہ لوچدار ٹائم ٹیبل ممکن ہے۔ پیمائش ذہن اور تحلیل النفس بھی سردست یورپین ماہرین تعلیم کا اجارہ معلوم ہوتی ہے لیکن جب کبھی بھی یہ صورتیں ممکن ہوں گی اس وقت ہمیں یقین ہے کہ کم زور طلبا کی تعلیم کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

مدیر

یوں تو ہر کم زور طالب علم کم استعداد سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت میں کم زوری کا اطلاق صرف اسی طالب علم پر ہونا چاہیئے جو اگر نیچے کی جماعت میں رکھا جائے تو بہ لحاظ استعداد مجموعی اس جماعت کی تعلیم اس کے لئے تحصیل حاصل کا مصداق ہو اور اگر اوپر کے درجے میں تعلیم دی جائے تو وہ بعض مضامین کی تدریس سے بہ سبب کم زوری پوری طرح استفادہ نہ کر سکے اور یہ کم زوری فطرتی ہو یا عارضی ایسے کم استعداد طلبہ تو بہت ہی شاذ ہوا کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہیئے مگر اس کے برخلاف ہر مدرسہ کی ہر جماعت میں ایسے طلبا زیادہ پائے جاتے ہیں جو مجموعی استعداد کے لحاظ سے صرف نیچے کی جماعت میں مناسب حال تعلیم پانے کے اہل ہوتے ہیں لیکن کسی نہ کسی سبب سے اوپر کے درجے میں شریک کر لئے جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنا نقصان آپ کرتے ہیں بلکہ ہمدرس طلبہ اور مدرسین کے لئے بھی موجب زحمت و زیاں ہوتے ہیں۔

کم استعداد طلبہ کی عمومیت و کثرت کے اسباب و علل مختلف و متعدد ہیں بعض طلبہ محض اس وجہ سے کم زور ہوتے ہیں کہ مدرسے کی تفہیم و تدریس کو کافی طور پر پیوست کرنے کے لئے مکان میں جس قدر وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ آئے دن کی خانگی اٹل مصروفیت کے سبب میسر نہیں آتا اور اگر خواب و خور کے ناگزیر اوقات کا کچھ حصہ اس کی نذر کیا جاتا ہے تو صحت جواب دینے لگتی ہے عام طور پر ہمارے طلبہ کی صحت جیسی کچھ ہے وہ ظاہر ہے گویا صلاح نہ شد بلا شد کا مقولہ صادق آتا ہے اس طرح کم زوری بڑھتی جاتی ہے جس سے تعلیم متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی یہ ایسی خامی ہے جو مدرس کی دسترس سے قطعاً باہر ہے اور جس کی تمام تر ذمہ داری طلبہ کے سرپرستوں پر عائد ہوتی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طلبہ علالت یا اور کسی وجہ سے مہینوں مدرسہ نہیں آتے یا اکثر غیر حاضر رہا کرتے ہیں اور ایام غیر حاضری میں کتب کی طرف عموماً متوجہ بھی نہیں ہوتے چونکہ اجرت تعلیم ہر ماہ ادا کردی جاتی ہے اس لئے نام خارج ہونے نہیں پاتا مگر جب مدرسہ آتے ہیں تو لازماً کم زور ہوتے ہیں گزشتہ طویل مدت کی غیر حاضری کے نقصان کی تلافی کی کوئی قابل اعتبار صورت پیدا نہیں ہوتی اور موجودہ حالت میں جماعت کا ساتھ دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے یہاں بچارے مدرس کو دو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ایک تو پچھلے کی تلافی کرنی اور دوسرے حالیہ درس سے پورا پورا استفادہ کرانا ورنہ یہ تازہ خامی بجائے خود مزید کم زوری کا پیش خیمہ ہوگی ایسی صورت میں لے دے کے مدرس کو کامل ذمہ دار تصور کرنا قرین انصاف نہیں ہو سکتا جماعت بندی اور داخلے کے وقت سفارشوں کے زور سے طلبہ ایسی جماعتوں میں شریک کرلئے جاتے ہیں جن میں تعلیم پانے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی۔ خود والدین اور سرپرست بھی یہ کہہ کر صدر مدرس کو مجبور کرتے ہیں کہ مکان پر خانگی تعلیم کا معقول انتظام کر دیا جائے گا اور خانگی اوقات کی بھی پوری نگرانی کی جائے گی مگر یہ صرف کہنے کی باتیں ہوتی ہیں اور عملی صورت اکثر مفقود ہوتی ہے بالفرض اگر باور بھی کر لیا جائے کہ وعدے کی پابندی کی جائے گی تو بھی یہ حقیقت کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ جو طالب علم حاضر باشی کے باوجود جس جماعت کے سالانہ امتحان میں ناکام ہوا ہو وہ خانگی تعلیم اور اوقات کی نگرانی کے سبب اوپر کے درجے میں ترقی پانے کی بجائے موعودہ امداد کے ساتھ اسی جماعت میں ایک سال اور

خواب کہلوائے جائیں۔ چونکہ خواب خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے روحانی اضطراب کی ٹوہ لگتی ہے۔ اکثر خواب کے ذکر ہی سے رفع خلل ہو جاتا ہے۔ مگر بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جو خواب کے بیان کرنے میں لجاتے ہیں اس لئے ان کو ہپناٹزم کے ذریعہ بے ہوش کر دینا مناسب ہوتا ہے جب شعور کا دربان سو جاتا ہے تو غیر شعوری دماغ کے زندان تاریک سے وہ بانی شر و فساد نکل بھاگتے ہیں جنہوں نے روح کے سکوں کو برباد کر دیا ہے۔ تیسری تدبیر تحلیل النفس ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نفس کا تجزیہ اور تشریح کر کے سراغ لگایا جائے کہ فساد و خلل کا مرکز کہاں ہے۔ ازالہ خلل کیلئے خصوصی ترغیب کی قوت کافی ہوتی ہے

اس میں شک نہیں کہ ہمارے مدارس میں نہ تو ایسے موزون کمرے اور نہ مناسب فرنیچر ہے کہ طریق بتا دیہ پر عمل ہو سکے اور نہ لوچدار ٹائم ٹیبل ممکن ہے۔ پیمائش ذہن اور تحلیل النفس بھی سر دست یورپین ماہرین تعلیم کا اجارہ معلوم ہوتی ہے لیکن جب کبھی بھی یہ صورتیں ممکن ہوں گی اس وقت ہمیں یقین ہے کہ کم زور طلبا کی تعلیم کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

ملعیہ

یوں تو ہر کم زور طالب علم کم استعداد سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت میں کم زوری کا اطلاق صرف اسی طالب علم پر ہونا چاہیئے جو اگر نیچے کی جماعت میں رکھا جائے تو بہ لحاظ استعداد مجموعی اُس جماعت کی تعلیم اس کے لئے تحصیل حاصل کا مصداق ہو اور اگر اوپر کے درجے میں تعلیم دی جائے تو وہ بعض مضامین کی تدریس سے بہ سبب کم زوری پوری طرح استفادہ نہ کر سکے اور یہ کم زوری فطرتی ہو یا عارضی ایسے کم استعداد طلبہ تو بہت ہی شاذ ہوا کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہیئے مگر اس کے برخلاف ہر مدرسہ کی ہر جماعت میں ایسے طلبا زیادہ پائے جاتے ہیں جو مجموعی استعداد کے لحاظ سے صرف نیچے کی جماعت میں مناسب حال تعلیم پانے کے اہل ہوتے ہیں لیکن کسی نہ کسی سبب سے اوپر کے درجے میں شریک کر لئے جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنا نقصان آپ کرتے ہیں بلکہ ہمدرس طلبہ اور مدرسین کے لئے بھی موجب زحمت و زیاں ہوتے ہیں۔

۳۔ استعداد طلبہ کی عمومیت و کثرت کے اسباب و علل مختلف و متعدد ہیں بعض طلبہ محض اس وجہ سے کم زور ہوتے ہیں کہ مدرسے کی تفہیم و تدریس کو کافی طور پر مؤثر ثابت کرنے کے لئے مکان میں جس قدر وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ آئے دن کی خانگی اٹل مصروفیت کے سبب میسر نہیں آتا اور اگر خواب و خور کے ناگزیر اوقات کا کچھ حصہ اس کی نذر کیا جاتا ہے تو صحت جواب دینے لگتی ہے عام طور پر ہمارے طلبہ کی صحت جیسی کچھ ہے وہ ظاہر ہے گویا صلاح نہ شد بلا شد کا مقولہ صادق آتا ہے اس طرح کم زوری بڑھتی جاتی ہے جس سے تعلیم متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی یہ ایسی خامی ہے جو مدرس کی دسترس سے قطعاً باہر ہے اور جس کی تمام تر ذمہ داری طلبہ کے سرپرستوں پر عائد ہوتی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طلبہ علالت یا اور کسی وجہ سے مہینوں مدرسہ نہیں آتے یا اکثر غیر حاضر رہا کرتے ہیں اور ایام غیر حاضری میں کتب کی طرف عموماً متوجہ بھی نہیں ہوتے چونکہ اجرت تعلیم ہر ماہ ادا کر دی جاتی ہے اس لئے نام خارج ہونے نہیں پاتا مگر جب مدرسہ آتے ہیں تو لازماً کم زور ہوتے ہیں گزشتہ طویل مدت کی غیر حاضری کے نقصان کی تلافی کی کوئی قابل اعتبار صورت پیدا نہیں ہوتی اور موجودہ حالت میں جماعت کا ساتھ دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے یہاں بچارے مدرس کو دو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ایک تو پچھلے کی تلافی کرنی اور دوسرے حالیہ درس سے پورا پورا استفادہ کرانا ورنہ یہ تازہ خامی بجائے خود مزید کم زوری کا پیش خیمہ ہوگی ایسی صورت میں لے دے کے مدرس کو کامل ذمہ دار تصور کرنا قرین انصاف نہیں ہو سکتا جماعت بندی اور داخلے کے وقت سفارشوں کے زور سے طلبہ ایسی جماعتوں میں شریک کر لئے جاتے ہیں جن میں تعلیم پانے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی۔ خود والدین اور سرپرست بھی یہ کہہ کر صدر مدرس کو مجبور کرتے ہیں کہ مکان پر خانگی تعلیم کا معقول انتظام کر دیا جائے گا اور خانگی اوقات کی بھی پوری نگرانی کی جائے گی مگر یہ صرف کہنے کی باتیں ہوتی ہیں اور عملی صورت اکثر مفقود ہوتی ہے بالفرض اگر باور بھی کر لیا جائے کہ وعدے کی پابندی کی جائے گی تو بھی یہ حقیقت کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ جو طالب علم حاضر باشی کے باوجود جس جماعت کے سالانہ امتحان میں ناکام ہوا ہو وہ خانگی تعلیم اور اوقات کی نگرانی کے سبب اوپر کے درجے میں ترقی پانے کی بجائے موعودہ امداد کے ساتھ اپنی جماعت میں ایک سال اور

تعلیم پانے کا بدرجہ اولٰے محتاج ہے۔ سند ترک مدرسہ کی بنا پر ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں طلبہ کی شرکت بھی کمزور طلبہ کی موجودگی کا سبب ہوا کرتی ہے کیونکہ اس کی رو سے ایک کمزور طالب علم بھی اپنے آپ کو اس جماعت میں شریک ہونے کا اہل اور مستحق تصور کرتا ہے جس جماعت کی سند اس کے پاس ہوتی ہے اُس کے انسداد کے لئے بعض مدارس میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ سند ترک مدرسہ کے موجود ہوتے امتحانِ داخلہ لیا جاتا ہے اور ہر مدرس متعلقہ سے مضمون مفوضہ کی نسبت تحریری رائے لی جاتی ہے مگر مدرسین اظہار حقیقت میں کوتاہی کیا کرتے ہیں اور قطعی وفیصلہ کن رائے کا اظہار کرنے کی بجائے موہوم توقعات وغیر ضروری مشروط قیاسات ظاہر کرتے ہیں جس کے سبب انسداد کی یہ تدبیر مطلوبہ کارگر نہیں ہوتی چنانچہ شاید ہی کوئی مدرسہ کسی سند ترک مدرسہ رکھنے والے طالب علم کو امتحان داخلہ کی بنا پر محولہ جماعت میں شریک کرنے سے انکار کر دیتا ہو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑی عمر کا لحاظ کرکے طلبہ استعداد سے بالا جماعتوں میں شریک کرلئے جاتے ہیں حالانکہ عمر و استعداد میں کچھ بھی مناسبت نہیں ہے بعض وقت امتحان سالانہ کے بعد اور داخلہ کے موقعہ پر بھی طلبہ کو مشروط ترقی دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر طالب علم مدت معینہ میں اہل ثابت نہ ہو تو نیچے کے درجے میں منتقل کر دیا جائے مگر باوجود نا اہل ثابت ہونے کے اس کی نوبت نہیں آتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اُسی جماعت میں شریک رہ کر فائدہ کی بجائے نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر بفرض محال منتقلی عمل میں آتی بھی ہے تو بعد از وقت ہونے کے سبب نقصان دہ ہوتی ہے کیوں کہ ترقی معکوس کے بعد وہ لازماً بددل اور بے توجہ ہو جاتا ہے چنانچہ اُس کے غیاب میں مختلف مضامین کے جو حصے پڑھا دئے جاتے ہیں اُن میں وہ بالکل کورا رہتا ہے اور جاریہ اسباق میں اس وجہ سے کافی توجہ نہیں کرتا کہ اس نے اُن کو ایک بار ختم کر دیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے امتحان میں بھی یا تو ناکام ہو جاتا ہے یا بہت ہی کم نمبر حاصل کرکے ادنیٰ درجے میں کامیاب ہوتا ہے حالانکہ دوسرے سال اس کی کامیابی نہایت ممتاز ہونی چاہیئے تھی اکثر اوقات غیر مستحق طلبہ دہری ترقی پا کر کمزوری کا شکار ہو جایا کرتے ہیں خصوصاً ایسی صورت میں یہ امکان زیادہ قوی ہو جاتا ہے

جبکہ طلبہ کو اس جماعت کے جدید مضامین میں کم مدت میں زیادہ معلومات حاصل کرنے پڑتے ہیں ظاہر ہے کہ دل و دماغ پر زیادہ بار ڈالنا قویٰ کو پژمردہ کر دیتا ہے اور یہی پژمردگی بالآخر کمزوری کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس طرح طلبہ بعض اُصول و مسائل میں امتحان دے کر کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن یہ کامیابی اس امر کی دلیل نہیں ہوتی کہ انہوں نے اُن کو بخوبی سمجھ بھی لیا ہے اِسی طرح بہت ممکن ہے کہ یہ دُہری ترقی پانے والا طالب علم اس جماعت کے امتحان میں کسی طرح کامیاب ہو جائے مگر یہ کامیابی اس حقیقتِ حال کی تردید نہیں کر سکتی کہ اس میں کمزوری موجود نہیں ہے اضافۂ تعداد طلبہ کی کوشش بھی بعض وقت کمزوری کا سبب ہوا کرتی ہے جب کسی مدرسے میں طلبہ کی تعداد گھٹ جاتی ہے تو مجبوراً طلبہ کی استعداد کو بڑی حد تک نظر انداز کر کے انہیں اونچی جماعتوں میں شریک کرنا پڑتا ہے کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ جب کسی ایک جماعت میں طلبہ کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور توفیر تعداد کے لئے تشدد کیا جاتا ہے تو مدرس جماعت کمزور سے کمزور طالب علم کو بھی آنکھ بند کر کے شریک کر لیتا ہے۔

چونکہ با استعداد اور کمزور طلبہ کی تعلیم مشترک ہوتی ہے اس لئے ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا لازمی ہے مثلاً کسی مسئلہ کے ذہن نشین کرانے میں اگر با استعداد طلبہ کو مجمل تفہیم کافی ہوتی ہے تو کمزور طلبہ کے لئے تفصیل بلکہ تکرار کی ضرورت ہوتی ہے ایسی حالت میں با استعداد طلبہ غیر متوجہ ہونے کے عادی بن جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ بے توجہی مستحکم ہونے لگتی ہے جس کے بعد اُستاد کی مختصر و مفید تفہیم بھی منفعت بخش نہیں ہوتی۔ الصحبۃ تاثر و لو کان ساعۃً یوں تو کمزور طلبہ کے سبب سے مقدار سبق میں خود بخود کمی ہوتی ہے مگر اکثر اوقات عمداً بھی ایسا کرنا پڑتا ہے اور جب نصاب کا ختم شدنی حجم زیادہ اور مدت تعلیم کم ہوتی ہے تو مدرس صرف نصاب ختم کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ با استعداد طلبہ بھی کما حقہٗ استفادہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں

کمزور طلبہ کا اثر نہ صرف با استعداد طلبہ پر پڑتا ہے بلکہ اس سے مدرسین متعلقہ بھی متاثر ہوتے ہیں جس کی تائید میں محض خیالات کے اظہار کی بجائے صرف ایک واقعہ بیان کرنا

بہت کافی ہوگا۔ ایک مدرسے کی سوم جماعت میں توفیر تعداد طلبہ کے مدنظر کم زور طلبہ زیادہ تعداد میں جمع ہوگئے تھے اور بدقسمتی سے داخلے کے وقت محض چھوٹی جماعت کا خیال کرکے کم زوری کا اہم مسئلہ قطعاً نظرانداز کردیا گیا تھا جب ختم سال تعلیمی کے قریب افسر معائنہ کنندہ نے اِس جماعت کا امتحان لیا تو نتیجہ نہایت خراب برآمد ہوا جس کے سبب مدرسین متعلقہ کی کارگزاری پر ناخوشنودی کا اظہار کیا گیا جن میں خصوصاً اُردو پڑھانے والے مدرس صاحب ٹرینڈ محنتی قابل۔ فرض شناس اور نہایت کارگزار تھے جنہوں نے نہ صرف صدر مدرس وقت کو اپنے کام سے ہر طرح مطمئن کر رکھا تھا بلکہ افسرانِ بالا بھی اُن کو بجا طور پر کارگزار تصور کرتے تھے چنانچہ کتاب الرائے اس حقیقت پر شاہد تھی۔ طرفہ یہ کہ چہارم و پنجم میں ان ہی مدرس صاحب کی دہی اُردو تعلیم قابل ستایش ثابت ہوئی۔ کیا اس تفاوت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جماعت سوم میں کام نہیں کیا ہرگز نہیں کام تو تینوں جماعتوں میں یکساں انہماک کے ساتھ کیا گیا مگر جس طرح کوئی زمین تخم ریزی کے باوجود کہیں کہیں پودے اُگانے سے عاری ہوتی ہے بالکل اُسی طرح بعض کم زور طلبہ بھی لایق و محنتی اُستاد کی تفہیم سے استفادہ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تخم ریزی کا نقص نہیں بلکہ زمین کی خامی ہے۔

اگر کسی جماعت میں ایسے کم زور طلبہ زیادہ تعداد میں جمع ہوجائیں کہ جن کی اصلاح سے مایوسی ہوجائے اور جن کا وجود دوسرے بااستعداد طلبہ پر اثرانداز ہونے لگے تو اُس کے انسداد کی بہترین صورت یہی ایک ہوسکتی ہے کہ امتحان لے کرنا کام طلبہ کا ایک درجہ تنزل کردیا جائے اس طرزِ عمل سے اگر یہ خدشہ پیدا ہوجائے کہ طلبہ واویلا مچائیں گے تو گوناگون فوائد کے مدنظر اس کی مطلق پروا نہ کرنی چاہیے نادان مریض تو مہلک دنبل پر بھی خفیف عمل جراحی کرانے سے ہمیشہ ناراض ہی رہے گا مگر حقیقت شناس طبیب کبھی اُس پر ملتفت نہیں ہوسکتا اور اس کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ کرگزرتا ہے ظاہر ہے کہ حکیم کے مشورے کے خلاف مریض کی ہر رائے مریض ہی ہوا کرتی ہے۔

بعض طلبہ بعض مضامین فطرتاً کم زور ہوا کرتے ہیں اور فطرتی کمزوری عموماً اندرونی خلل پر مبنی ہوتی ہے جس کی اصلاح مدتوں کی لگاتار کوشش کے بعد بھی کماحقہ نہیں ہوسکتی ایسی

حالت میں اساتذہ کو صرف اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ طلبہ کسی طرح کامیاب ہو جائیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہیں لطائف الحیل کو چارہ کار بنانا پڑے گا جن کی نوعیت مضمون اور طالب علم کی کم زوری کے لحاظ سے مختلف ہوگی مثلاً اگر کسی طالب علم کا دماغ حساب میں فطرتاً کم زور ہے اور وہ عبارتی سوالات کی معمولی پیچیدگی کو بھی حل نہیں کرسکتا ہے تو ایسے طالب علم کو سالانہ امتحان میں پوچھے جانے والے غیر عبارتی سوالات مثلاً کسرات کی تحویل اور مقسوم علیہ اعظم وغیرہ نیز ایسے عبارتی سادہ سوالات جو زیادہ از زیادہ ایک یا دو اصول کے تابع ہوں مثلاً تجارت مفرد و مرکب وغیرہ کی زیادہ تر مشق کرانی چاہیئے تاکہ وہ پورے پرچے میں کامیابی کے نمبر حاصل کرسکے۔

مضمون کے لحاظ سے کم زور طلبہ کی اصلاح کا طریقہ اصولاً مختلف ہوگا مثلاً تاریخ و ادب کہ تاریخ کا تعلق زیادہ تر قوتِ حافظہ سے ہوتا ہے اور مضمون ادب کا راست واسطہ قوت فہم سے ہے چونکہ حافظہ اور فہم دو مختلف قوتیں ہیں اس لئے اِن کی کم زوری کی اصلاح کی تدابیر بھی مختلف ہوں گی تاریخ کے سبق کے دوران میں عموماً اور اختتام پر خصوصاً کم زور طلبہ سے چند سوالات اس مقصد سے کرنے چاہئیں کہ سبق حتی الامکان یاد ہو جائے ابتدائی سوالات محذوفی ہوں تاکہ طلبہ فوری جوابات دے سکیں اور اس طرح اُن کی ہمت افزائی اور درمیانی و اختتامی سوالات کے جوابات دینے کی رغبت و اہلیت پیدا ہو۔ مزید براں پورے سبق پر حاوی چند موزون سوالات کے جوابات کا مکان سے لکھ لانا بھی مفید ہوگا اِن جوابات کی نہ صرف جانچ کرنی چاہیئے بلکہ اِس امر کا اطمینان بھی کر لینا بہت ضروری ہے کہ اپنی عبارت میں لکھے ہوئے جوابات طالب علم کو یاد بھی ہیں یا نہیں۔ ادب میں کم زوری کی مثال یوں فرض کیجیے کہ ایک طالب علم اشعار کا مطلب بہ مشکل تمام سمجھ سکتا ہے اس کی اصلاح کے لئے مناسب ہوگا کہ پہلے اُستاد شعر اس طرح پڑھے کہ سمجھنے میں غیر معمولی سہولت پیدا ہو جائے پھر طالب علم سے دو تین بار اِس انداز سے پڑھوائے اور نثر کراتے وقت محذوفات بھی بشرطیکہ موجود ہوں داخل کرائے اس کے بعد مطلب دریافت کرے اور دوران بیان میں غلطی کی اصلاح کرائے بالآخر کسی قدر وضاحت سے

دل چسپ پیرایے میں خود مطلب بیان کر کے ضروری تمثیلات سے اس کو ذہن نشین اور مستحکم کرے نیز ایسے طالب علم کو تاکید کرنی چاہیئے کہ وہ پڑھائے جانے والے اشعار مکان میں بہ غور پڑھ کر آیا کرے تاکہ جماعت میں سبق کے دوران میں پیش آنے والی مشکلات کسی قدر آسان ہو جائیں اور تفہیم میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس مضمون میں طلبہ کم زور ہوتے ہیں اُس کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں اور حصول کامیابی کے چند فرضی طریقوں کو چارہ کار بنانے پر اکتفا کرتے ہیں حالانکہ ضرورت اِس طریق عمل کے برعکس ہوتی ہے ایسی صورت میں اُستاد کو چاہیئے کہ سبق کو خاص طور پر دل چسپ بنائے تاکہ توجہ میں زیادتی اور انہماک پیدا ہو جائے۔

بعض طلبہ کم زور مضمون میں ناجائز مدد کے طالب ہوتے ہیں جس کے سبب کم زوری اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر اُستاد اِس طریقۂ کار سے واقف نہ ہو تو یہی ناجائز طلب مبدل بہ عادت ہو جائے گی جس کے بعد اصل کم زوری کا رفع کرنا مشکل بلکہ محال ہو جائے گا۔ اُستاد کو چاہیئے کہ مکان اور جماعت میں کئے ہوئے کاموں کا باہم مقابلہ کرکے طلبہ کی ناجائز مدد کا پتہ لگائے اور جماعت میں خاص طور پر نگرانی کرے تاکہ ناجائز مدد دینے کا موقع نہ ملے نیز مکان پر کئے جانے والے کام میں ایسی سہولتیں بہم پہونچائے کہ طلبہ ناجائز مدد کے بغیر بذات خود کام کرنے پر قادر ہو جائیں مگر اس کا خیال بھی رہے کہ اِن سہولتوں میں رفتہ رفتہ مناسب کمی کر دی جائے تاکہ طلبا اس احتیاج سے مستغنی ہو جائیں۔

اکثر مدرسین کم زور طلبہ پر نسبتاً زیادہ خفا ہوا کرتے ہیں جس سے طلبہ میں خوف اور بے توجہی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں کم زوری کے لئے سخت مضر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکیم کا مریض پر غصہ ہونا اصلاح کی بجائے خرابی کا موجب ہوتا ہے اسی طرح طلبہ کو بار بار جھپانا اور جھنجوڑنا بھی مفید نہیں ہوتا کیونکہ اِس سے اُن میں بد دلی اور نفرت کے سوا ڈھٹائی بھی پیدا ہو جائے گی جس کے بعد اچھے اثرات کو جلد قبول کر لینے کا مادہ لازماً مفقود ہو جائے گا اور کم زوری کو بار بار محسوس کرانے کی مضر کوشش کا نتیجہ انتہائی نا اُمیدی ہوگا

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کم زور طلبہ سے بلالحاظ مضمون زیادہ کام لیا جاتا ہے جو بجائے خود نقصان دہ ہوتا ہے مثلاً اگر کسی طالب علم کا حافظہ کم زور ہے اور وہ تاریخی واقعات یا اشعار کو یاد نہیں رکھ سکتا تو ایسے طالب علم کو حفظ کرانے کے لئے زیادہ کام دینا صریح غلطی ہے کیونکہ جو دماغ تھوڑے سے بار کو بھی بہ مشکل برداشت کر سکتا ہو اُس پر مزید بار ڈالنا کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔

جب اُستاد کم زور طلبہ کی اصلاح غلط طریقے پر کرنے لگتا ہے تو نتیجہ اُمید افزا ہونے کی بجائے مایوس کُن ہوتا ہے ظاہر ہے کہ جس مریض کا نسخہ بدقسمتی سے غلط مرتب کیا گیا ہو اس کو اُس دوا سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا بلکہ اُس کے برخلاف "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مصداق ہوتا ہے۔ بالآخر اُستاد مایوس ہو کر اس طالب علم کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کی حالت بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔

عموماً کم زور طلبہ شرح کے ذریعہ اپنی کمزوری کو رفع کرنا چاہتے ہیں۔ یوں تو شرح کا استعمال کم از کم وسطانیہ طبقے کے لئے ہر صورت میں نقصان رساں ہے مگر کم زور طلبہ کے لئے تو سمِّ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پہلے پہل خود طالب علم اور استاد دونوں رفع کم زوری اور اصلاح حال کو محسوس کریں لیکن چونکہ اس احساس کی بناء غیر مستحکم ہوتی ہے اس لئے بہت جلد طالب علم نہ صرف اپنی سابقہ کم زوری کے درجے سے اور بھی نیچے گر جائے گا بلکہ اُس میں شرح کے استعمال سے بعض اور خرابیاں مثلاً تن آسانی تفہیم سے بے توجہی۔ لغات کے مطالعہ سے اغماض وغیرہ پیدا ہو جائیں گی۔

جہاں کم زوری کو رفع کرنے کے لئے بہت سے غلط طریقوں پر آنکھ بند کر کے عمل کیا جاتا ہے وہاں بدقسمتی سے لالچ اور خوف سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ لالچ اور خوف سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یقیناً ناپائدار اور عارضی ہوا کرتے ہیں۔ اس میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ جب طلبہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر وہ دوسرے کام کو بھی جس میں لالچ اور خوف کو دخل نہیں ہوتا یا تو کرتے ہی نہیں اور کرتے بھی ہیں تو بالکل بے توجہی سے جو نہ کرنے سے بدتر ہوتا۔

کم زور طلبہ بدرجۂ اولیٰ مستحق ہیں کہ اُن کے ساتھ نسبتاً زیادہ رعایت کی جائے اور دل جوئی و حسنِ سلوک سے کام لیا جائے تاکہ وہ کمزوریوں کی اصلاح سے مایوس نہ ہونے پائیں اور اُستاد کا حسنِ سلوک اُن کو زیادہ محنت و توجہ کی طرف راغب کرے۔ اگر اس کے ساتھ سبق میں دلچسپی اور تفہیم میں طلبہ کو متوجہ کر لینے کی صفت پیدا ہو جائے تو کامل وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کمزوری یقیناً رفع ہو جائے گی۔

سید غلام محمود
صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ عثمانیہ دارالشفاء بلدہ

میسور کا نظامِ تعلیم

اوآخر ۳۲ء میں سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کی جانب سے سید علی اکبر صاحب ایم اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و اطراف ریاست میسور تشریف لے گئے تھے تاکہ وہاں جبری تعلیم جن اصول و ضوابط کے تحت نافذ و رائج ہے ان کا مطالعہ فرمائیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے تقریباً دو درجن مدرسوں کا معائنہ فرمایا اور حیدرآباد واپس آنے پر ایک بسیط رپورٹ مرتب فرمائی جس میں ہمسایہ ریاست کی تعلیمی خصوصیات پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ذیل کا مضمون اسی رپورٹ کا مختصر مگر جامع خلاصہ ہے۔

مدیر

ریاست میسور کا رقبہ (۲۹۵۲۸) مربع میل اور آبادی (۶۵۵۷۳۰۲) ہے آمدنی تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپیہ ہے۔ کالج اور مدارس کی تعداد (۷۰۹۰) ہے جن میں (۲۰۱۵۰۶) طلبا زیر تعلیم ہیں۔ تعداد طلبہ قابل تعلیم کے منجملہ فی صدی (۲۹.۳۵) طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اگر صرف لڑکوں کا شمار کیا جائے تو فی صدی تعداد (۵۷.۲۱) اور اگر صرف لڑکیوں کا شمار کیا جائے تو (۱۴.۱۶) ہوتی ہے سالانہ اخراجات تعلیم (۶۰) لاکھ ہیں جس میں سے سوا چھ لاکھ یونیورسٹی۔ ساڑھے پانچ لاکھ مدارس

فوقانیہ دس لاکھ مدارس وسطانیہ اور بیس لاکھ پرائمری مدارس پر صرف ہوتے ہیں۔

نہ صرف مدارس تحتانیہ بلکہ مدارس وسطانیہ میں بھی تعلیم مفت ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم ریاست میسور میں دو فرسٹ گریڈ کالج ہیں اور چار انٹرمیڈیٹ کالج ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالجوں میں صرف دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ جونیر انٹرمیڈیٹ اور سینیر انٹرمیڈیٹ۔ ان کالجوں کے قیام کی ایک غرض یہ ہے کہ جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کے اہل ہوں یونیورسٹی کے لئے انکا انتخاب کر لیا جائے۔ اور باقی طلبہ دو سالہ کورس ختم کر کے اپنے رجحان کے مطابق انجینیرنگ کالج یا میڈیکل کالج میں شریک ہو جائیں۔ یا کسی اور پیشہ کی تعلیم حاصل کریں۔ یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے انگریزی کا معیار بلند رکھا گیا ہے۔

تعلیم فوقانیہ مدارس فوقانیہ کی تعداد ۲۳ ہے۔ جن کے منجملہ ۱۶ سرکاری ۵ امدادی اور ۲ مسلمہ سرکار ہیں۔ مدارس فوقانیہ میں صرف تین جماعتیں ہوتی ہیں۔ فورتھ ففتھ اور سکستھ فارم۔ فورتھ فارم میں ایسے طلبہ شریک کئے جاتے ہیں جنہوں نے امتحان لوئر سکنڈری میں انگریزی بطور زبان لازمی لے کر کامیابی حاصل کی ہو۔ امتحان سکنڈری اسکول لیونگ سرٹیفکٹ میں انگریزی زبان ملکی یا کوئی کلاسیکل زبان (یعنی عربی۔ فارسی سنسکرت) ریاضی۔ سائنس ابتدائی جس میں طبیعات اور کیمیا کے علاوہ نباتات اور حیاتیات شامل ہیں۔ تاریخ ہند اور جغرافیہ دنیا لازمی ہیں اس کے علاوہ دو اختیاری مضامین لینے پڑتے ہیں جس میں ایسے طلبہ کے لئے جو یونیورسٹی میں شریک نہیں ہونا چاہتے ہیں، کامرس، مصنوعات، زراعت جیسے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ بنگلور میں جو لڑکے مصنوعات بطور اختیاری مضمون کے لیتے ہیں۔ وہ عملی تعلیم کے لئے انجینیرنگ اسکول کو جایا کرتے ہیں۔

ہائی اسکول کی تعلیم کی جس قدر مانگ ہے اس کے لحاظ سے موجودہ تعداد مدارس کم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ مدارس میں تعداد کی کثرت ہے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں تقریباً ڈھائی ہزار لڑکے سکنڈری اسکول لیونگ سارٹیفکٹ میں کامیاب ہوئے۔

کامیاب اُمیدواروں کی اسناد میں اس امر کی صراحت کی جاتی ہے کہ آیا وہ کالج میں شریک ہونے یا محض ملازمت کے قابل ہیں۔

مدارس وسطانیہ | ریاست میسور میں دو قسم کے مدارس وسطانیہ قائم ہیں۔ مدارس وسطانیہ کنٹری
مدارس وسطانیہ اُردو۔ اول الذکر مدارس میں ذریعۂ تعلیم کنٹری ہے اور آخر الذکر مدارس میں اُردو۔
مدارس وسطانیہ کنٹری کی تعداد (۲۱۴) اور مدارس وسطانیہ اُردو کی تعداد (۲۱) ہے اس کے علاوہ
(۲۴۱) کنٹری اور (۴۸) اُردو مدرسے ہیں۔ جہاں صرف سال اول اور سال دوم کی جماعتیں قائم
ہیں۔ (۹۰) فیصدی مدارس وسطانیہ شاہی ہیں اور صرف ۱۰ فیصدی امدادی۔ مدارس وسطانیہ میں
صرف چار جماعتیں ہوتی ہیں اور حسب ذیل مضامین کی تعلیم دیجاتی ہے۔

اخلاقیات۔ انگریزی۔ کنٹری یا اُردو۔ ریاضی۔ تاریخ ہند۔ جغرافیہ۔ نیچر اسٹڈی یا ابتدائی
سائنس۔ ڈرائنگ اور دستی کام (لڑکیوں کو بجائے ابتدائی سائنس کے امور خانہ داری اور
سوزن کاری کی تعلیم دی جاتی ہے)

سنسکرت۔ فارسی۔ حفظان صحت۔ زراعت۔ عملی تعلیم (پراکٹیکل انسٹرکشن) اور سائنس
(طالبات کے لئے) اختیاری مضامین ہیں۔

زراعت اور عملی تعلیم کا انتظام ہر مدرسۂ وسطانیہ میں نہیں، بلکہ خاص خاص مدارس میں کیا
گیا ہے۔ عملی تعلیم میں نجاری، خیاطی، پتیل کا کام، آہنگری، پارچہ و بید بافی وغیرہ شامل ہیں۔

مدارس تحتانیہ | ریاست میسور میں مدارس تحتانیہ کی مجموعی تعداد (۶۳۶۲) ہے جس کے منجملہ
(۴۲۹۶) شاہی (۸۶) میونسپل یا لوکل فنڈ اور (۱۹۸۱) امدادی مدارس ہیں۔ مدارس تحتانیہ اُردو ذکور
کی تعداد (۶۶۰) اور مدارس تحتانیہ اُردو نسوان کی تعداد (۱۸۸) ہے پست اقوام کے طلبہ کے لئے
(۶۲۸) مدارس قائم ہیں۔

مدارس تحتانیہ میں چار جماعتیں ہوتی ہیں اور مدت تعلیم چار سال ہے۔ نصاب حسب ذیل
مضامین پر مشتمل ہے۔

کنٹری یا اُردو، اخلاقیات، حساب، نیچر اسٹڈی، سبق الاشیاء، ڈرائنگ، دستی مشاغل،
تاریخ و جغرافیہ، گانا (صرف کنٹری مدارس میں) اور قصہ گوئی (پہلی اور دوسری جماعت میں)
مدارس تحتانیہ میں سوائے مادری زبان کے کسی اور زبان کی تعلیم مطلق نہیں دی
جاتی ہے۔

جبری تعلیم | ریاست میسور میں جبری تعلیم کا قانون ۱۹۱۳ء میں نافذ ہوا۔ اس وقت ۲۴۰
مرکزوں میں جبری تعلیم رائج ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں ہر دو کے لیے جبری تعلیم کی عمر ، سے
۱۱ سال تک رکھی گئی ہے جبری تعلیم کے لئے ، سال کا سن زیادہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ
اکثر مدارس تحتانیہ میں اس سے کم عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔
ابتداء میں جبری تعلیم کے جملہ اخراجات کا بار خزانہ شاہی نے برداشت کیا۔ لیکن چند
سال ہوئے کہ گورنمنٹ نے یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ میونسپلٹیاں اور لوکل فنڈ کی کمیٹیاں اس
ذمہ داری کو اپنے سر لیں چنانچہ اسی غرض سے ان کو تعلیمی سس وصول کرنے کا اختیار دیا
گیا ہے۔ اب تک صرف بنگلور کی میونسپلٹی نے پرائمری تعلیم کی ذمہ داری پورے طور پر لی ہے
اخراجات کا ایک ثلث میونسپلٹی اور دو ثلث گورنمنٹ ادا کرتی ہے۔ مدارس کی نگرانی اور جبری
تعلیم کے انتظام کے لئے میونسپلٹی کی جانب سے ایک سپرنٹنڈنٹ مقرر ہے۔ لیکن مدارس کا
معائنہ حسب سابق سررشتہ تعلیمات کے تفویض ہے۔ بنگلور میں ، اور ۱۱ سال کے لڑکوں
اور لڑکیوں کی مجموعی تعداد تقریباً دس ہزار ہے جن میں سے ساڑھے آٹھ ہزار زیر تعلیم ہیں۔
بقیہ ڈیڑھ ہزار کے لئے موجودہ مدارس میں کافی گنجائش نہیں ہے اور جدید مدارس کا افتتاح
زیر غور ہے۔ شہر میسور میں پرائمری تعلیم کے جملہ اخراجات (۹۱۰۰۰) ہیں جس میں سے صرف
(۱۵۰۰۰) میونسپلٹی ادا کرتی ہے۔ میونسپلٹی چاہتی ہے کہ پرائمری تعلیم اس کے تفویض کی جائے۔
لیکن ابھی اس کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ اخراجات کا ایک ثلث برداشت کرے۔ میسور
میں جبری تعلیم کا انتظام ایک مددگار مہتمم تعلیمات کے ذمہ ہے بنگلور اور میسور کے علاوہ اضلاع
میں بھی بعض مقامات پر جبری تعلیم رائج ہے۔ ایسے مقامات عموماً ضلع یا تحصیل کے مستقر ہیں۔
ضلع کے مستقر پر مددگار مہتمم تعلیمات اور تحصیل کے مستقر پر مقامی مدرسۂ وسطانیہ کا صدر مدرس
جبری تعلیم کے لئے اٹنڈنس افسر (افسر برائے انتظام حاضری طلبہ) کے فرائض انجام دیتا ہے۔
ٹرننگ اسکولز | گراجوئیٹس کی ٹرننگ کا انتظام یونیورسٹی میں کیا گیا ہے۔ انڈر گراجوئیٹس
کی ٹرننگ کے لئے سررشتۂ تعلیمات کے تحت ایک کالج ہے اور مڈل کامیاب مدرسین کی
ٹرننگ کے لئے (۹) نارمل اسکول قائم ہیں۔ جن میں سے ایک مدارس تحتانیہ اردو کے

اساتذہ کے لئے ہے۔ انڈر گراجوئیٹس کا کورس ایک سالہ اور مڈل کامیاب مدرسین کا کورس دوسالہ ہے۔ زمانہ ٹرننگ میں سرکاری مدارس کے اساتذہ کو پوری تنخواہ ایصال کی جاتی ہے۔

مشاہرات مدرسین | مدارس فوقانیہ کی صدارت پر یا تو یورپ کے ڈگری یافتہ اور ٹرینڈ اشخاص یا ہندوستان میں تعلیم پائے ہوئے تجربہ کار ٹرینڈ گراجوئیٹس معقول مشاہرات پر مامور ہیں۔ مددگاری کی جائداد ول پر ٹرینڈ گراجویٹ۔ گراجوئیٹ اور سنسکرت اور فارسی و عربی کی تعلیم کے لئے امتحانات پنڈت یا مولوی میں کامیاب شدہ اشخاص کا تقرر کیا جاتا ہے۔

مدارس وسطانیہ کی صدارت پر عموماً ٹرینڈ گراجویٹ اور مدارس تحتانیہ کی صدارت پر ٹرینڈ میٹرکیولیٹ مقرر ہیں نان گزٹیڈ ملازمین سررشتہ کی تنخواہوں کا اسکیل بمقابلہ ممالک محروسۂ سرکار عالی کے کم ہے چنانچہ مدارس ثانویہ میں ٹرینڈ گراجوئیٹ کو زیادہ سے زیادہ ([illegible] ۔ [illegible] مار [illegible]) گراجوئیٹ کو ([illegible] ۔ [illegible] ۔ [illegible]) ایف اے کو ([illegible] ۔ [illegible]) ٹرینڈ میٹرکیولیٹ کو ([illegible]) اور میٹرکیولیٹ کو ([illegible]) ایصال ہوتے ہیں۔ مدارس تحتانیہ میں قابلیت اور مدت ملازمت کے اعتبار سے ([illegible] سے [illegible]) اور بعض صورتوں میں ([illegible]) تک تنخواہ دی جاتی ہے۔

تعلیم نسواں | مدارس نسواں کی تعداد (۸۸ ۷) ہے جن میں تقریباً (۳۸۰۰۰) طالبات زیر تعلیم ہیں۔ علاوہ ان طالبات کے تقریباً (۲۴۰۰۰) لڑکیاں مدارس ذکور میں شریک ہیں۔ لڑکیوں کے لئے ایک کالج ۵ مدارس فوقانیہ انگریزی ایک مدرسۂ فوقانیہ کنڑی (۲۲) کمپلیٹ مڈل اسکول اور (۷۰۵) مدارس تحتانیہ قائم ہیں۔ نہ صرف ہندو بلکہ مسلمان لڑکیاں بھی تعلیم میں اچھی ترقی کررہی ہیں۔ مسلمان طالبات زیر تعلیم کی تعداد (۱۳۰۰) ہے جس میں سے ۳ کالج ۹ مدارس فوقانیہ (۲۷۴) مدارس وسطانیہ اور باقی مدارس تحتانیہ میں شریک ہیں۔ مسلمان لڑکیوں کو ہائی اسکول کی تعلیم کی غرض سے علی گڈہ جانے کی ترغیب دلانے کے لئے ڈھائی ڈھائی سو روپیہ کے دو وظائف دینے کا سال گذشتہ گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا لیکن کوئی درخواست وصول نہیں ہوئی۔ تعلیم نسواں کے انتظام میں ناظم تعلیمات کی امداد کے لئے دفتر نظامت تعلیمات میں ایک لیڈی اسسٹنٹ مامور ہے۔ مدارس نسواں کنڑی کے معائنہ کے لئے چار

مددگار مہتمات اور مدارس نسواں اُردو کے معائنہ کے لئے دو مددگار مہتمات مامور ہیں بنجملہ (۹) نارمل اسکولوں کے نارمل اسکول مُعلمات کے لئے ہیں جن میں سے ایک میں مدارس نسواں اُردو کی مُعلمات ٹریننگ حاصل کرتی ہیں۔

مدارس نسواں اُردو میں سوزن کاری اور ڈرائنگ اور مدارس نسواں کنڑی میں علاوہ ان دو مضامین کے موسیقی کی جانب خاص توجہ کی جاتی ہے۔ تین مدارس نسواں میں چرخے کی جماعتیں بھی قائم کی گئی ہیں تاہم نصاب میں طالبات کی ضروریات کا جیسا لحاظ ہونا چاہیے نہیں کیا گیا ہے۔

پست اقوام کے طلبہ کی تعلیم۔ اکثر دیہات میں پست اقوام کے بچوں کے لئے علیحدہ مدارس تحتانیہ قائم ہیں۔ ان مدارس کے طلبہ کو منجانب سرکار سامان نوشت وخواند اور فی طالب علم ایک جوڑ کپڑا سالانہ دیا جاتا ہے۔

پست اقوام کے طلبہ کے لئے چار مدارس وسطانیہ قائم ہیں۔ جن میں سے تین میں دارالاقامہ جات بھی ہیں اور عام مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ میں جو پست اقوام طلبہ زیر تعلیم ہیں ان کو معقول وظائف دئے جاتے ہیں۔ میسور میں ایک مدرسہ ہے جہاں ایسے طلبا کو لوئر سکنڈری امتحان کے لئے تیار کرنے کے علاوہ ان کو مختلف مقامی صنعتوں یعنی خیاطی، نجاری، پارچہ بانی، بوٹ وشوز سازی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

مدرسہ کور وگنگ اندھے اور گونگے اور بہرے بچوں کے لئے میسور میں ایک مدرسہ اچھے پیمانہ پر قائم کیا گیا ہے گونگے اور بہرے بچوں کو خاص طریقہ پر لکھنا اور حساب سکھایا جاتا ہے ہر ایک بچہ کو حسب ذیل صنعتوں میں سے کم از کم دو صنعتیں سیکھنی پڑتی ہیں تاکہ کورس ختم کرنے کے بعد حصول معاش میں اس کو کوئی دشواری نہ ہو۔

بید بانی - نجاری - پارچہ بانی - خیاطی

اندھے بچوں کو اسی طریقہ پر پڑھنا سکھایا جاتا ہے جو یورپ اور برٹش انڈیا کے مدارس میں رائج ہے۔ تختہ اوقات تعلیم میں سب سے زیادہ وقت موسیقی کے لئے رکھا گیا ہے کیونکہ انھوں کی معاش کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

ورزش جسمانی وبارے اسکاوٹنگ۔ مدارس تحتانیہ میں ٹرینڈ اساتذہ ڈرل اور دیسی کھیل سکھاتے ہیں مدارس فوقانیہ اور بعض مدارس وسطانیہ میں ڈرل ماسٹر مقرر ہیں مدارس میں تعلیم جسمانی کی نگرانی اور اصلاح کرنے کے لئے حال میں دو انسپکٹر مقرر کئے گئے ہیں۔ ایک کا مستقر بنگلور اور دوسرے کا میسور ہے۔ یہ دونوں انسپکٹر گراجوئیٹ ہیں اور وائی ایم سی۔ اے اسکول آف فزیکل کلچر مدراس کے تربیت یافتہ ہیں۔

طبی معائنہ مدارس ریاست میسور میں تقریباً ایک سال سے طلبہ کے طبی معائنہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ بنگلور میں یہ کام دو پورے وقت کے ڈاکٹروں کے سپرد ہے۔ مدارس تحتانیہ میں طبی معائنہ کے اخراجات کا ایک ثلث منجانب میونسپلٹی اور دو ثلث خزانہ شاہی سے ادا ہوتا ہے۔ ہر مدرسہ کا معائنہ سال میں ایک دفعہ ہوتا ہے اور اس کے لئے مدارس تحتانیہ میں فی طالب علم چار آنے اور مدارس ثانویہ میں آٹھ آنے فیس لی جاتی ہے۔ میسور میں صرف ایک ڈاکٹر مقرر ہے۔ اضلاع میں جہاں ڈاکٹر موجود ہیں وہاں طبی معائنہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

میجک لانٹرن کے ذریعہ تعلیم۔ ہر مدرسہ فوقانیہ کو ایک میجک لانٹرن دیا گیا ہے جس کو مدرس لکچروں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور اس کام کے لئے اس کو دس روپیہ ماہانہ الاؤنس دیا جاتا ہے۔

دفتر نظامت تعلیمات سے سلائیڈز مختلف مدارس فوقانیہ میں گشت کرائے جاتے ہیں۔ میلوں اور تہواروں کے موقع پر میجک لانٹرن ڈسٹرکٹ بورڈ کے حوالہ کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ عوام کو مفید معلومات بہم پہونچانے کا انتظام کرے۔

مدارس شبینہ مدارس شبینہ کی تعداد (۵۲۳) ہے جن میں (۱۱۶۹۰) بالغ العمر اشخاص زیر تعلیم ہیں۔ کنڑی مدارس شبینہ میں اب کوشش کی جا رہی ہے کہ طلبہ تین مہینہ کی مدت میں لکھنا پڑھنا اور معمولی روزمرہ کا حساب سیکھ لیں۔

فنی تعلیم مدارس صنعت وحرفت کا تعلق محکمۂ صنعت وحرفت سے ہے ان کی تعداد (۱۹) ہے جن میں تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ مدرسۂ انجینرنگ بنگلور میں سول میکانکل

اور الکٹریکل انجینیرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ۵ تجارتی مدارس بھی ہیں۔ جن میں (۵۰۰) طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔

میسور کے نظامِ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدارس فوقانیہ میں محض فوقانیہ اور مدارس وسطانیہ میں محض وسطانیہ جماعتیں قائم ہیں۔ نیز بہ خلاف ممالک محروسہ سرکارِ عالی کے جہاں طبقہ تحتانیہ میں ۵ اور طبقہ وسطانیہ میں تین جماعتیں ہوتی ہیں۔ میسور میں طبقہ تحتانیہ اور طبقہ وسطانیہ چار چار جماعتوں پر مشتمل ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ تحتانیہ مدارس میں انگریزی مطلق نہیں پڑھائی جاتی۔ بلکہ مدارس وسطانیہ کی پہلی جماعت سے طلبہ انگریزی بطور زبان دوم شروع کرتے ہیں۔ باوجود اس کے جو طلبہ امتحان لوئر سکنڈری کامیاب ہوکر فورتھ فارم میں شریک ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ان کی استعداد ہمارے ہاں کے ان طلبہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی جو امتحان مڈل کامیاب کرکے فوقانیہ پری میٹرک یا فورتھ فارم میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میسور کی سرکاری زبان انگریزی ہے۔ اور وہاں کے طلبہ کو انگریزی سننے اور بولنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ یونیورسٹی اور مدارس فوقانیہ میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ لیکن کنڑی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی تحریک کو روز بروز تقویت ہو رہی ہے۔ جماعت مڈل تک ذریعہ تعلیم یا تو کنڑی ہے یا اُردو۔ اور اس وجہ سے اردو اور کنڑی کے علٰحدہ علٰحدہ مدارس قائم ہیں۔ اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان لڑکے جُدا جُدا مدارس میں پڑھتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ بہ مقابلہ ممالک محروسہ سرکارِ عالی میسور میں ہندو اور مسلمان طلبہ میں زیادہ اجنبیت ہے۔

میسور کی تعلیمی ترقی کا راز یہ ہے کہ اولاً وہاں کی رعایا تعلیم کی شوقین ہے اور تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس نہ صرف شہروں بلکہ دیہات کے باشندوں کو بھی ہے۔ اور ثانیاً رعایا کے علاوہ دیگر محکمہ جات اور خصوصاً محکمہ مال کے عہدہ دار سررشتہ تعلیمات کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہر سال میسور اکامانک کانفرنس میں جس میں مختلف سررشتہ جات کے نمایندوں کے علاوہ غیر سرکاری اراکین بھی شریک ہوتے ہیں بورڈ آف ایجوکیشن کی جانب سے پوری ریاست اور اسسٹنٹ کمشنروں (اول تعلقداروں) کی جانب سے مختلف اضلاع کی تعلیمی حالت پر رپورٹیں پیش ہوتی ہیں جن پر بحث ہونے کے بعد سال آیندہ کے لئے پروگرام تیار کیا جاتا ہے۔

بورڈ آف ایجوکیشن نے حال میں پرائمری تعلیم کی مزید اشاعت کے لئے ایک اسکیم مرتب کی ہے۔ جو اس وقت گورنمنٹ کے زیر غور ہے۔ اگر یہ اسکیم منظور ہو جائے تو پوری ریاست میں جبری تعلیم رائج ہو جائے گی۔

سیّد علی اکبر

بچّوں کا نفس

(سلسلہ کے لئے شمارہ ۲ جلد ۳ ملاحظہ ہو۔)

ذیل میں "راہ نو" کے ایک دوسرے باب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے اس باب میں آقا حسین کاظم زادہ نے قوانین نفسیات اور ان کے طریق استعمال پر بحث کی ہے۔ ہمیں امید ہے پہلی قسط کی طرح یہ قسط بھی مفید ثابت ہوگی۔

شریک مدیر

توارث کا اصول ہے کہ ہر ایک بچہ چند نسلی آبائی اور فطری استعداد و خواص لے کر پیدا ہوتا ہے جو آیندہ زندگی میں اپنی پُر قوت تاثیرات کے ذریعہ کم و بیش اس کی ممکنات پر اثر ڈالیں گے یہ بات ہر مربی (تربیت دینے والے) کے فریضہ میں داخل ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو دریافت کرکے صحیح طریقہ پر اُن کی تربیت کرے۔

یہ صفتیں اور استعدادیں جو نسلی اور آبائی ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تمام بچوں میں یکساں نہیں پائی جاتیں اور نہ اُن کے لئے عام طور سے کوئی حکم دیا، یا قانون وضع کیا جاتا ہے، بلکہ اُن کو دریافت کرکے کام کے قابل بنانا، اُس مُربّی (معلم) کی معلومات اور تجربہ سے متعلق ہوتا ہے جو بچہ کا معنوی طبیب ہے۔ لیکن بعض طبائع اور صفات ایسی بھی ہیں جو فطری اور جبلّی ہونے کے اعتبار سے تمام بچوں میں پائی جاتی اور زندگی کے مختلف دور میں ظاہر ہو کر غائب ہو جاتی ہیں اور یہ تمام کی تمام ایک خاص اہمیت رکھنے والی ہوتی ہیں جن کا تعلق بچوں کی آئندہ قسمت سے وابستہ ہے۔ یہاں پر ہم اُن

صفات اور طبائع کے بارہ میں، جو بچوں کی نفسیات کا آئینہ ہیں، چند امور۔ کہ اُن کو کس طور پر وجود میں لایا اور کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ بیان کرتے ہیں:۔

(۱) بچہ کا نفس (باعتبار جذبی کیفیتوں کے) تمام جذبات سے زیادہ غرور کا جذبہ رکھتا ہے جس کو لوگ انانیت (خودی) کہتے ہیں اور یہی انانیت ہم سے احترام کی طالب ہوتی ہے۔

(۲) بچہ ہٹ، خودسری اور آزادی کو دوست رکھتا ہے۔

(۳) بچہ میں تحقیق اور دریافت کا جذبہ۔ اس وجہ سے کہ ہر ایک چیز اُس کے لیے نئی اور تازہ ہوتی ہے ۔ بہ غایت پایا جاتا ہے اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ کسی نقاش نے بچہ کی آنکھ کی تپلی کو جو اُس کے نفس کی حالت سے خبر دیتی ہے استفہامی علامت "؟" کی شکل میں کھینچا ہے۔

(۴) بچہ میں تقلید کا جذبہ بے حد ہوتا ہے اور یہی ایک وہ جذبہ ہے جو شرائط زندگی کے سیکھنے میں مدد دیتا ہے۔

(۵) بچہ کا حافظہ دائم الحرکت واقع ہوا ہے جو ہمیشہ اپنے آپ سے کسی نہ کسی شغل میں لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد تمام چیزوں کو سیکھ جاتا اور اُن کو بہت دیر تک یاد رکھتا ہے۔ خاص کر اُن چیزوں کو جو آئے دن اُس کے استعمال میں آتی رہتی ہیں۔

(۶) بچہ جان دار اور حرکت کرنے والی چیزوں جیسے حیوانات وغیرہ کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ شوخ اور بھڑک دار رنگوں کو۔ خصوصاً جو سبز، زرد اور سرخ ہوتے ہیں، ۔ زیادہ پسند کرتا ہے؛ لیکن دھندلے خط، سیاہ رنگ اور نقش کار چیزوں میں سایہ و روشنی اور غیر مرئی چیزوں کا شروع شروع میں اُس کو بہت کم درک ہوتا ہے جن کی نقل اُتارنے سے وہ قاصر رہتا ہے۔

(۷) بچہ کے نفس پر ما فوق الفطرت، بے ڈول، سخت، کھردری، عجیب و غریب، نظر فریب چیزوں کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اس باب میں وحشی قوموں کی سی حالت رکھتا ہے کیونکہ وہ بھی اسی قبیل کی حسیات اور صفات رکھتی ہیں جیسا کہ اُن کی موسیقی اور نقاشی،

خوراک اور پوشاک، آرائش اور زیبائش سے، اُن کے دوقیات کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھدے ڈول، کھردری اور بھدی شکل کی چیزیں مٹی اور لکڑی سے بناتے ہیں اور اُن کو بے حد عزیز رکھتے ہیں۔

(۸) تخیل کا زور بچہ کے نفس میں بلا کا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اُس کے تمام خیالات اور کاموں میں مبالغہ اور افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ اس کا تخیلہ ڈراونی اور اچنبھے میں ڈالنے والی شکلوں کو وجود میں لاتا ہے، وہ معمولی سے معمولی واقعہ کو ایک طولانی قصہ بنا دیتا ہے اور اسی قسم کے قصوں اور افسانوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔

(۹) بچہ ظلم اور زیادتی کو دوست رکھتا ہے، وہ رحم دلی اور عفو سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے، اس کو دوسروں کی تکلیف و تاثر سے حظ ملتا ہے، اُس کے آگے ناممکن چیز وجود نہیں رکھتی، وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب پر غالب آئے۔

(۱۰) بچہ اپنی آرزوں، فکروں اور کاموں کے قائم و برقرار رکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ جلد تھکتا اور اُکتا جاتا ہے، اس کی اُمنگوں اور خواہشوں میں جلد سے جلد تبدیلی ہوتی رہتی ہے، وہ کسی ایک خیال یا کام کے جاری رکھنے سے۔ اگرچہ وہ کھیل ہی کیوں نہ ہو۔ تکان محسوس کرتا ہے۔

یہ حالتیں اور صفتیں وہ ہیں جو کم و بیش ہر ایک بچہ میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی تربیت عمدہ طریقہ سے جاری رکھنا، خاص کر بچوں کی اخلاقی درستی کے لئے، جاننا اور اُن کو درجہ کمال پر پہنچانا ایک دشوار کام ہے۔

انہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بچہ کی تربیت اس طور پر ہونی چاہیئے جس سے اُس کی ان استعدادوں میں خرابی اور انحطاط نہ پیدا ہو، بلکہ اس کے اخلاق اور احساسات کی تربیت کے لئے اِن سے ہی مدد لینی چاہیئے۔ ان استعدادوں کی رہبری و پرداخت کے لئے بہترین طریقے یہ ہیں کہ اسباب اور حوادث کے نتائج سے بچہ کو عملی تعلیم دینی چاہیئے یعنے بچہ کو اتنی آزادی دے رکھیں کہ اپنے کاموں کے نتائج کا وہ آپ مشاہدہ کرے، اُن کو اچھی طرح دیکھے بھالے اور اپنے اعمال کی جزا و سزا، بھی آپ ہی بھگتے مثلاً: کسی چیز

کے بڑے مسئلے کو، بغیر کسی کی رہنمائی اور شوق دلانے کے، تجربے اور ادراک کے ذریعہ وہ خود سمجھ لے، آپ ہی اشیاء کے خوب وزشت اور ان کی خوبصورتی وخوشنمائی کا پتہ لگالے یعنے بچپن ہی سے مشاہدے اور تجربے کی عادت ڈالے اور اُن کے نتائج پر غور کرنے کی خو پیدا کرے۔

اب آپ کہیں گے، کہ بچہ کو کس طرح آزاد اور کھلے بندوں چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ تمام چیزوں کا آپ ہی آپ مشاہدہ کرسکے جب کہ وہ ابھی ادراک اور فہم میں پختگی نہیں رکھتا نیک و بد اور خوب وزشت کا باہمی فرق نہیں بتا سکتا، اگر اس کو آزادانہ اپنی حالت پر چھوڑ دیں تو وہ اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دے گا، ممکن ہے وہ بیمار ہلاک بھی ہو جائیں مثلاً پانی میں گر پڑیں، آگ میں جل جائیں، لڑکیوں کے کٹھرے سے الٹ پڑیں، زہریلی چیزیں کھالیں، کاٹنے، کترنے کی چیزیں اور پھاڑ کھانے والے جانوروں کے ساتھ کھیل شروع کر دیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر ہر منٹ پر خود کو ہزاروں قسم کے خطرات میں ڈال دیں۔

یہ سب کچھ صحیح، مگر اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ باوجود اس کی کامل حفاظت وپرداخت کے، اُس کے قوئی اور استعدادوں کو بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا چاہیئے، تربیت کے مسئلہ کی نزاکت واہمیت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس کام کو کس طرح انجام دیں۔ بات تو یہی ہے اور اسی وجہ سے ہم یہاں اس کا اعادہ بھی کر رہے ہیں کہ فن تربیت تمام فنون میں افضل اور انسان کے مقدس ترین فرایض میں شمار کیا جاتا ہے جس کو ہم یہاں ایک مثال کے ذریعہ کہ اس فریضہ کو کس طرح انجام دینا چاہیئے، واضح کریں گے۔

عجائب خانوں میں جو یورپ کے عظیم ترین شہروں میں کثرت سے موجود ہیں جانوروں کے رہنے کے لئے بہت بڑے فطری قطعات زمین بنائے گئے ہیں جو ایک جانب تو ان حیوانات کے مقامات سے جن میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں بہت مشابہت رکھتے ہیں مثلاً اونٹ کے رہنے کے لئے ریتیلے میدان، شیر، تیندوے اور دیگر اقسام کے درندوں کے لئے وسیع جنگل اور اسی طرح پرندوں کے لئے کشادہ ہوادار مقامات بنے ہوئے ہیں جو ایک باغ کی مانند درختوں، پھولوں اور نہروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دوسری

جانب سے ان تمام جگہوں کے اردگرد، دیواروں میں لوہے کی اونچی اونچی سلاخیں لگی ہوئی ہیں تاکہ وہاں سے یہ جانور، پرندے اور مچھلیاں نہ نکلنے پائیں۔ آخر کس لئے اہل یورپ نے اس قسم کی محنتیں اٹھائی ہیں اور کس لئے یہ تمام اخراجات برداشت کئے ہیں؟ اس لئے کہ ان جانوروں کو جنہیں قید رکھا گیا ہے اُن کے اپنے فطری و مانوس وطن سے علٰحدہ کرکے یہاں لایا گیا ہے جہاں وہ بآسانی اس تازہ زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں اور اپنے نئے اور پرانے وطن کے درمیان کچھ بڑا فرق نہ پاکر، بہت جلد مدگی کے ساتھ تازہ زندگی کے خوگر ہو جاتے ہیں اور نئی آب و ہوا اُن کے موافق آجاتی ہے؛ یہاں تک کہ گرمی سردی اور کمی و زیادتی ہوا کی ایک خاص حد اور خوراک بھی انہی کی طبیعت اور مزاج کی مناسبت سے مقرر کی گئی ہے ورنہ یہ جانور اور پرند بہت جلد مرجاتے۔ اور جس ملک کی آب و ہوا اُن کے مزاج کے موافق نہ ہوتی وہاں زندہ نہ رہنے پاتے۔ اسی اعتبار سے، یہ ایک طرف تو قیدی ہیں جو پہلے کی بہ نسبت حرکت کرنے، اُڑنے اور شکار کرنے میں آزاد نہیں ہوتے لیکن دوسری طرف اُن وسیع مقامات اور بڑے بڑے پنجروں کے درمیان جو مقام اُن کے لئے مقرر ہوا ہے حرکت کرنے، چلنے، قلانچیں بھرنے اُڑنے اور بولنے میں پوری آزادی رکھتے ہیں اس طور پر کہ وہ اسیری اور غربت کا احساس نہیں کرنے پاتے! ہر ایک اپنی استعداد اور طبعی خواہشات کے ظاہر کرنے میں آزاد رہتا ہے ا

بچہ کا حال بھی بالکل اسی طرح ہے۔ وہ فطری استعدادیں اور خاصیتیں جو بچہ رکھتا ہے ایک طرف تو مقتضی ہیں کہ اُن کی روانی عمل (فعلیت و انفعالیت) میں فرق نہ آنے دیں اور دوسری طرف عمدہ طریقہ کے ساتھ اُن کی نگرانی اور خدمت گزاری کا اپنے اوپر لازم کر لینا بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ ہم اُن کے دائرۂ عمل کو محدود کرکے کس طور پر ان دونوں کاموں میں ربط پیدا کریں؟ بے شک! یہاں بھی وہی طریقہ جو ہم نے بیان کیا ہے اختیار کرنا چاہیئے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کرتے ہیں کہ دو دائرے ہیں:۔

(۱) بڑا (۲) دوسرا چھوٹا، اس طور پر کہ چھوٹا بڑے کے اندر واقع ہے۔ چھوٹا دائرہ بچہ کے مرکز احساس کا پتہ دیتا ہے اور بڑا دائرہ اُس کے محیط احساس کی حدوں کا، اور یہی حدیں

ماں کی توجہ ارادی کا محل ہیں۔ اسی اعتبار سے بچہ کو باوجود بڑے دائرے کے احاطہ میں گھرا رہنے کے چھوٹے دائرے کے اندر آزاد رہنا چاہیئے اور اسی دائرہ میں بلحاظ اس کی وسعت کے ہاتھ پاؤں مار کر اپنی شخصیت، مجبوری اور آزادی کو محسوس کرے یہاں تک کہ وہ اپنی فطری استعدادوں اور قوتوں کو ترقی دینے میں کامیاب ہو جائے۔

اسی خیال کے مدنظر، ماں اتنی ذکی و فہیم اور فن تربیت کے رموز و قواعد سے واقفت ہونی چاہیئے جو یہ جانتی ہو کہ کب اور کہاں بچہ کو کھلے بندوں چھوڑے اور کس موقع پر اس کو کسی کام کے جاری رکھنے سے روکے۔ بلاشبہ ماں کو ایک ماہر طبیب کی مانند ہونا چاہیئے جو اس بات کو سمجھے کہ کونسی چیز بیمار کے لئے مفید ہے اور کونسی مضر۔ اس کو ہر وقت بیمار کے جسم، مزاج، ہاضمہ اور طاقت کا اندازہ کرنا چاہیئے!

جن مقامات پر جان کا خطرہ یا کسی بڑے ضرر کا اندیشہ نہ ہو بچہ کو کھلے بندوں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگرچہ اس کے ذرا سی چوٹ اور تکلیف بھی پہنچتی ہو مثلاً: اگر بچہ اپنا ہاتھ آگ کی طرف بڑھاتا ہو، درآں حالے کہ ماں متوجہ ہے، نہ روکے بلکہ بڑھانے دے تاکہ بچہ آپ آگ کی سوزش کا درک حاصل کرے۔ اس وقت خود بچہ بغیر ماں کی اجازت یا ممانعت کے اپنا ہاتھ ہٹائے گا۔ لیکن اس تلخ تجربہ کے بعد پھر وہ اپنا ہاتھ۔ اگر وہ اکیلا بھی رہے۔ آگ کی طرف نہ بڑھائے گا۔ لیکن اگر بچہ کسی جنگلہ دار کھڑکی کے قریب جا کر اس سے اپنے آپ کو گرا دینا چاہے تو ایسی صورت میں ماں کو نہ چاہیئے کہ اس کو تجربہ کرنے کے لئے چھوڑ دے۔ لیکن جب وہ کھیل یا راہ چلنے کے وقت زمین پر گر کر رو دیتا ہے تو اس کو جھٹ پٹ اپنی گود میں اٹھا لینا اور پیار کرنا یا مٹھائی اس کے ہاتھ میں دینا مناسب نہیں بلکہ اس کو تھوڑی دیر تک روتا چھوڑ دینا چاہیئے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے خاموش ہو جائے ورنہ وہ اس کا عادی ہو جائے گا۔ جب کبھی وہ زمین پر گرے گا اس بات کا منتظر رہے گا کہ کوئی شخص اس کو اٹھا لے اور اس پر مہربانی کرے اور کچھ چیز اس کو دے۔ یہ طریقہ کسی قدر عجیب معلوم ہوگا لیکن یہی اس کا اصول ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ بچہ کو جن کاموں اور حرکتوں میں کوئی خطرہ نہ پیش آتا ہو تو اس کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ وہ امکان کی

حد تک سب، اپنے اعمال کے نتیجوں کو خود معلوم کرے اور خود اس کا تجربہ حاصل کرے

یہ موضوع اہم اور بہت مشکل ہے، سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے تمام جزئیات بیان میں نہیں آسکتے۔ (تاہم) اس کی مثالیں اور نمونے اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان سب کا شمار ناممکن ہے اُن میں سے ایک ایک کا بیان بھی کہ کس موقع پر بچہ کو کھلے بندوں چھوڑ دینا اور کس حالت میں اُس کو امر و نہی کے زیر فرمان رکھنا چاہیئے ان حالتوں کی جانچ، ماں کے فہم و ادراک اور اُس کے فن تربیت کی قواعد سے متعلق معلومات پر جن کا ذکر آئندہ فصلوں میں بھی آئے گا موقوف ہے۔ یہاں صرف یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ بچوں کو بعض صفتوں اور حالتوں کا توارث ہوتا ہے۔ یہ توارث یا تو نسلی ہوتا ہے یا تو آبائی۔

(۱) نسلی، اس طور پر کہ ہر قوم، چند ایسی ظاہری و مخصوص صفتیں رکھتی ہے جن کی وجہ سے وہ پہچانی جاتی ہے۔

(۲) آبائی، اس طرح کہ بچے بعض صفتیں اور طبیعتیں اپنے والدین اور اجداد سے وراثۃً پاتے ہیں جیسے بعض بیماریاں اور اخلاقی صفتیں — مثلاً بخل، بہادری، تحمل، جرأت ...... وغیرہ — ہوتی ہیں، لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ بچے اچھی بری دونوں قسم کی صفتوں کی استعداد سے متوارث ہوتے ہیں۔ اگر ہم اُس کو ابتدا ہی میں دریافت کرکے صحیح راستے پر نہ لگائیں گے تو بہت ممکن ہے کہ اُس کا نمو بے قاعدہ طریقہ پر ہو جن کا راہ راست پر لانا ایک مشکل کام ہوگا۔ یہاں اس نکتہ کا واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم استعداد کا لفظ جو اس موقع پر استعمال کر رہے ہیں اس سے ہمارا مفہوم یہ ہے کہ بچے اپنے ہمراہ بعض صفتیں اور طبیعتیں جوں کی توں نہیں لے آتے بلکہ ان میں ایک فطری قابلیت موجود ہوتی ہے جو ان کے حاصل کرنے پر قادر ہوتی ہے۔ شاید ہی یہ بات باور کرنے کے قابل ہو کہ جو بچے مریض والدین سے پیدا ہوتے ہیں وہ اُن سے مرض کو بھی وراثۃً پاتے ہیں۔

اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے، سب سے پہلے انہی استعدادوں اور ذہنی

و اخلاقی قابلیتوں کو ایک طبیب حاذق کی طرح دریافت کرنا اور بری صفتوں کی تشخیص کرکے معالجہ میں مصروف رہنا چاہیئے۔ یہ معالجہ نہایت سخت ہوتا ہے لیکن بے نتیجہ نہیں اور فن تربیت کی قدرت اور اعجاز اسی معالجہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر فنِ تربیت اخلاق وطبائع کی اصلاح اور ان میں تبدیلی کرنے اور نفس انسانی کے میلانوں اور ان کی استعدادوں کے راستوں کو بدلنے پر قادر نہ ہوتا تو روئے زمین شر و فساد سے بھر جاتی اور نوعِ انسانی بھی وحشی جانوروں کا نمونہ بن جاتی۔ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ فنِ تربیت نے انہی باتوں کی روک تھام کی ہے اور کر رہا ہے۔

بچہ اخلاق وطبیعت کے اعتبار سے ، غالباً عام صفتوں اور طبیعتوں مثلاً: ذکاوت، موقت، متانت، محاکمہ، حافظہ، تخیل اور استقامت...... وغیرہ کو اپنے والدین سے وراثۃً حاصل کرتا ہے اور پھر انہی استعدادوں کو اچھے برے کاموں میں لگاتا ہے یعنی یہی صفتیں اور قوتیں اس کی خوش نصیبی و ترقی کا باعث ہوتی ہیں اور یہی اُس کی بدنصیبی و سیاہ کاری کا سبب۔ ورنہ بچہ تولد کے وقت خاطی، گنہ گار اور بدبخت یا حکیم، فاضل، اور نیک بخت پیدا نہ ہوگا، بلکہ اس کی قابلیت واستعداد دونوں صفتوں پر حاوی ہوگی یعنی دو قوی راہیں اس کے سامنے ہوں گی جن میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا اُس کی ممکنات کی تعیین کرے گا۔ یہ کام بچے کے والدین اور اُس کے مربی کے اختیار میں ہے، کیونکہ بچے کی استعدادیں اور طبیعتیں انہی کے قبضہ واقتدار میں ہوتی ہیں۔ مربی (معلم) اور بچے کے باہمی تعلق کا حال اس شخص کی حالت سے ملتا جلتا ہے جس کے ہاتھ بہت بڑی دولت لگی ہو۔ دولت اپنی ذات سے کوئی بری اور نقصان رساں چیز نہیں ہے لیکن عاقل و نیک آدمی کے ہاتھ میں خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے اور بے عقل و غیر تربیت یافتہ آدمی کے ہاتھ میں شر و فساد کا موجب ہوتی ہے۔ اس کے مدنظر دولت سے خیر یا شر کا حاصل کرنا اس کے استعمال پر منحصر ہے نہ کہ دولت کے وجود پر۔

یہی حال ہے موروثی استعدادوں اور اخلاقی و ذہنی میلانوں کا جو موروثی ہوتے ہیں۔ ان سعادتوں اور شقاوتوں کے ہونے کے اسباب درِ اصل اُن کے طرزِ استعمال پر

موقوف ہیں۔ یہی بات لوگوں میں ہم روزانہ دیکھتے ہیں جیسا کہ بعض آدمی نیک لوگوں کی صحبت وہمنشینی اختیار کرنے سے نیک دل اور عمدہ اخلاق والے ہو جاتے ہیں اور بُرے آدمیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے کی وجہ، بُرے عادات وخصائل سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک شخص میں یہ بات بھی دیکھتے ہیں کہ وہ ایک زمانہ تک پاک دل وپاک باز آدمیوں کے ساتھ رہ کر عفت وعصمت اور حسن اخلاق کا پتلا بنا ہوا ہے اور چند سال گزرنے کے بعد پھر ہم اُس کو اس حالت میں پاتے ہیں کہ بدذات اور شیطان صفت آدمیوں کے ہم پیالہ وہم نوالہ رہنے کے باعث، اُس نے انہی کی سی عادت ووضع اختیار کی ہے۔

اسی لحاظ سے، جس صورت میں کہ عاقل وبالغ آدمی ایک حد تک صحبت وہمنشینی کے زیر اثر حالت وماہیت کو بدل دیتے ہیں، بچہ بھی، باوجود اُس فرمان پذیرانہ حالت کے، صرف عمدہ طریقہ کے ذریعہ مُربّی اور والدین کے ہاتھوں میں اپنی حالت کو بدل سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ والدین بچہ کے خالق ہوتے ہیں۔

سب سے اچھا طریقہ بچوں کی حالت کے درست کرنے کا یہ ہے کہ خواہ ماں ہو یا مربّی، پہلے بچے کی موروثی استعدادوں اور صفتوں کو دریافت کرے اور اُنکی دو قسمیں قرار دے: (۱) وہ صفتیں جن کو ترقی دی جاسکتی ہے اور (۲) وہ صفتیں جن کو ترک کیا جاسکتا ہے۔ پھر اُن امور کو اُصول اور عمل کے ذریعہ انجام دے۔ اس مسئلہ میں بچوں کی حالتوں اور اُن کی ذہنی کیفیتوں سے (جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے) فائدہ اُٹھائے۔ اُن کو بُری اور نقصان پہنچانے والی راہوں میں کام کرنے کے لئے نہ چھوڑے۔

باقی

مترجمہ ابو المحاسن محمد حسن خان متین مدرس فارسی

مدرسہ سلطانیہ مستعد پورہ

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

پہلا جلسہ ۳ تا ۵ ساعت شام

۹ اسفندار ۱۳۳۵ف کو (۳) بجے ٹاؤن ہال میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نواں اجلاس منعقد ہوا جلسہ کی کارروائی کم سن بچوں نے مناجات سے شروع کی۔ نواب فخر یار جنگ بہادر نے صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے تقریر کرنے کے بعد جلسہ کی صدارت کے لئے نواب صدر یار جنگ بہادر کا نام تجویز فرمایا اس کی تائید جناب مولوی محمد اصغر صاحب بیرسٹرایٹ لا نے فرمائی۔ زاں بعد نواب صدر یار جنگ بہادر نے کرسی صدارت کو زینت بخشی اور اپنا عالمانہ خطبہ پڑھا

اختصار خطبہ صدارت

آج سے دس برس پہلے جامعہ عثمانیہ سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ شاہ جمجاہ کے زیر سایہ پوری ہو رہی ہیں اور ملک علمی فیض سے مالامال ہو رہا ہے ۱۳۳۶ف کے اعداد سے واضح ہے کہ ممالک محروسہ میں ایک زنانہ، (۵) مردانہ کالج ہیں اور کل طلبہ (۶۹۴) ہیں جو مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بعد تکمیل تعلیم ہونہار طلبہ کو یونیورسٹی کی جانب سے یورپ بھیجا جاتا ہے کئی ایک طالب علم بعد حصول علم یورپ سے واپس آچکے ہیں اور چند ایک ابھی وہاں زیر تعلیم ہیں۔ نتائج امتحان میں یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ایک سے زائد بیرونی ممتحن علماء نے ہمارے طلبہ کا معیار فہم ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے معیار سے زیادہ تسلیم کیا ہے اور ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں نے جامعہ عثمانیہ کو تسلیم کر لیا ہے اور انگلستان میں آکسفورڈ، کیمبرج، لندن، کی یونیورسٹیاں یہاں کے طلبہ کو اسی رعایت سے اپنے ہاں داخل کرتی ہیں جس طرح دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کو۔ اور حکومت ہند نے انگلستان کے انڈین سیول سروس کے امتحان میں جامعہ کے طلبہ کا داخلہ منظور فرمالیا ہے۔ اس جامعہ نے ملکی زبان میں تعلیم دینے کا جو صحیح اصول

اختیار کیا ہے اس کے ضمن میں یہ امر قابل مسرت ہے کہ کلکتہ میں کانگریس کے نامور صدر پنڈت موتی لال نہرو نے اُردو کا نیشنل زبان ہونا تسلیم فرما لیا ہے اور دہلی میں ہز ہائی نس آغا خان نے اُردو کا دنیا کی ان وسیع ترین زبانوں میں شمار کیا ہے جو ذریعہ تعلیم ہیں، یونیورسٹی کے لئے کتابیں تیار کرنے کی غرض سے ایک دار الترجمہ بھی قائم ہے۔ اس نے اب تک مختلف علوم و فنوں کی ایک سو گیارہ کتابیں شائع کی ہیں اور ستر زیر نظر ثانی اور ۶۵ زیر ترجمہ ہیں۔ دار الترجمہ میں ایک ناظر مذہبی بھی مقرر ہیں جو اس امر پر خاص نگرانی رکھتے ہیں کہ ترجمہ شدہ کتاب میں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے کسی دوسرے فرقہ یا مذہب کی دل آزاری یا توہین ہو۔ سال گذشتہ جامعہ عثمانیہ کا موازنہ گیارہ لاکھ ستاون ہزار ایک سو پینتیس تھا (۱۱۵۷۱۳۵) صرف دس سال کے قلیل عرصہ میں جو ترقی ہماری جامعہ نے کی ہے وہ شاہانہ عزم و سرپرستی کی نمایاں مثال ہے ۱۳۲۶ف میں جملہ مدارس کی تعداد (۳۲۲۴) تھی اور کل طلبہ کی تعداد ایک لاکھ بیاسی ہزار نو سو ستائیس تھی ۱۳۳۶ف میں جملہ مدارس کی تعداد (۴۲۲۴) تھی جن میں سے (۱۷۷) امدادی ہیں سرکاری مدارس میں سے (۳۰۴۶) مردانہ اور (۴۰۰) زنانہ مدارس ہیں اور ایک انگریزی کالج کے علاوہ (۵) عثمانیہ کالج (۸) انگریزی ہائی سکول اور (۱۹) عثمانیہ فوقانیہ مدارس ہیں پرائمری مدارس کی تعداد تقریباً (۳۰۰۰) ہے ان میں تعلیم مفت دی جاتی ہے اور طلبہ کی تعداد (۲۱۹۶۳۸) ہے کل موازنہ چوراسی لاکھ اڑسٹھ ہزار (۸۴۶۸۰۰) ہے۔ اس طرح دس برس میں مدارس کی تعداد میں بقدر (۱۰۰۰) اور طلبہ کی تعداد میں بقدر (۳۶۲۴۲) کا اضافہ ہوا ہے۔ اور موازنہ تقریباً چھ گنا ہو چکا ہے جو کل موازنہ کا دس فیصدی ہے۔

دیوانی قواعد مدارس خانگی کے متعلق آپ نے یہ فرمایا کہ۔ سرکار عالی نے منجانب سررشتہ تعلیمات ایسے قواعد نافذ فرمائے ہیں جن کے ذریعہ سے خانگی مدارس میں تعلیم پانے والے بچے ایسی تعلیم و تربیت سے جو مضر صحت و اخلاق ہو یا دہنی نشو و نما میں خلل انداز ہو محفوظ رہیں گے یہ سرکار عالی کی رعایا نوازی ہے کہ قواعد

بالا کے ذریعہ سے محکمہ کے ماہرین کے فیض کو خانگی درسگاہوں تک بھی پہنچایا ہے ان قواعد میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے تعلیم میں رکاوٹ ہو۔
سررشتہ تعلیمات کی ترقیون کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اُس سررشتہ کی ترقی میں نواب مسعود جنگ بہادر سابق ناظم تعلیمات کی جانفشانی اور فن تعلیم کا زبردست ہاتھ نمایاں ہے یہ امر باعث مسرت ہے کہ نواب مسعود جنگ بہادر کے جانشین جناب خان فضل محمد خاں صاحب ہوئے ہیں آپ کی ذات سے مزید تعلیمی ترقیوں کی اُمید ہے۔
کانفرنس نے سالانہ اجلاسوں کے ذریعہ سے شوق تعلیم میں سرگرمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ہونہار نادار طلبہ کی مالی امداد میں ساٹھ ہزار سے زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا ہے جس سے صدہا طلبہ فیض یاب ہو چکے ہیں۔
ہر تحریک کے آغاز میں جوش کا مظاہرہ ہوتا ہے جس سے تحریک مذکور کی کامیابی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے رفتہ رفتہ یہ جوش و خروش ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ہماری انجمنیں اور ادارے نیم مردہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس کا اصلی سبب تشنگی تدقی کا فقدان ہے۔ حصول مقاصد کے لئے باہم مل کر کام کرنے کی خواہش جس کا دوسرا نام اتحاد عمل یا کوآپریشن ہے وہ مختلف الرائے افراد کو ملائے رکھتی ہے وہ مخالف رائے ظاہر تو کرتے ہیں ان پر اصرار بھی کرتے ہیں مگر روٹھتے نہیں ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں دیتے خود اس کام ہی کو برباد کر دینے کا تہیہ نہیں کر بیٹھتے خلاصہ یہ ہے کہ بلا ہمدردانہ اتحاد عمل کے بلند پایہ مقاصد کا حاصل ہونا دشوار ہے۔
آپ نے فرمایا کہ بغیر حکومت کی مدد اور بلا پیسے کے بھی ہم ملک کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کو ملک و ملت کے سب سے بڑے دشمن جہالت کا مقابلہ کرنا ہے اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے اوپر لازم کر لے کہ اپنی بساط کی حد تک وہ اس دشمن کو تباہ کر دے گا تو چند ہی مرحوم شناہاییان کے

بعد تعلیم یافتہ اشخاص کی جو فیصدی کمی ہمارے ملک کے لئے سرمایۂ عار ہے ہم دور ہو جائے گی۔ متمدن و مہذب ممالک میں بڑے بڑے وزراء اور کاروباری لوگ تعطیلوں کے ایام میں بالالتزام ملک کے دور افتادہ گوشوں میں چلے جاتے ہیں اور مدرس بن کر اپنے سرمایۂ علم سے وہاں کے باشندوں کو مستفید فرماتے ہیں کیا ہم یہ نہیں کر سکتے؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی حسنات ہے؟ یورپ اور امریکہ کے وزراء سے تو زیادہ ہم عدیم الفرصت نہیں؟

بہت سے گھر ہیں جن میں اخبار رسالے کتابیں موجود ہیں اگر ایک محلے کے لوگ باہمی ہمدردی سے مل کر اپنا اپنا یہ علمی سرمایہ نکال کر کسی ایک مکان میں جمع کریں اور فالتو بیکار فرنیچر اپنے اپنے یہاں سے وہاں لے آئیں ساتھ ہی پابندی کے ساتھ وقت واحد میں تھوڑی دیر کے لئے اخوت کی شان میں وہاں جمع ہو جائیں اخبار پڑھیں کتابیں دیکھیں جو پڑھے لکھے نہ ہوں ان کو سنائیں ہمدردانہ تبادلۂ خیالات کے ساتھ باہمی اصلاح کی کوشش کریں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ چند روز میں وہ محلہ کیا سے کیا ہو جائے"۔

صدر نشین صاحب کے خطبہ کے بعد جناب مولوی شبیر حسن خان صاحب جوش نے "فرشتے کی سیر" کے عنوان سے ایک دلکش نظم موثر انداز میں پڑھی جس سے حاضرین بہت مسرور ہوئے اس کے بعد پہلا جلسہ برخاست ہوا۔ دوسرا جلسہ ۹ تا ۱۲ ساعت صبح ۱۰ اسفندار کو ٹھیک ۹ بجے دوسرا جلسہ منعقد ہوا پہلے جناب مولوی خورشید علی صاحب آنریری سکرٹری نے سالانہ رپورٹ پڑھی اس کے بعد تحریک (۱) جو مولٰنا مرتضٰی مرحوم کی یادگار کے قیام سے متعلق تھی اس کو جناب مولوی حسین عبدالمنعم صاحب نے پیش فرمایا اس کی تائید جناب مولوی مرزا محمد بیگ صاحب افسر معاوضہ اراضی نے فرمائی ہر دو صاحبوں نے مرحوم کی بے لوث خدمات و اوصاف حمیدہ کا ذکر کر کے یادگار کا سرمایہ جلد فراہم کئے جانے کی ضرورت بتلائی اس کے بعد صدر نشین صاحب نے فرمایا کہ ہم یہ رقم جمع کر کے ان کی یادگار میں اُن کے ورثاء کو دینا نہیں چاہتے

اور نہ ان کے یادگار کے لیے کوئی مکان بنایا جائے گا بلکہ یہ رقم ملک کے نادار طلبہ کی امداد کے لئے وقف کی جائے گی اگر ایک ایک سو روپے ایک سو آدمی دیں تو دس ہزار روپے جس کی درخواست کی گئی ہے جمع ہو جائیں گے کیا حیدرآباد میں ایسے سو آدمی نہیں ہیں ؟ جو سو روپے سے اس یادگار میں حصہ لیں اگر نہیں ہیں تو پھر اس تحریک کے کامیاب ہونے اور موجودہ مجتمعہ رقم چھ سو سے سات سو ہونے کی توقع نہیں اس کے بعد جناب مولوی ابوالحسن صاحب مہتمم تعلیمات اور جناب مولوی محمد عبدالسلام صاحب نے تحریک کی تائید میں تقریریں کیں بالآخر تحریک باتفاق آراء منظور ہوئی اور اسی جلسہ میں مولانا مرتضیٰ مرحوم کی یادگار فنڈ کے لئے تقریباً (۹۰۰) کے وعدے ہوئے اور (۸۰) نقد وصول ہوئے۔

اس کے بعد جناب مولوی محمد حسام الدین صاحب فاضل نے علم و عمل پر فصیح و بلیغ نصیحت آمیز تقریر فرمائی آپ نے نظائر و شواہد سے یہ واضح فرمایا کہ فی زمانا لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور ان کو اپنے علم پر دعویٰ بھی ہوتا ہے مگر افسوس کہ عمل کچھ بھی نہیں کرتے اور وقتیکہ ہم عمل کو اپنا شعار نہ بنائیں ہماری دینی و دنیوی فلاح و فوز غیر ممکن ہے۔

تحریک (۲) جو تعلیم نسواں سے متعلق تھی نواب ناظر یار جنگ بہادر نے پیش کی آپ نے فرمایا کہ ذکور و اناث کے نصاب تعلیم میں فرق کا رکھا جانا ضروری ہے کیونکہ قدرت نے عورتوں کو بعض ایسے مخصوص افعال کے لئے پیدا کیا ہے جن کے لیے مرد پیدا نہیں کئے گئے ہیں اسی طرح مردوں کو بعض ایسے افعال کے لئے پیدا کیا گیا ہے جن کے لئے عورتیں پیدا نہیں کی گئی ہیں۔ یورپ میں ذکور و اناث کے نصاب تعلیم میں فرق نہیں رکھا جاتا ہے بلکہ دونوں کو ایک ہی تعلیم دی جاتی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ یورپ کی عورتیں امور خانہ داری سے متنفر نظر آتی ہیں اور وہاں کی عدالتوں میں طلاق کے مقدمات کثرت کے ساتھ پیش ہوتے ہیں اور عورتوں کو شوہر کا ملنا دشوار ہو گیا ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ نسوانی ضرورتوں اور ملکی خصوصیتوں کا لحاظ رکھ کر نصاب مقرر کیا جائے اس غرض سے ایک تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر کیا جانا ضروری ہے اس کی تائید مولوی اکبر علی خاں صاحب بی اے ایل ایل بی (لندن) نے فرمائی اور تحریک منظور ہو گئی۔

اس کے بعد مولوی محمد عبدالرزاق صاحب حیدہ بی اے نے "انگریزی زبان کے حیدرآبادی شاعر" کے عنوان پر انگریزی میں تقریر فرمائی جس میں نواب عماد الملک بہادر، نواب نظامت جنگ بہادر، مسز سروجنی نائڈو، مسٹر جیوپادیہہ وغیرہ کے کلام پر نقد و تبصرہ کیا گیا تھا۔

تحریک (۳) جو حرفتی اور فنی تعلیم کو ممالک محروسہ میں وسعت و سرعت کے ساتھ رائج کرنے سے متعلق تھی جناب بابو للت موہن کرجی صاحب نے پیش کی اور آپ نے فرمایا کہ سرکار عالی خود حرفتی اور فنی تعلیم کو ملک میں رائج کر رہی ہے چنانچہ انجینیرنگ کالج کا اسکیم منظور ہو گیا ہے مگر ہماری درخواست سرکار سے یہ ہے کہ اور وسعت و سرعت کے ساتھ اسی تعلیم کو ملک میں عام کیا جائے اس کی تائید جناب مولوی بہادر خانصاحب نے کی اور آپنے جاپان کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ بغیر صنعتی اور حرفتی تعلیم کے ملک کی ترقی ناممکن ہے اس کے بعد مولوی عبداللہ صاحب المدوسی نے یہ ترمیم پیش کی کہ صنعتی اور حرفتی تعلیم کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ ملک میں کارخانے بھی کھولے جانے کی سخت ضرورت ہے ورنہ بے کاروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو جائے گا مگر اصل تحریک بلا ترمیم منظور ہو گئی۔

تیسرا جلسہ ۲ تا ۵ ساعت شام

تحریک (۴) جس میں درسی کتب اور سامان تعلیم کی ارزانی کے لئے منجانب سررشتہ خاص تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا جناب مولوی سید ہاشمی صاحب اصل محرک کی عدم موجودگی کی وجہ سے جناب مولوی خورشید علی صاحب آنریری سکرٹری نے پیش فرمائی اس کی تائید مولوی فضل اللہ صاحب بی اے نے کی عمر فاروق صاحب متعلم نے کہا کہ اگر تحریک کے اصل محرک مولوی سید ہاشمی صاحب ہوتے تو میں صاحب موصوف سے کہتا کہ سب سے زیادہ گراں آپ ہی کی کتابیں ہیں براہ کرم ان کی قیمتوں میں آج ہی سے تخفیف فرمائیے۔ عمر فاروق صاحب نے یہ بھی کہا کہ جامعہ عثمانیہ کی کتابیں بھی گراں ہے اس پر جناب مولوی عبدالرحمن خانصاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے فرمایا کہ تمام یونیورسٹیوں کی کتابیں گراں ہوتی ہیں ہماری یونیورسٹی کی شائع کردہ کتابوں کی قیمتیں دوسری یونیورسٹیوں کی

کتابوں کے مقابلہ میں ارزاں ہیں، بعض انگریزی کتابوں کی قیمت تو پچاس پچاس شلنگ ہوتی ہے میں اس تحریک کی تائید کرتا ہوں ساتھ ہی یہ کہتا ہوں کہ بُری چیز کو بُرا کہو مگر خواہ مخواہ اچھی چیز کو بُرا نہ کہو اس کے بعد نواب فخر یار جنگ بہادر نے فرمایا کہ یونیورسٹی نے کتابوں کی وہی قیمت رکھی ہے جو اصل لاگت ہے یونیورسٹی کا مقصد کتب فروشی سے روپیہ کمانا نہیں ہے بلکہ طلبہ کو سہولت پہنچانا ہے بالآخر یہ تحریک بھی باتفاق آرا منظور ہو گئی۔
اس کے بعد جناب مولوی یعقوب حسن صاحب لیڈر مدراس نے "ہندوستانی کلچر" پر فاضلانہ مدلل تقریر فرمائی پہلے آپ نے کلچر کی لغوی و اصطلاحی تعریف بیان کی اس کے بعد فرمایا کہ کلچر کی تشکیل میں قوم کی تاریخ اور اس کی روایات، تہذیب، احساسات، مرز بوم کو بڑا دخل ہے۔ کلچر اور مذہب کا براہ راست تعلق نہیں ہے البتہ مذہب کا اثر تمدن پر پڑتا ہے اور تمدن کا اثر کلچر پر ہوتا ہے اس لئے کسی کلچر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مذہبی کلچر ہے مثلاً لکھنؤ کے شاعر امیر اور فسانہ آزاد کے مصنف میں کوئی تمدنی و کلچری فرق نہیں ہے خود حیدر آباد میں دیکھئے، سر آسمان جاہ بہادر، سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے کیا اچھا کلچر اختیار کیا ہے یہ کلچر نہ مسلمانوں کا ہے اور نہ ہندوؤں کا بلکہ دونوں قوموں کی مشترکہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے جس کو ہندوستانی کلچر کہا جا سکتا ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان کے تمدن کا اثر ہندوؤں کے تمدن پر ہوا اور اس طرح ایک نئی قومیت کی بنیاد پڑی چنانچہ ہندو اور مسلمان آداب و اخلاق و نشست و برخاست میں یہاں تک کہ لباس میں بھی ایسے مشابہ تھے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا نتیجہ یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اس زبان کو اردو کہیئے یا ہندوستانی مگر ہندوستانی کہنا اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ اس کا اطلاق لفظ فرنچ کی طرح زبان پر بھی ہو سکتا ہے اور قوم پر بھی۔

چونکہ کلچر کے پھیلانے میں زبان کو بڑا دخل ہوتا ہے اس لئے ہم کو بھی ہندوستانی کلچر پھیلانے کے لئے ایک ترقی یافتہ زبان کی ضرورت ہے یہ صلاحیت آج خدا کے فضل سے اردو زبان میں ہے۔

قومی یونیورسٹیاں بنائی گئیں تو ہم نے کیا کیا وہی غلامی اور وہی تقلیدکی علی گڑھ یونیورسٹی یا بنارس یونیورسٹی میں وہی انگریزی زبان ہے، وہی انگریزی دستور ہے اور دستوری اثر سے (BLA 8K MEN) سیاہ انگریز پیدا کئے جارہے ہیں۔

سب سے پہلے کلچر، زبان، قومیت و ملت کے لحاظ سے اگر کوئی یونیورسٹی بنی ہے تو وہ عثمانیہ یورسٹی ہے جس طرح ہندوستان کا پایۂ تخت دہلی ہے اسی طرح ہندوستانی کلچر کا پایہ تخت حیدرآباد ہے،

جس قومیت و ملت اور جس کلچر کے لئے سارا ہندوستان کوشش کررہا ہے اوس کی نشوونما کا بہترین سامان ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کی توجہ سے حیدرآباد میں ہورہا ہے

بعد از ان جناب مولوی سید محمود عالم صاحب بی۔ اے۔ بی۔ یس۔ سی نے مغربی تمدن و ہند پر دل چسپ تقریر کی تعلیم نسوان کے ضمن میں آپ نے کہا کہ یورپ میں ہر ماں تعلیم یافتہ ہے اس لئے اولاد کی تربیت اچھی ہوتی ہے افسوس ہے کہ ہندوستان اس خصوص میں بہت پیچھے ہے، تعلیم نسوان کو ملک میں وسعت و سرعت کے ساتھ رائج کرنے کی سخت ضرورت ہے مگر ہماری عورتوں کی تعلیم بالکل مغربی اصول پر نہ ہونی چاہیئے بلکہ ایسی تعلیم ہونی چاہیئے کہ جس سے خاندانی روایات اور ملکی خصوصیات بھی باقی رہ سکیں۔ پردہ کے متعلق آپ نے کہا کہ ہندوستان کا پردہ بہت سخت ہے اس میں اصلاح کی ضرورت ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ عورتیں بالکل بے پردہ ہوجائیں اگر ایسا ہوگا تو ہندوستان کی معاشرت کے نظر کرتے بہت سی سماجی برائیاں پیدا ہوجائینگی بلکہ بتدریج پردہ کی ناجائز جکڑبندیوں میں اصلاح کرکے ایک اعتدالی حالت پیدا کی جانی چاہیئے۔ آپنے معلم و متعلم کے تعلقات کے متعلق فرمایا کہ یورپ میں استاد و شاگرد کے مابین دوستانہ تعلقات ہوتے ہیں استاد شاگرد کو مساوات کی نظر سے دیکھتے ہیں اور شاگرد استاد کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر ہندوستان میں استاد شاگرد کے مابین ایسے تعلقات بہت کم ہوتے ہیں وغیرہ۔

تحریک (۵) جو اضلاع میں کانفرنس کی شاخیں قائم کرنے سے متعلق تھی جناب:

مولوی حافظ محمد مظہر صاحب نے پیش فرمائی اس کی تائید مولوی سید محمود احمد صاحب نے کی اس کے بعد جناب مولوی عبد الکریم صاحب وکیل نے یہ ترمیم پیش کی کہ کانفرنس کے مقاصد کی اضلاع میں اشاعت کرنے کے لئے چار پانچ اراکین کی ایک کمیٹی بنائی جائے اس کے بعد محمد سلطان نے کہا کہ کانفرنس کے اجلاس کا سال میں ایک مرتبہ شہر میں منعقد ہونا ملک کی جہالت دور کرنے کے لئے کافی نہیں ضرورت ہے کہ اضلاع میں کانفرنس کی جو شاخیں قائم کی جائیں ان کے ارکان مختلف طبقوں کے لوگوں سے اشتراک عمل کرکے کانفرنس کے مقاصد و اغراض کی ملک کے طول و عرض میں اشاعت کریں اور ہر حصہ ملک میں علم کی روشنی پھیلائیں اور پروپگنڈہ کرنے کے لئے چند آدمیوں کا مقرر کیا جانا بھی مناسب ہے، بالآخر تحریک ترمیم کے ساتھ منظور کر لیگئی۔

تحریک (۶) جس میں کانفرنس کی سابقہ تحریکات پر سررشتہ متعلقہ کی توجہ ان کی عملی کارروائی کے لئے مبذول کرائی گئی تھی جناب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی نے پیش فرمائی اس کی تائید مولوی محمد عبد السلام صاحب نے فرمائی اور یہ تحریک بھی منظور ہوگئی۔ اس کے بعد جناب پروفیسر سید عبد اللطیف صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نے یونیورسٹی کی حقیقی تعلیم کے عنوان پر ایک گھنٹہ تک عالمانہ تقریر فرمائی۔

تحریک (۷) جو دیہی مدارس کے بچوں کے طبی معائنہ سے متعلق تھی جناب مولوی غلام احمد خاں صاحب اول تعلقدار نے پیش کی اس کی تائید جناب مولوی حکیم مقصود علی خان صاحب نے فرمائی اس کے بعد جناب مولوی قادر محی الدین صاحب نے ترمیم پیش کی کہ معائنہ طبی کو شہری مدارس کی حد تک بھی وسعت دیجائے مگر تحریک بلا ترمیم منظور ہوگئی۔

صدر نشین صاحب کی اختتامی تقریر کے بعد مولوی اکبر علی صاحب مہتمم صحیفہ روزانہ نے کانفرنس کی جانب سے صدر نشین صاحب المقررین اور ادراور حاضرین وغیرہ کا شکریہ ادا فرمایا اور اس نوبت پر کانفرنس کا نواں اجلاس خیر و خوبی سے ختم ہوگیا۔

محمد سلطان

معلم اُردو مدرسہ فوقانیہ ناپلی

سزائے جسمانی*

از

جناب مارماڈیوک پکتھال صاحب

پرنسپل چادر گھاٹ ہائی اسکول

میں سزائے جسمانی کے اصول کا مخالف نہیں بلکہ اس کے بے دردانہ استعمال کا۔ جس طرح تعزیرات ہند میں سزائے موت ہے اسی طرح سزائے جسمانی کو محفوظ میں رہنا چاہئے لیکن اس کا استعمال شاذ ہو۔ غصہ میں یا انتقام کے طور پر سزا دینا کسی طرح جائز نہیں۔ ایسی حالتوں میں جبکہ یہ خوف ہو کہ بچہ چڑچڑا یا بوکھلا جائے گا سزائے جسمانی دینا قطعی نامناسب ہے اکثر اساتذہ اسے لازمۂ تعلیم سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر تشدد کا حق نہ ہو تو نہ تو وہ پڑھا سکتے ہیں اور نہ مدرسہ میں ضبط قائم رہ سکتا ہے۔ اپنے مدرسہ میں، میں سررشتہ کے اس زرین دفعہ پر عمل کرتا ہوں کہ صرف صدر مدرس سزائے جسمانی دے لیکن اس طرز عمل کی وجہ سے مجھے ایک خطرناک انقلاب پسند خیال کیا جاتا ہے جسنے نظم ونسق کی جڑیں کاٹ کر غریب اور فرشتہ صفت مدرسین کو ظالم اور شریر النفس لڑکوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ جب میں نے احکام سررشتہ کی تعمیل کے لئے نوٹس جاری کیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ کونسی سزائیں دینے کا استاد کو حق حاصل ہے تو مجھ سے کہا گیا کہ اگر طلبہ کو اس کا علم ہو گیا تو مدرسہ کا ضبط بگڑ جائے گا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کیونکہ سرکار عالی مدارس میں ایسا ضبط قائم کرنا نہیں چاہتی جس کی بنا سراسر سختی اور اندھا دھند تشدد پر ہو۔ میرے مدرسہ کا ضبط یعنی ضبط کے جو معنی میں لیتا ہوں اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اگر طلبا پہلے سے کم پژمردہ نظر آتے ہیں تو یہ ان کے لئے تعلیمی حیثیت سے نفع بخش ہے

---

* یہ اس تقریر کا ترجمہ ہے جو دوسری حیدرآباد ٹیچرز کانفرنس کے موقع پر انگریزی میں گوش گذار حاضرین کی گئی تھی

جو اساتذہ بیشتر تشدد سے کام لیتے تھے اگر اب وہ بلا تشدد جماعت کو سنبھال سکتے ہیں تو ان کی حالت بھی روبہ اصلاح ہے اپنے قلیل و محدود تجربے میں جو حیدرآباد میں حاصل ہوا میں کبھی بھی کسی ایسے لڑکے سے دوچار نہیں ہوا جس کو زدوکوب کی ضرورت ہو۔ کبھی کبھی کسی شریر بچے کو دو ایک بید لگانا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی شرارت سے باز آئے لیکن صدر مدرس کے پاس بھیجا جانا ہی بڑی سزا ہے اور ملامت کے دو میٹھے بول خاطی کو راہ راست پر لے آتے ہیں۔ اکثر ذرا سختی سے گفتگو کرنے کے بعد میں لڑکے سے عہد واثق لے لیتا ہوں کہ آیندہ کوئی نازیبا حرکت سرزد نہ ہو لیکن ایسے اساتذہ موجود ہیں جو یہ سوچیں گے اور کہیں گے کہ پرنسپل نے ان کی توہین کردی کیونکہ جس لڑکے کو انھوں نے سزا کے لئے بھیجا تھا اس کو سزا نہیں دی گئی۔

میں پرانے طریقہ سے تھوڑا بہت واقف ہوں کیونکہ میں ایسے مدرسہ کو بھیجا گیا تھا جہاں جسمانی سزا کا رواج تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن یہ مدرسہ ذرا بڑے گھرانوں کے موٹے تازے، بے فکرے اور بدتمیز لڑکوں کے لئے تھا اور اگر ان کو پیٹ پاٹ کر درست نہ کیا جاتا تو وہ اپنے اُستادوں کو اپنا غلام سمجھنے میں تکلف نہ کرتے۔ اب انگلستان میں سزائے جسمانی تمام مدرسوں میں ممنوع ہوگئی ہے البتہ ان بالاخرچ مدرسوں میں جن کو غلطی سے پبلک اسکول کہتے ہیں اور جہاں زیادہ تر دولت مند لوگوں کے لڑکے آتے ہیں اب بھی مار پیٹ ہوتی ہے یعنی سزائے جسمانی صرف امرا تک محدود ہے میں اپنے طالب علمی کے تجربہ سے کہتا ہوں کہ ہم لوگ اسے دل لگی سمجھتے تھے اس سزا کی ہم کو پرواہ نہ تھی کیونکہ تکلیف تھوڑی دیر کی تھی لگر جو اُستاد بید کھلانے کے واسطے لڑکوں کو بار بار صدر مدرس کے پاس بھیجتا تھا اس کو ہم اُن اُستادوں کے مقابلہ میں بے وقوف سمجھتے تھے جو ہمیں برخاست مدرسہ کے بعد روکتے یا کام کرنے کو دیتے۔ اور جو اساتذہ لڑکوں سے واقفیت پیدا کرتے یعنی جو ان کی خصوصیات کا مطالعہ کرتے اور ان کے دلوں میں جگہ کرتے تھے۔ اور ایسے اساتذہ متعدد تھے۔ صرف انہیں کی ہم عزت کرتے تھے اور انہیں سے ہمیں فیض پہونچتا تھا۔ حیدرآباد کے غریب، بھوکے اور نہایت فرمانبردار لڑکوں کو جو

سرکاری مدارس میں بھرے پڑے ہیں، سزا دینا انتہائی بربریت ہے۔

اگر ہم بچوں کا سامنا نکتہ چینی، عیب جوئی یا سزادہی کے خیال سے کریں تو ہماری تعلیم کی چاشنی شروع ہی سے جاتی رہے گی کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جماعت سے نا اُمید ہوگئے ہیں اور ہماری نا اُمیدی یقینی طور پر بچوں کو متاثر کرتی ہے۔ اُستاد کو ہمیشہ پر اُمید رہنا چاہیئے کیونکہ طلبا رسے اساتذہ کو جو اُمیدیں ہوتی ہیں وہ بچے کی ترقی اور اُستاد کے اثر کے لئے ضروری ہیں۔ آپ حضرات نے سنور سولینی مختار اطالیہ اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا ترکی کے رہبر و پیشوا کے متعلق سُنا ہوگا۔ یہ جلیل القدر لوگ ممکن ہے کہ جفا پیشہ و ستم کیش ہوں۔ ممکن ہے کہ ان کے طرز عمل کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکے لیکن ان دونوں نے وہ کام کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا نام ابد الآباد تک اکابر معلمین میں شمار ہوگا۔ انہوں نے خستہ حال قوموں کو جن کا شعار یاد ماضی ہوگیا تھا مستقبل کی طرف متوجہ کر دیا۔ انھوں نا اُمیدوں کو اُمید دلائی۔ وہ ایک نئے مذہب کی تلقین کر رہے ہیں کہ دنیا ابھی نوخیز ہے نہ کہ بیرزال جیسا کہ ان کے ظہور سے پہلے اٹلی اور ترکی کے تمام لوگ خیال کرتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں کی ستائش کرتے ہیں جو ہمیشہ نشانۂ ملامت رہا کرتے تھے وہ قسم کھا کھا کر ان سے کہتے ہیں کہ جو کام قدیم رومیوں اور ترک بزرگواروں نے کیا ہے تم میں اس کے برابر بلکہ اس سے زیادہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ یہ دونوں قومیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔

ہندوستان بہت قدیم ہے۔ ہمارا حیدرآباد قدیم ہندوستان کی یادگار ہے ہندوستان اور حیدرآباد دونوں پر دنیا بھر کی دقیانوسی خامیوں اور کوتاہوں کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اگر تم ہندوستان اور حیدرآباد کے لوگ بھی نوجوانوں کو مخاطب کرتے وقت نا اُمیدی کا لب و لہجہ اختیار کرو تو ہماری حالت فی الحقیقت ناگفتہ بہ ہو جائے گی۔ ہندوستان اور حیدرآباد دونوں کا ماضی شاندار ہے۔ آپ لوگ اپنی تعلیم میں بڑے فخر و مباہات سے ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم لوگ کس قدر روبہ انحطاط ہوگئے ہیں۔ ہر قوم کے نوجوانوں کا جو مطمح نظر ہونا چاہیئے یہ سب اس کے منافی ہے ہم تشریت

کے واسطے دنیا نئی بنتی ہے۔ اسلاف موجودہ زمانہ والوں سے زیادہ باعظمت نہ تھے انہوں نے صرف اپنے موقعے ڈھونڈھے اوران کو کام میں لائے۔ ہر غلط چیز کی اصلاح ہوسکتی ہے جو لوگ اپنا وقت بے کار گنوا رہے ہیں وہ بیدار ہوسکتے ہیں اور اچھے کام کرسکتے ہیں اور صرف نئی پود ہی حیدرآباد کو اپنے تاجدار، ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کے لئے مایۂ افتخار بناسکتی ہے۔ بچوں کے ساتھ یہ طرز کلام انسب ہے۔

اسی طرح مدرسہ کے معمولی کام اور مدرسہ کی زندگی میں ہیں دو کلمۂ تحسین کہنا اور جہاں ممکن ہو چشم نمائی سے باز رہنا پسند کرتا ہوں۔ کیا آپ لوگوں نے وہ بات معلوم کی ہے جو میں نے ہندوستان میں آتے ہی معلوم کی کہ اس ملک کے لوگ نہایت حساس ہیں بلکہ دوسرے ملک کے لوگوں سے زیادہ۔ کوئی شہسوار ہمیشہ لگام دبا کر کسی حساس گھوڑے پر سوار نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے سے گھوڑا خراب ہوجائے گا اور یا تو منہ زور یا شریر ہوجائے گا۔ بچوں کو ہمیشہ ملامت کرنا یا ہمیشہ زجر و توبیخ کرنا گھوڑے کی لگام دبانے سے بھی زیادہ برا ہے۔ حساس لوگ اپنی صلاحیتوں کو صرف خوش گوار فضا میں ظاہر کرسکتے ہیں۔ سخت برتاؤ اور مخالفانہ نکتہ چینی سے الجھ کر وہ فسق و فجور، شراب و کباب اور دوسری بری لتوں سے اپنی اشک شوئی کرتے ہیں۔ اس لئے وہ بداطوار معلوم ہوتے ہیں ہم کو چاہیئے کہ آزمائشی طور پر اپنے مدرسہ کے نوجوانوں اور بچوں کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کریں اور ہر ایسے لفظ اور فعل سے اجتناب کریں جو ان کی زندگی کے آغاز سفر میں ان کو پست ہمت کردے قبل اس کے کہ وہ باد مخالف کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں اگر ہندوستان کے ہر مدرسہ میں یہ تجربہ ایک پشت تک کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے متعلق اس کی موجودہ تشخیص بالکل غلط ہے اور یہ کہ ہندوستان نہ اتنا بگڑا ہوا اور نہ اتنا گیا گذرا ہے جتنا کہ فرض کیا گیا ہے البتہ ہندوستان درد دکھ کا مارا ہوا ہے

مترجمہ عبدالشکور صاحب بی۔اے
مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل

مدرسۂ وسطانیہ عثمانیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن

(میں)

نئی تحریکات و تجربے

جب میں تحریکات کو "نئی" کی صفت سے موصوف کرتا ہوں تو میرا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ ان کی ایجاد کا سہرا میرے سر ہے بلکہ میری مراد یہ ہے کہ یہ تحریکیں یا تو اس مدرسہ میں پہلے پہل شروع کی گئی ہیں یا یہ کہ ان کو پہلے بھی رواج دینے کی کوشش کی گئی تھی مگر چند ہی روز میں یہ تحریکیں اپنا زور کھو بیٹھیں اور رفتہ رفتہ فراموش کردی گئیں۔ بعض صورتوں میں میرا اور میرے شرکارِ کار کا صرف اتنا حصہ ہے کہ ہم نے بیجان تحریکوں کو زندہ کیا اور ان کو سہارا دے کر بتدریج اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ البتہ بعض امور ایسے ہیں جن کی طرف اب تک کسی نے توجہ نہ کی تھی، جن کے متعلق خیال کیا جاتا تھا اور ہے کہ یہ باتیں ہوائی اور زینتِ اوراق ہیں یا اگر بفرضِ محال ممکن العمل بھی ہیں تو وہ مغرب کی آب و ہوا ہی میں بارآور ہوسکتی ہیں۔ اور ہندوستانی فضا ان کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ مانا کہ بعض بزرگوں کا قول صحیح ہے کہ ہر قوم کے آداب و طرزِ معاشرت، تہذیب و تمدن، آئین و رسوم، ذہنیت و صلاحیت الگ الگ ہیں اور ایک قوم کے اصول کو دوسرے قوم کی زندگی پر چسپاں کرنا بے سود ہوتا ہے مگر پھر بھی کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان اصول کو ملک کی آب و ہوا اور مقامی حالات کے لحاظ سے کچھ ردو بدل کے ساتھ اختیار کیا جائے تو ناکامی کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ و امریکہ کے طریقہ ہائے تعلیم، اصولِ ضبط اور دوسری تحریکیں اس سرزمین میں پنپ نہیں سکتیں۔ اکثر صورتوں میں یہ صحیح ثابت ہوتا ہے لیکن بات یہ نہیں ہے کہ مغربی تحاملہ ہندوستان میں کامیاب نہیں ہوسکتے بلکہ ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم مغرب کے طریقوں پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہتے ہیں اور اس شرط کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ان کی کامیابی کا دار و مدار بہت کچھ مقامی حالات پر ہے۔ اگر ہم مقامی خصوصیات کا لحاظ رکھیں اور فقط اصول کو لیکر

اس خاکہ کی رنگ آمیزی کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ یہ ہندوستان ہے یورپ وامریکہ نہیں تو یقیناً ہم کامیاب ہوں گے۔

مجھے ہمیشہ ان اصحاب سے اختلاف رہا ہے جو نہ تو ترقی کی خود کوئی تدبیر سوچتے ہیں اور نہ ان تدبیروں سے کام لیتے ہیں اور نہ لینے دیتے ہیں جو غیر ملک والوں نے دماغ سوزی اور جگر کاوی سے سوچی ہیں اور یہ کہہ کر سسٹم کام چلاتے ہیں کہ بھئی یہ ہندوستان ہے اور یورپ کے طریقے اور اصول یہاں محال ہیں۔ گو ہندوستان نہایت خستہ اور دوسرے ملکوں سے ہر میدان میں بہت پیچھے ہے مگر ہندوستانی ذہنیت اور ہندوستانی دماغ میں کوئی نقص نہیں ہے اور بظاہر جو نقص معلوم ہوتا ہے وہ فطری نہیں بلکہ اکتسابی اور متعدی ہے ہم ایک خاص عمر کو پہونچنے پر اس جذبہ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں جو ہمیں ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے نہیں دیتا ہمارا یہ ایمان ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی کسی کام کو عمدگی سے نہیں کر سکتے ان میں قیادت ایجاد و اختراع، تدبیر و تدبر حتی کہ تقلید کا بھی مادہ نہیں ہے۔ اس جذبۂ کمتری کا نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے ہم لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں اور ترقی و کمال کی راہیں ہم پر بند ہو جاتی ہیں۔

پست ہمتی کا یہ عالم ہے کہ جب میں نے کسی نئی تحریک کا نام لیا تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے جب میں نے کسی نئے تجربہ کا ذکر لیا تو لوگ تھرا گئے جب میں نے خیال ظاہر کیا کہ تمام طلباء کے لئے ایک رنگ کا لباس مناسب ہوگا تو میرے بعض دوستوں نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ میں خیالستان میں رہتا ہوں۔ جب میں نے تذکرہ کیا کہ میں نے اپنے مدرسہ میں بعض جماعتوں کو منشور آزادی عطا کیا ہے تو میرے مہربانوں کے چہروں پر معنی خیز تبسم کی چمک دوڑ گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں اشارہ ہو گیا کہ میں سرخ روس کا وظیفہ خوار ہوں مذاکرہ کے لئے ہندوستانی بچوں کو نااہل قرار دیا گیا اور بزم تمثیلی کے نام پر صلواتیں بھی گئیں غرضکہ مادر ہند کے سپوتوں کی نظر میں کوئی طریقہ، کوئی کام اور کوئی شئے نہ تو ہندوستان کے لئے موزوں ہے اور نہ ہندوستانی اس کے اہل ہیں۔ جب عام طور سے یہ رجحان خیال ہے تو مدارس میں شاذ ہی کسی تجربے یا تحریک کا آغاز کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

اگر انہیں کسی شامت کے مارے نے کوئی تجربہ شروع کیا تو ناکامی ہاتھ باندھے سامنے کھڑی رہتی ہے اور اگر کسی تحریک کی سلسلہ جنبانی کی تو کچھ ہی عرصہ کے بعد زور ٹوٹ جاتا ہے۔ تحریکیں تہ میں بیٹھ جاتی ہیں اور ان کی جگہ کچھ لہریں جنبش کرتی ہیں اور پھر پانی کی سطح برابر ہو جاتی ہے۔

بہر حال ممکن ہے کہ میرا خیال ٹھیک ہو ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن ایک بات تو سبھی تسلیم کریں گے۔ وہ یہ ہے کہ جب ہم کو معلوم ہے کہ مغرب والوں نے ایک خاص کام کو کامیابی کے ساتھ کیا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں کہ ہم کوشش کرکے دیکھیں تو سہی آیا یہاں بھی کامیابی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ذاتی طور پر میں کوشش کرنے میں ہچکچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اپنے مدرسہ میں میں نے چند تجربے کیے اور تحریکوں کی داغ بیل ڈالی۔ اور باوجود ابتدائی ناکامیوں کے، باوجود مخالفتوں کے اور باوجود حوصلہ شکنیوں کے میں اپنے ارادہ میں جما رہا۔ مجھے ایک بات سے تسلی ہوتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ عادت پڑتے پڑتے پڑے گی اور جس طرح رفتہ رفتہ پتھر پر گڑھا پڑ جاتا ہے اسی طرح یہ تحریکیں جن کو ابھی لوگ ترچھی نظر سے دیکھتے ہیں آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں جگہ کر لیں گی۔

ذیل میں میں اپنے انہیں تجربوں کو کچھ تو اس خیال سے پیش کرتا ہوں کہ حیدرآباد بھر کی ایک نمایت پوری ہوتی ہے لیکن ان تحریکوں اور ان کو کامیاب بنانے میں جو جو دقتیں مجھے پیش آئیں اور جو طریقے بھلے یا برے میں نے اختیار کیے ان کے ذکر سے میرا خاص مقصد یہ ہے کہ دوسرے بھائیوں کے نزدیک ان میں اگر کوئی کام کی بات ہو تو اس سے فائدہ اٹھائیں خود بھی تجربہ کرکے دیکھیں اور جہاں میں نے ٹھوکر کھائی ہے وہاں قدم سنبھال کر رکھیں اور کامیاب ہوں۔

یونیفارم جب سے صدر مدرسی کا کام میرے سپرد ہوا تب سے غیر حاضری کے بعد، جس چیز کو دیکھ دیکھ کر میرا دل کڑھتا رہا وہ بچوں کی کثافت ہے مجھے کیا بلکہ جن حضرات کو بھی مدرسہ کی تمام جماعتوں سے سابقہ پڑتا ہے انہیں اچھی طرح علم ہے کہ میلے گندے بدبودار کپڑے پہنے ہوئے بچوں کی کمی کسی مدرسہ میں نہیں ہے۔ بعض تو اس میں شک

نہیں کہ بہت غریب ہوں گے اور کپڑا تو بعد کا سوال ہے ان کو پیٹ بھر کھانا بھی میسر نہ آتا ہوگا لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو خوش حال ماں باپ کی اولاد ہیں لیکن محض لاپرواہی یا بدسلیقگی کی وجہ سے صاف وستھرے رہنے کے عادی نہیں ہیں۔ جن بچوں کی شیروانیوں پر منوں گرد اٹی ہے بٹن کچھ کھلے کچھ غائب ہیں ٹوپی کے کنارے پر میل کی گوٹ لگی ہے۔ پائجامہ کا لنگلاٹ چھینٹ بن گیا ہے، جوتے کے ٹانکے کھسیں نکالے ہیں اور دوڑیاں یا تو ہیں نہیں یا ایک آدہ سوراخ میں اٹکی ہوئی ہیں دامن پر خاک گریبان چاک ہے۔ یقین مانئے کہ وہ لازمی طور سے غریب نہیں ہیں بلکہ کھاتے پیتے لوگوں کے نور نظر اور اچھے گھروں کے چراغ ہیں ان دو قسموں میں سے کوئی ہو۔ غریب یا امیر خواہ اس کے پاس بہت سے جوڑے ہوں خواہ ایک یا دو۔ خواہ کپڑے ریشمی اور ثابت ہوں یا سوتی اور پھٹے ہوئے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ دونوں صاف رہ سکتے ہیں۔ اگر امیر کا لڑکا نوکر کی مدد سے اپنی صفائی کا اہتمام کر سکتا ہے تو غریب بچوں کو خدا نے دو ہاتھ دئے ہیں بالکل چھوٹے بچوں کے والدین ذرا سی توجہ سے ان کو کثافت گندگی اور میلے پن کی عادت سے بچا سکتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ حمام کرا دینا کچھ مشکل کام نہیں اگر بچوں یا ان کے والدین کو کپڑے خود اپنے ہاتھ سے دھونے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں البتہ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ بچے غلیظ کپڑے پہنے ہوئے باہر نکلیں یا مدرسہ آئیں۔

میں نے پہلے تو صفائی کا ہفتہ واری معائنہ شروع کیا لیکن چونکہ لڑکوں کے مدرسہ کے کپڑے اور ادھر اُدھر پہنکر جانے کے کپڑے ایک ہی تھے اس لئے نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلا۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر مدرسہ کے کپڑے بالکل علحدہ کر دئے جائیں تو غالباً بچے مدرسہ کو صاف وستھرے آیا کریں۔ اس طرح سب سے پہلے میرے دل میں یونیفارم یعنی یکرنگی لباس کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن سوال یہ تھا آیا لوگ اس تحریک کو مانیں گے اور کیا وہ یہ نہ کہیں گے کہ بغیر یکرنگی لباس بچوں کا صاف وستھرا آنا ممکن ہے؟ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ سوال مجھ سے کسی نے کیا نہیں۔ میں نے خود ہی یہ سوال اپنے دل سے کیا اور خود ہی جواب دیا کہ ہاں یہ ممکن ہے لیکن برسوں کے تجربہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر گھر اور مدرسہ کا لباس

ایک ہی رہے تو بچے اسے بڑی بے دردی سے استعمال کرتے ہیں لیکن جو لباس مدرسہ کے لئے مخصوص ہو اس کو صاف و ستھرا رکھنے میں کافی احتیاط کی جائے گی۔

لیکن یونیفارم کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے۔ اگر ایک طرف اس سے صفائی قائم ہوتی ہے تو دوسری طرف ایک رنگ کے لباس میں بچوں کے گروہ اور قطاریں بے حد بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مزید برآں بچوں میں ہندو مسلمان کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ایک لباس میں سب کے سب بھائی بھائی معلوم ہوتے ہیں اور مدرسہ بھر کے بچوں میں برادرانہ جذبہ نشو و نما پاتا ہے۔ ان کو اور کچھ خیال نہیں رہتا سوائے اس کے کہ وہ سب ایک ہی مدرسہ کے طالب علم ہیں گویا کہ ایک ماں کے بچے ہیں۔ اس طرح ہم رنگی لباس سے ملی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور ہندو مسلم اتحاد میں اس سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مجھے تو ایک فائدہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مدرسہ برخاست ہونے پر نیلی شیروانیوں سے بچے شناخت کر لئے جاتے ہیں اور ایک حد تک ان پر نگرانی رہتی ہے۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے یونیفارم کا مسئلہ بالکل نیا تھا میں نے کہا نیا یعنی ہمارے لئے۔ درحقیقت یہ کوئی جدت نہیں ہے۔ غیر سررشتوں مثلاً فوج پولیس، عدالت وغیرہ میں یونیفارم مروج ہے۔ خود سررشتہ تعلیمات میں اسکوٹ طلبا رضاکی یونیفارم زیب تن کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اسلامی جامعات میں ایک قسم کا چوغہ استعمال ہوتا تھا جس کو اب مغربی یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں گوں کی شکل میں رائج کیا ہے۔ یورپ کے مدارس اور ہندوستان کے یوروپین مدارس میں تمام بچوں کے لئے یونیفارم ہے حتیٰ کہ جو مدارس انگریزی لڑکیوں کے لئے ہیں مثلاً ریلوے آفیسرز گرلز اسکول کلکتہ، ان میں بھی یونیفارم مقرر ہے۔ ہندوستانی مدارس میں جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف علی گڈھ کالج ایسا ہے جہاں سیاہ یا نیلے رنگ کے ترکش کوٹ (اب شیروانی بھی یونیفارم میں داخل ہے) بطور یونیفارم پہنے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں جوبلی ہائی اسکول میں (جو اب گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج ہو گیا ہے) مسٹر ہیری مینڈ مبدی بی اے آنجہانی کے زمانہ صدارت میں سیاہ ٹوپی، سفید کالر سیاہ شیروانی یا کوٹ، سفید پائجامہ، سیاہ موزہ، سفید کینوس کے جوتے یونیفارم میں داخل تھے۔

میں اب لکھنؤ کے متعلق نہیں کہہ سکتا لیکن علی گڈھ میں یونیفارم زندہ قانون ہے چند روز ہوئے فلسطین کے عربوں نے اپنے بچوں کے لئے نکر اور قمیص تجویز کیا ہے۔ ہمارے پڑوس ہی میں مہاراجہ کالج میسور کے لڑکوں نے بھی اپنی خوشی سے یونیفارم اختیار کی ہے لیکن یہ لڑکے رہیں جھونپڑی میں اور خواب دیکھیں محلوں کا کے مصداق ہیں۔ ان کی بلند خیالی نے انہیں اجازت نہ دی کہ وہ بلیزر کے سوائے کسی اور کپڑے کو زیب بدن کریں اور چونکہ یہ کپڑا قیمتی اور ہر طالبعلم کی دسترس سے باہر ہے اس لئے معاملہ ادھورا رہ گیا۔

ہمارے یہاں دراصل یک لخت تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیا ہندو کیا مسلمان حیدرآباد میں رومی ٹوپی اکثر لڑکوں کے سروں پر نظر آتی ہے۔ میرے مدرسے میں صرف دس پندرہ لڑکے تھے جن کے پاس رومی ٹوپی نہ تھی۔ پائجامے تو سبھی پہنتے ہیں اور دھوتی اور پائجامے والے یکساں طور پر شیروانی استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے پیش نظر شیروانی اور کوٹ کا جھگڑا نہ تھا یہ تو بالکل طے تھا کہ اسکول کے تمام لڑکے شیروانی ہی پہنیں گے مگر رنگ کون سا ہو؟

رنگ کے انتخاب نے عرصہ تک حیران رکھا۔ ضرورت ایسے رنگ کی تھی جس میں سرد و گرم کپڑے مختلف قیمتوں کے مل سکیں تاکہ وہی کپڑا جاڑا گرمی دونوں موسموں میں امیر و غریب سب کے لئے یکساں طور پر کام آسکے یہ خصوصیتیں صرف دو رنگوں میں تھیں، سیاہ و نیلا سب سے پہلے نظریں سیاہ رنگ پر پڑیں کیونکہ علی گڈھ و لکھنؤ دونوں جگہ سیاہ رنگ کا یونیفارم ہے۔ لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ یہ جاذب شعاع شمسی ہے جس کا استعمال موسم گرما میں ناقابل برداشت تکلیفوں کا سبب ہوتا۔ سفید اور دوسرے ہلکے رنگ اس وجہ سے رد کر دئے گئے کہ وہ جلد میلے ہو جاتے ہیں اور سردی میں کام نہیں آسکتے۔ چاکلیٹ اور دوسرے گہرے رنگوں میں بڑی خامی یہ ہے کہ وہ ہلکی قیمتوں میں نہیں آتے اور ان رنگوں میں سوتی کپڑے بالکل چھچھورے معلوم ہوتے ہیں۔ خاکی رنگ شیروانی کے لئے ناموزوں ہے۔ البتہ نیلا رنگ سیاہ رنگ کے عیبوں اور دوسرے رنگوں کی کوتاہیوں سے بچا ہوا ہے اور اس میں تمام دیگر سہولتیں موجود ہیں۔ نیلے سوتی کپڑے ۸ آنہ سے (عہ) فی گز تک اور

ادنی عہاں سے دس روپیہ فی گز تک بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت کے بآسانی ملتے ہیں
اس لئے بالآخر نیلے رنگ ہی کی رائے قرار پائی۔ بعض حضرات کی رائے تھی کہ گرمی کے لئے
کوئی دوسرا ہلکا رنگ مقرر ہو۔ گو یہ اچھا ہوتا اور اس صورت میں ہم کوئی سا بھی رنگ منتخب
کر سکتے تھے لیکن مجھے خوف ہے کہ دوہری یونیفارم کے لئے زمین تیار نہ تھی اور نہ ہے
اور یقیناً دشواریاں بڑھ جاتیں۔

ترویج یونیفارم میں مجھے کوئی حقیقی دقت پیش نہیں آئی۔ ہر تحریک میں رکاوٹیں پیدا
کرنے والے عنصر عموماً چار ہوتے ہیں۔ (۱) مدرسین (۲) سررشتہ (۳) طلبا (۴) اولیاء طلبا۔
میرے اسٹاف والے بالعموم ہر کام میں میرا ہاتھ بٹاتے ہیں اور یونیفارم کے معاملہ میں
جس یکجہتی دلچسپی اور جوش سے انہوں نے حصہ لیا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے انہوں نے
دامے، درمے، سخنے۔ قدمے غرضکہ ہر ممکنہ طریقہ سے یونیفارم کی تحریک کو فروغ دینے میں
میری مدد کی اور کبھی نہ تو مخالفت معروف اور نہ مفاومت بزدل کی صورت پیدا ہوئی۔
سررشتہ کی مخالفت عام طور سے تجاہل عارفانہ کی شکل اختیار کرتی ہے یعنی مدرسین کو جس
حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی ضرورت ہے وہ نصیب نہیں ہوتی مجھے تو اس کا رونا ہی نہیں۔
کیونکہ جب میں سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ سے ترویج یونیفارم کا ذکر کیا تو انہوں نے
مسرت و تعلق ہم کا اظہار کچھ ایسے پرجوش و ہمدردانہ الفاظ میں فرمایا جس نے میرے دل و دماغ میں ایک نئی قوت دی
اس برقی قوت سے لدا پھندا میں مدرسہ پہونچا اور سارے مدرسہ کو برقناک کر دیا محض یہ
علم کہ یونیفارم صدر مدرس کی سنک نہیں ہے بلکہ افسر بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے
ہیں جوش کو دوبالا کرنے کے لئے کافی تھا۔

دراصل خود رکاوٹ نہیں پیدا کرتے اور نہ کر سکتے ہیں خصوصاً لباس کے بارہ
میں ان کے دلپر صرف وسواس الخناس کا اثر ہوتا ہے اور وہ بے فکر ہو جاتے ہیں خناس
سے مقررین خواہ کچھ مراد لیں۔ لیکن میرے نزدیک خناس وہ لوگ ہیں جو ہر نئی تحریک کے
خلاف بےچینی و شورش پیدا کرانا بیکاری کا شغلہ سمجھتے ہیں جب میرے شاگرد شروع شروع
بس نیلی شیروانیاں پہنکر نکلے تو انہی حضرات نے ان معصوموں پر آوازے کسے اور یتیم خانے

بچے اور جیل گوڑہ کے قیدی کی پھبتیاں اڑائیں خیر یتیم خانے تو دور تھے لیکن مخالفین کی بدقسمتی سے ہر ماہ مدرسے کے سامنے سے فوج جاتی ہے اور جیل کے قیدی بھی گذرتے ہیں۔ بچے دونوں کو دیکھتے ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ اول الذکر یتیموں کا لشکر نہیں ہے اور نہ موخر الذکر نیلی شیروانی پہنتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اب لاجورد پوشوں کو کن آنکھوں سے دیکھتے اور دست حسرت ملتے ہیں۔ اب رہے والدین جن سے مخالفت کا خطرہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یونیفارم میں کوئی عفریت نہ تھی لیکن چونکہ ایک خاص چیز کے لئے اصرار تھا اس لئے خوف تھا کہ شرفا ر کی خود دار طبیعتیں مدرسہ کے حکم کو یکبارگی ماننے کے لئے شاید تیار نہ ہوں۔ اس لئے میں نے وقتاً فوقتاً طلبا ر کے والدین اور سرپرستوں کو کسی نہ کسی بہانے سے بلایا اور اثنائے گفتگو میں استمزاج کر لیا۔ مجھے تو یاد نہیں کہ کسی نے کبھی اختلاف یا اعتراض کیا ہو اور چند روز کے بعد جب بچوں کے ہاتھ میں ایک ایک نوٹس دیدیا گیا تو برقی سرعت کے ساتھ تیاریاں ہونے لگیں۔ پارچہ فروشوں پر حملے ہو گئے اور درزیوں کی دکانوں پر دھاوا بولدیا گیا۔ تاریخ مقررہ پر چند غریبوں کے سوا سب کی یونیفارم تیار تھی۔ البقیہ نے دوسری تنخواہ پر بنوالی جو بالکل غیر مستطیع تھے ان کے لئے پور فنڈ سے انتظام کر دیا گیا۔ اکثر بچے جنہوں نے پہلے کبھی شیروانی نہ پہنی تھی نیلپوش ہو کر اترانے لگے۔ اس سلسلہ میں اولیا ر طلبا کی گرمجوشی قابل قدر ہے انہوں نے جس فراخ حوصلگی سے میری خواہش کی تکمیل کی اس کی مثال مشکل سے ملیگی۔ میں خاصکر ان مجتہدین مہدویہ کا رہین منت ہوں جنہوں نے اپنے بچوں کو رسم ورواج کے خلاف محض احکام مدرسہ کی پابجائی کے لئے رومی ٹوپی اور بوٹ پہنایا اور دوسروں کیلئے نظیر قائم کی حالانکہ شملہ جادۂ ارشاد کا لازمہ ہے۔

گرمی کی آمد نے ایک نئی دشواری پیدا کر دی۔ جن حضرات نے اپنے بچوں کے لئے سرج وغیرہ کی شیروانیاں بنائی تھیں ان کو ڈرل پسند نہ تھی۔ اسپنسر کمپنی سے خط و کتابت کرنے پر ایک دوسری ڈرل کا نمونہ آگیا جو نیلے رنگ کی اور نرم تھی۔ اس کے علاوہ نیلے پاٹمین اور نیلے آلپکا کی دستیابی نے دقتوں کا خاتمہ کر دیا اور رنگ و کپڑے کا قضیہ ہمیشہ کیلئے طے ہو گیا۔

ہر روز جب آخری گھنٹہ کی آواز تیسری منزل سے ہوا میں گونجتی ہے تو نیلپوش لڑکے ہر گلی و کوچہ میں پھیل جاتے ہیں اور نہایت دل فریب منظر پیش کرتے ہیں۔ ان ہم رنگ طلباء میں باہمی خلوص و اخوت کا جذبہ بھر گیا ہے۔ ان کو اپنے مدرسہ سے قلبی لگاؤ اور اپنے کھوبی لباس پر بیحد ناز ہے۔

آج کل لوگ نہایت بے چینی کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ دوسرے مدارس کیا کریں گے ؟ کیا وہ بھی یونیفارم اختیار کریں گے ؟ کیا سب مدارس کی یونیفارم کا رنگ یکساں ہوگا یا الگ الگ ؟ میرے خیال میں دوسرے مدارس کے لئے یونیفارم ناگزیر ہے یونیفارم کی دیدہ زیبی ایک متعدی مرض ہے جس سے لڑکے متاثر ہو چکے ہیں۔ یونیفارم کے خیال کو جس اسکول کا جی چاہے ٹھکرائے لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس بڑھتے ہوئے طوفان کے آگے ایک دن سب کو سر جھکانا پڑے گا لیکن کیا وہ بھی نیلپوش ہوں گے ؟ یہ ضروری نہیں ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ اگر تمام مدارس ایک ہی رنگ کا لباس پہنیں تو نیلے کپڑوں کی دستیابی میں سہولت اور قیمتوں میں کفایت ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ سستے داموں بہتر کپڑے ملنے لگیں۔ بر خلاف اس کے علحدہ علحدہ رنگ اختیار کرنے میں مختلف مدارس کے بچوں میں امتیاز رہیگا۔ اس امتیاز سے بچوں میں پاکیزہ رقابت و رشک پیدا ہوگا جو ترقی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں بچوں کو مدرسہ بدلنے میں اتنی آزادی و سہولت نہ رہے گی اور اس طرح ممکن ہے کہ کم زوری طلباء کا ایک سبب زائل ہو جائے رنگ تو خیر صدر مدرسین کے صوابدید پر منحصر ہوگا لیکن ایک عام غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اکثر حضرات کو یونیفارم پر یہ اعتراض ہے کہ اولیاء طلبہ مخالفت کریں گے یہ خیال ذہنیت عامہ کی غلط تعبیر ہے کون سا باپ جس کے دل میں شفقت پدری ہے اور کون سی ماں جس کے کوکھ میں مامتا ہے اپنے نور نظر اپنے لال سے زیادہ کوئی شئے عزیز رکھتی ہے ؟۔ والدین اپنے جگر گوشوں پر مصارف سے دریغ نہیں کرتے لیکن وہ رسم رواج میں کچھ ایسے لتھ پتھ ہیں کہ چند گھنٹوں کی دھوم دھام کے لئے اشرفیاں لٹا دیتے ہیں لیکن ضروری کاموں کے لئے کوئلہ پر مہر لگاتے ہیں۔ انہیں ضروری اور غیر ضروری میں

امتیاز نہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ان کو ان کے فرائض سے آگاہ کریں انہیں بتائیں کہ بچوں کے لئے کیا کرنا چاہیئے جس طرح مرض میں وہ ڈاکٹروں سے رجوع ہوتے ہیں اور قانونی مسائل میں وکیل کی رہنمائی چاہتے ہیں اسی طرح تعلیمی معاملات میں وہ ہمارے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ خود تعلیمی امور اور ضرورتوں کے متعلق کچھ نہ سوچتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ وہ ہم پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اگر ہم انہیں تعلیمی معاملات میں مناسب طور وطریق سے مشورہ دیں تو وہ ہمارا دم بھرنے لگیں گے اور ہر کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ (باقی)

سیّد فخر الحسن

تعلیم ——— ایک خواب

ذیل میں ڈاکٹر جی ایس ارنڈیل صاحب ایم اے ایل ایل بی کا خطبہ صدارت ہے جو انھوں نے آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز کے چوتھے اجلاس میں بمقام بمبئی پڑھا تھا ڈاکٹر صاحب فرنگی نژاد ہیں لیکن اب ہندوستانی ہوگئے ہیں۔ آپ کا تعلق اس عالمگیر ادارہ سے ہے جو تھیوسوفیکل سوسائٹی کے نام سے مشہور ہے اور جس کی غرض وغایت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کے عام مذاہب وملل کی اصولی خوبیوں کو لے کر ایک ایسے اخوت کی بنیاد ڈالی جائے جس سے فرقہ داری منافرت وملی جتھہ بندی کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر اس خطبہ کو پڑھ جانے کے بعد یہ خوف ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے عقائد کو بھول گئے۔ بجائے ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دینے کے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا تعمیر کریں یہ کہیں زیادہ سودمند ہوتا اگر وہ اپنی مغربی نشو ونما اور اپنی مشرقی بود وباش کی بنا پر یہ بتاتے کہ مشرق کو مغرب سے کون کون سی باتیں لینا چاہیئے اور کون سی نہیں۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب کا خطبہ فلسفیانہ بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس میں

شاعرانہ بلند پروازی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگر ہمیں کسی خیال سے اتفاق نہ ہو یا کوئی بات ناقابل عمل معلوم ہو تو ہمیں ڈاکٹر صاحب کے آخری فقروں کو نہ بھولنا چاہیئے کہ "آج ہم اور آپ ایک نہایت دلفریب خواب دیکھ رہے ہیں لیکن ممکن ہے کہ آنے والی نسل ہمارے خوابوں کو بلکہ ان سے بھی زیادہ شاندار خوابوں کو عملی جامہ پہنا پڑے"!

مُدیر

ہماری تعلیمی جولانگاہ میں دوسروں کے تجربے نہایت دلچسپ اور گراں قدر ثابت ہو سکتے ہیں لیکن پیشۂ تعلیم کے حق میں ایک معلم کا نہایت گراں بہا عطیہ خود اس کی ذات، اس کا ذاتی انہماک اور اس کا شخصی اثر ہے۔ نہ کہ اوروں کی سنی سنائی بیجان تقلید۔ خواہ اس قسم کی تقلید کسی غیر معمولی ہستی کا تجربہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہم دوسروں کے تعلیمی تجربوں سے جو ترقی تعلیم کی راہ میں زبردست اہمیت رکھتے ہوں بیحد فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم صحیح معنے میں تب ہی مستفید ہو سکتے ہیں جبکہ ہم خود انہیں کے نقش قدم پر اسی استقلال اور استحکام کے ساتھ گامزن ہو سکیں۔

اپنے طلبار کے لئے اگر کوئی اُستاد بہترین نمونہ پیش کر سکتا ہے تو خود اپنی زندگی کا اس لئے کہ جو خاطر نشینی آپ بیتی کتھا میں ہے وہ جگ بیتی میں نہیں۔ اگر استاد ہی نے میاں مٹھو کی لی تو لڑکے کیا خاک نکلیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ استاد کو نقال نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ طلبار کی نظریں استاد کی جذابیت۔ اس کی تپش دروں اور اس کے خلوص کی متلاشی رہتی ہیں۔ اور یہ نہ ہوا تو پھر کچھ نہیں۔ استاد کو خوددار، مستقل مزاج، شوقین، جذبات سے پُر اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر طرح تیار رہنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ استادی کی خدمت نہایت ہی اہم ہوتی ہے اُستادیں اپنے شاگردوں کے جذبات کی قدر ہونی چاہیئے۔ اس میں ایسا جوش ہونا چاہیئے کہ وہ طلبار میں ایک ہیجان ڈالدے اور وہ ہر کام کو پورا کر سکیں اس میں کسی طرح کی کمی نہ ہونی چاہیئے۔ اس میں مُردنی نہ ہو۔ دنیا سے بیزاری نہ ہو، بیخودی نہ ہو اور نہ وہ ناامیدی اور غم کا مجسم نمونہ ہو۔ بلکہ اسے سر سے پیر تک ایک

مسرت کی جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہیئے۔ اسے ایک شعلہ کے مانند ہونا چاہیئے جو اس کے ہر طالب علم کے چراغ کو روشن کر دے۔ اسے ایک ایسا پُر نور جادوگر ہونا چاہیئے۔ جو اپنے جادو سے اپنا نور تمام طلبار میں پھیلا دے۔ ایک استاد جو خود پُر نور ہوتا ہے وہ یقیناً اپنے نور سے اپنے طلبار کو بھی منور کر دے گا۔ اور جو مضامین وہ پڑھاتا ہے وہ گویا نالیاں ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی تڑپ اور پیاس طلبار میں منتقل کرتا ہے جو طلبار میں داخل ہو کر ان کی خوابیدہ تڑپ اور پیاس کو جگاتی ہے۔

تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ میرے خطبہ کے لئے جو تعریف مجھے موزوں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد متعلم میں اس صلاحیت کا پیدا کرنا ہے جس سے وہ ہر بیرونی چیز سے اپنے لئے مفید باتیں معلوم کرلے اور اپنی روشنی کو ان روشنیوں سے اکٹھا کر کے مزید روشنی عطا کرے۔ تاکہ یہ روشنی اس کے اطراف پھیل کر ہر چیز کو روشن کر دے مختصر یہ کہ آپ پر نور ہوا اور دنیا کو بھی پر نور کر دے تعلیم کے معنے ابتدار سے لے کر انتہا تک تاریکی کو دور کرنا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اندرونی روشنی اور بیرونی روشنی میں بہت فرق ہے۔ دنیا میں سوائے روشنی کے اور کچھ نہیں۔ زندگی کا جزو روشنی ہے۔ تو کیا پھر استاد کا فرض ان رابطوں سے اتحاد کر کے شاندار مقاصد کو قریب تر کر دینا نہیں ہے! ہمارے نصاب کے مضامین، ہمارے پر تکلف ساز و سامان ہمارے طریقے، طرزیں اور قاعدے ہمارے تمام مصطلحات خواہ وہ کچھ ہی ہوں، ہمارے امتحانات، ہماری قدامت پسندی سب کا اصول اور انتہائی مقصد یہی ہے گو مجھے اندیشہ ہے کہ رنگوں کے پھیر میں ہم اکثر شاندار تصویر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ان اعلیٰ مقاصد کے مدنظر میں سب سے پہلے استاد سے صداقت شعاری کی توقع رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خود فریبی کا شکار نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کسی طرح دوسرے کا دست نگر نہ رہے۔ اور ہر طرح محسوس کرلے کہ اس کا مقصد اولین اصلاح روح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ اپنے بل بوتے پر مردانہ وار کھڑا رہنا سیکھے۔ اور

دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈے۔ بہرحال میرا مقصد یہ ہے کہ اپنی راستبازی کے احساس
کے ساتھ ساتھ وہ اس امر کو محسوس کرے کہ معلم کا ایک گران بہا عطیہ (اگر فی الحقیقت اس
قسم کا اطلاق صحیح ہے) یہ ہے کہ وہ بہ طیب خاطر اپنے طلباء کو بھی اس قسم کا موقع دے کہ
وہ بھی راستبازی کے حصول میں کامیابی حاصل کرسکیں۔ اور صداقت شعاری کا ولولہ
ان کے ننھے دلوں میں پیدا ہو۔ یکتا استاد وہی ہے جو کہے "میں اپنے رنگ میں یکتا ہوں
تم اپنے رنگ میں یکتے بنو۔ میری تقلید تمہیں لازم نہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں کہے گا کہ میں ایک
فرد ہوں یا یہ کہ کسی زبردست اصل کی نقل ہوں اور تم میری طرح اصل کی نقل یا نقل النقل بنو"
استاد کو بہت اچھی طرح جاننا چاہیئے کہ تعلیم کا مقصد صرف صداقت ہے۔ اور صداقت کے
سوائے کچھ نہیں۔ تاریخ جو ہمارے سامنے ہے وہ مکمل نہیں ہے۔ جہاں تک کہ واقعات
اس میں درج ہیں وہ صحیح ہیں۔ لیکن یہ تمام واقعات بالکلیہ صحیح نہیں۔ یہی حال جغرافیہ، ریاضی
سائنس، علم ادب، فلسفہ اور ان تمام علوم کا ہے جو ترقی کے ماخذ ہیں۔ وہ بحیثیت کلی ہمارے
سامنے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر مشتے از خروارے ہیں بہت سے ایسے ہیں جن میں صحت
بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ اگر کچھ ہے تو وہ ایک جھلک سے زیادہ نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ
جس حد تک ہم جانتے ہیں وہ بہت ہی اعلیٰ درجہ کے ہوں لیکن پھر بھی ہم دعویٰ نہیں کرسکتے
کہ وہ بالکل صحیح اور مکمل ہیں۔ لہذا ہمیں ان اصولوں کو چھوڑ دینا چاہیئے جو صداقت کی تلاش
کے مانع ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے تعلیمی اصول اس "خار زار" بستر کے سے ہیں جس کا برتاؤ
دوست و دشمن دونوں کے ساتھ ایک ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے اصول پر حد سے زیادہ
اعتبار ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم علم کی روشنی سے مالامال نہیں ہوتے۔ ہمارا یہ قول
ہوگیا ہے "کہ اگر اس بات کو مانتے ہو تو اچھا ہے ورنہ ہمارے پاس سے دور ہو جاؤ کیونکہ
جو کچھ ہم تم کو دے سکتے ہیں وہ یہی ہے۔ اگر تم نے اس کو قبول کرلیا تو یہ تم کو پرنور کردے گا
اور اگر تم نے اسے حاصل نہ کیا تو پھر تم ہمیشہ ضلالت میں گھرے ہوگے۔ اگر تم نے ہمیں یہ بتلادیا
کہ اس روشنی کو تم نے اپنا خضر راہ بنالیا ہے (جو امتحان کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ
آیا تم نے واقعی ایسا کیا ہے یا نہیں) تو ہم تم کو اپنے اصول کے ماننے کے صلے میں سندیں

اور ڈگریاں دینگے۔ اس امتحان میں اگر تم نے ہماری بتائی باتوں کو دُہرا دیا تو تم کامیاب ہو گئے اور اگر نہیں تو ناکام۔ اور پھر تمہارا خدا ہی حافظ ہے اس وجہ سے کہ ہم تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"

ان ناکاموں میں سے چند ایسے ہیں جو پھر اسی اصول کے تحت رہتے ہیں اور چند ایسے باقی بچتے ہیں کہ وہ اس ناکامی پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ اس منحوس اصول کے شکنجہ سے نکل گئے لیکن خدا کے لئے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں تمام اصولوں کو مٹانا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تعلیمی زندگی میں اصولوں کا کیا کام ہے۔ لیکن ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر وقت ہوشیاری سے عزت، آزادی، جدت کو اصول کی غلامی سے بچائے رکھیں۔ ممکن ہے کہ ہم کو مجبور کر کے ضرورت سے زیادہ کام کرایا جائے لیکن ہم کو چاہیئے کہ ہم اس وقت بیحد احسان مند ہوں جبکہ ہمیں کوئی ایسا موقع ملے کہ ہم اس زیادتی سے کسی طرح بچ سکیں۔ خواہ وہ انقلاب ہی کی حالت کیوں نہ ہو۔ ہمیں اس چیز پر بہت ہی غور کرنا چاہیئے جو ہم کو پرانی لکیر سے جدا کر رہی ہو خواہ اس سے ہمیں کتنا ہی نقصان پہنچے۔ لیکن یہ خطرناک چیز اس آہستہ رفتار سے تو بہتر ہے کیونکہ اس میں ترقی کی اُمید ہے معلم جن بھیدوں سے واقف ہوتا ہے اس کا فرض ہے کہ ان سے اپنے طلباء کو آگاہ کرائے لیکن قبل اس کے کہ وہ تبلائے ان پر خوب غور کر لے۔ اسے چاہیئے کہ وہ اپنی ہی معلومات پر اکتفا نہ کرے بلکہ طلباء میں تلاش اور بحث کی خو پیدا کرے اور خاص کر ان مضامین میں جو نہایت سخت گیر ہیں۔ جیسے تاریخ، فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات میں اساتذہ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ طلباء کے یہ ذہن نشین کر دیں کہ تمام قوانین صرف مفروضات ہی ہیں خواہ انہیں مانو یا رد کر دو لیکن یہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ خوب چھان بین کر لیجائے حقیقی معنوں میں جو اساتذہ ہوتے ہیں وہ کبھی یہ نہ کہیں گے کہ "فلاں چیز صحیح ہے، فلاں غلط فلاں ناقابل رد ہے اور فلاں پر اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو کافر ہو جاؤ گے۔"

ہمیں معلوم ہے کہ بہت سی چیزیں بے کار ہیں لیکن ہم کو مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے۔ طالب علم ایک ایسی جگہ سے دنیا میں آتا ہے کہ اس جگہ کو جانتا ہی نہیں۔ لہذا ہمارا

فرض ہے کہ ہم اس کو اس دنیا کے حالات سے آگاہ کریں۔ اور ان تمام باتوں کو بتلائیں جو اس کے آنے سے پہلے گزر چکی ہیں۔ ہمیں اچھی طرح اس کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے کہ ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں اور تم جتنا بھی معلوم کرتے جاؤ اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ معلوم نہ ہوا۔ اور جو کچھ معلوم بھی ہو اس کی اصلاح کی بڑی ضرورت ہے۔ تعلیم جو دیجاتی ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ طلبا ایک مقررہ نصاب تک پہنچ کر خاموش ہو جائیں۔ بلکہ انہیں چاہیئے کہ وہ برابر علم حاصل کرتے رہیں۔ ہمیں اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بہترین شئے وہی ہے جو طلبار کو خود صداقت کے دریافت کرنے کا راستہ بتلا دے۔ اگر وہ راستہ موجودہ زمانہ کے خلاف ہو تو پرواہ نہیں انہیں کبھی روکا نہ جائے۔ استاد کا فرض یہ ہے کہ عرفان ذات میں طلبار کی مدد کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں۔ اور طلبار کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہستی سے واقف ہو جائیں۔

جب طالب علم اس منزل میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر ناکامی کا خطرہ بہت ہی کم رہتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ کن طریقوں سے اسے حاصل کرتا ہے۔ وہ ان راستوں سے گذرے گا جن کو دنیا کے لوگ ناکامی اور تباہی خیال کریں گے۔ لیکن اگر وہ خود اپنی ہمت سے ایسا کر رہا ہے تو پھر وہ یقیناً کامیاب ہوگا۔

تعلیم اس لئے نہیں کہ انسان کو مصیبت اور تکلیف، شکست اور ناکامی سے بچائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان میں ان تمام چیزوں سے بہادرانہ مقابلہ کی طاقت پیدا کر دے۔ روک تھام اور دباؤ تعلیم کے حق میں زہر ہیں جس طرح سے کہ سزا اور احکام زہر کا کام کرتے ہیں۔ میں یہ حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ آزادی اور باضابطگی لازم و ملزوم ہیں۔ میرے نزدیک وہ استاد کہلانے کے قابل ہی نہیں جو اپنی تعلیم منوانے کے خاطر اپنے عہدہ داروں کی مدد کا طالب رہے۔ وہ انہی چیزوں کا استاد ہوتا ہے جو اس کے نزدیک اہم ہیں یا جس کو وہ اپنی ذاتی بزرگی اور خلوص کے اظہار کا باعث جانتا ہے۔

استادوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جانی چاہیئے کہ ان کا شاگرد ایک غیر فانی اور روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا ماضی ممکن ہے کہ بہت ہی شاندار رہا ہو اور جس کا

حال اسے ایسے شاندار مستقبل کی طرف لیجا رہا ہے وہ ابھی معلوم نہیں کر سکتا آج وہ اپنے
آپ کو جس زندگی میں سے گذرتے دیکھ رہا ہے وہ طول طویل مسافت کی پہلی منزل ہے جو
گذشتہ زمانہ کا ایک بھولا ہوا خواب اور آیندہ کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے لڑکا جسامت
کی حد تک ایک لڑکا ہے ورنہ وہ ایک روح ہے جس کو فنا نہیں جس کی عظمت ان لوگوں
سے کسی طرح کم نہیں جو کہ اس سے عمر میں بڑے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ نہایت ہی شاندار ہو ۔
لہذا اساتذہ سے میری خواہش ہے کہ وہ طلباء کا احترام کریں۔ اور طلبا بھی اساتذہ کا احترام
کریں اگرچہ موخر الذکر سے اس معاملہ میں اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اس بات کو ذہن نشین
کر لینا چاہیئے کہ جسم کی کیفیت اور حالت روح کی گاڑی کی سی ہے۔ جو اس کا ابتداء سے
لے کر موت تک ساتھ دیتی ہے۔ اسی طرح استاد ایک کڑی ہے جو ان دونوں کو ملاتی
ہے۔ اور اس وجہ سے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے وہ روح کا سفیر، دوست اور ساتھی ہے
اور چونکہ اس میں یہ باتیں موجود ہیں لہذا وہ بعض وقت روح کی خاطر جسم کو آزار پہنچاتا ہے۔
اور چونکہ روح اور جسم میں قریبی تعلق ہے اس لئے وہ بہت بچ بچ کر ایسا کرتا ہے تاکہ کہیں
روح بھی جسم کے ساتھ متنفر نہ ہو جائے۔ ہم تعلیم میں آزادی سے بحث کرتے ہیں۔ دنیا میں
صرف ایک ہی حقیقی معنوں میں آزادی ہے اور وہ آزادی روح کی آزادی ہے جو میرے خیال
میں نشو و نما کے لئے چھوڑی دی گئی۔ تاکہ روح بلا کسی وقت کے اپنی ضروریات اور احتیاجات
کے خاطر جسم پر حکمراں ہو جاتے۔

استاد طلباء کے لئے وہ چیزیں بہم پہنچاتا ہے جو والدین کے فرائض میں سے ہیں
ساری دنیا کا تعلق صرف جسم سے ہوتا ہے مگر اکیلا استاد ہی ہوتا ہے جس کا تعلق جسم سے نہیں
بلکہ روح سے ہوتا ہے۔

میری تمنا ہے کہ اساتذہ طلباء کو انکی ابتداء اور انجام کو معلوم کرانے میں کبھی پریشانی
کو کام میں نہ لائیں تعلیم دراصل اسی لئے ہوتی ہے کہ جس مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے ان کو
طلباء معلوم کر سکیں۔ اگر استاد تبلانے سے اور طالب علم سمجھنے سے قاصر رہے اور وہ ابتداء
اور انجام کا حال نہ جان سکیں تو پھر دونوں اپنے فرائض کو انجام نہ دے سکے۔ کم از کم

استاد طلباء کی ہمت بڑھائیں تاکہ وہ ان پر ہیبت قوانین سے جو تلاش جستجو کی راہ میں حائل ہوتے ہیں مرعوب ہو کر تلاش سے کہیں کنارہ کش نہ ہو جائیں۔

طلباء کو ہر بات معلوم ہونی چاہیئے اس سے بحث ہی نہیں کہ کیا جاننا چاہیئے اور کیا نہیں۔ انہیں ہر نظریہ کا حل معلوم ہونا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں ان کے خیالات میں غلطیاں ہوں گی لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کون ایسا ہے جس کے خیالات غلطی سے مبرا ہیں۔ ان کی معلومات اس میں شک نہیں کم ہوں گی لیکن یہ تو بتلائیے کہ کون ایسا ہے جو سب باتوں سے واقف ہے۔ ان کے نتائج تشفی بخش نہ ہوں گے لیکن اوروں کے بھی ایسے ہوا کرتے ہیں۔ صحیح تعلیم کے معنے یہ ہیں کہ وہ طالب علم میں علم کی پیاس معلومات کی چاٹ اور موجودہ معلومات سے کافی تشفی نہ ہونے کی ان کے دل میں لگن لگا دے یہی وہ چیزیں ہیں جو ایک اچھے طالب علم کا جوہر کہلائی جا سکتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آگے چل کر روح کو جسم پر فتح دلاتی ہیں۔ اس طالب علم کی زندگی ایک کامیاب زندگی ہو گی بعض وقت واقعات زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتے لیکن اس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ امتحانوں میں ناکامی آگے چل کر زندگی میں شاندار کامیابیوں کے دروازے کھول دیتی ہیں اور کیا یہ بات نہایت ہی اہم نہیں کہ ممتحن کے سوالات کے جوابات لکھنے کے بجائے انسان اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کے اسراروں سے واقفیت حاصل کرے اور انہیں حل کرے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ موخرالذکر میں دنیاوی فوائد کے حاصل ہونے کی توقع ذرا کم ہوتی ہے۔

اگر تعلیم صرف ضروریات زندگی ہی کے لئے بلکہ عیش کے لئے بھی ہو، اگر تعلیم صرف دنیوی کامیابیوں ہی کے لئے نہیں بلکہ مسرت وانبساط کے لئے بھی ہو، اگر تعلیم صرف نقالی ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنے مطالب بھی ادا کرنے کے لئے ہو، اگر تعلیم صرف اگلے لئے بھی ویسی ہی ہو جیسے کہ دنیا کے لئے ہے، اگر تعلیم سے انسان کو اپنی ہستی معلوم کرنے میں اتنی ہی سہولت ہو جتنی کہ ملازمت میں ہوتی ہے، اگر تعلیم صداقت اور دانشمندی کیلئے بھی اتنی ہی ہو جتنی کہ ظاہری واقعات کے لئے ہوتی ہے، اگر تعلیم روح کے لئے بھی ویسی ہی

جیسی کہ دماغ کے لئے ہوتی ہے، تو پھر آنے والی نسل زندگی میں ضرور کامیاب ہوگی لیکن ہماری تعلیم میں صرف کہیں کہیں اور کبھی کبھی ہیجان ہوتا ہے ورنہ اکثر اس میں سکون رہتا ہے۔ جس تعلیم میں توجہ صرف دماغ ہی کے لئے ہوتی ہے وہ جذبات کو بیکار کر دیتی ہے اور تعلق صرف جسم ہی سے رہ جاتا ہے۔ لیکن جذبات کی اہمیت دماغ سے زیادہ ہوتی ہے اور جسم سے بھی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اگر جذبات کی صحیح تعلیم ہوتی تو آج دنیا کے نہایت ہی معرکتہ الآرا مسئلے کبھی کے ختم ہو گئے ہوتے۔ جذبات کی صحیح تعلیم سے اخوت و اتحاد کرم و رحم، امن و امان کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ جذبات کے اتحاد کے بغیر دماغ میں سختی اور کوتاہ نظری پیدا ہو جاتی ہے جس طرح سے کہ دماغ کے اتحاد کے بغیر جذبات میں بے ترتیبی اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔ میری تمنا ہے کہ دماغ جذبات اور جسم کو آزادی حاصل رہے تاکہ صحیح آزادی جو شاندار جذبات سے مملو رہتی ہے وہ حاصل ہو جائے اس کے حاصل کرنے کے لئے تعلیم ضروری ہے تاکہ انسان کے دل شریفانہ جذبات سے لبریز ہوں اور اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور مصیبت زدوں سے ہمدردی کا اظہار کر سکے۔

ان باتوں کے بیان کے بعد کیا اب میں ہندوستان کی تعلیم کی طرف توجہ کر سکتا ہوں۔ دنیا کا کوئی ملک ہندوستان سے بڑھ کر شاندار فضا پیش نہیں کر سکتا۔ یہ وہی ملک ہے جو تعلیم کا گہوارہ رہ چکا ہے اور یہ وہی جگہ ہے جہاں سلف کے تعلیمی کارنامے جو تعلیمی ترقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے متجسس کی نظروں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر آپ اپنی نگاہ ان سر بفلک پہاڑوں پر ڈالیں جو ہندوستان کو گھیرے ہوئے ہیں تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ ہندوستان میں کس قسم کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ میرا یہ کہنا شاعرانہ تخیل نہ ہوگا کہ باعظمت ہمالیہ ہی میں زندۂ جاوید ہندوستان کی زندگی اور تعلیم کی کلید پوشیدہ ہے۔

ہندوستان نے اس کے اصول کو اپنے سینوں کے اندر رکھا اور اب پھر وہ وقت آرہا ہے کہ مردہ ہندوستان دیپک کی طرح اپنی خاک سے دوبارہ پیدا ہو کر دنیا کو اپنی خوش الحانی سے محو حیرت کر دے گا۔ ہمیں مغرب سے اپنی تعلیم کے لئے تخیل اور اتحاد کا طالب

نہ ہونا چاہیئے اور نہ ہی صداقت کا ہمیں اس بات کو قطعاً بھول جانا چاہیئے کہ مغرب مشرق کے لئے ایک اچھا نمونہ ہوگا۔ بیرونی تعلیمی اصول سے دنیا کے کسی ملک کے نوجوانوں نے صحیح معنون میں علم میں ترقی حاصل نہیں کی۔ ہندوستان کو وہی تعلیم چاہیئے جو ہندوستانی تخیل ہندوستانی جوش ہندوستانی زور ہندوستانی مساوات ہندوستانی سادگی، ہندستانی مطالب اور ہندوستانی زندگی سے مالامال ہو۔ اور ایسی ہی تعلیم ہوگی جس سے کہ ہندوستان ترقی کر سکے گا موجودہ حالات کے تحت یہ باتیں ایک خواب سے بڑھ کر اہمیت نہیں رکھتیں آپ نے میرے خطبہ کو ایک مایوس کن اور ناقابل عمل پایا ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ جب تک انسان آرزو نہیں کرتا جب تک اس کے دل میں تمنا پیدا نہیں ہوتی، اور جب تک وہ شدت کے ساتھ کسی چیز کا خواستگار نہیں ہوتا اس وقت تک وہ کامیابی کی ضرورت نہیں دیکھ سکتا۔ آج آپ اور ہم ایک نہایت دلفریب خواب دیکھتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کی اصلیت ایک خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتی لیکن بہت ممکن ہے کہ آنے والی نسل ہمارے خوابوں کو بلکہ ان سے بھی زیادہ شاندار خوابوں کو عملی جامہ پہنائے

(اقتباس)

مترجمہ ابو تراب محمد احمد صاحب

مدرس مدرسہ وسطانیہ منجل گوڑہ

مدرسہ صنعت و حرفت مکتھل

مہتمم صاحب ضلع محبوب نگر نے بتاریخ ۱۸؍بہمن ۱۳۳۸ف مدرسہ صنعت و حرفت مکتھل کا معائنہ کیا۔ اس مدرسہ کی خصوصیت یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ پارچہ بافی، نجاری اور دیگر حرفتوں کے سیکھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے لئے علٰحدہ مکان علٰحدہ اسٹاف اور علٰحدہ سامان موجود ہے۔ لڑکوں کی بنائی ہوئی اشیاء، مدرسہ کی ایک الماری میں برائے فروخت رکھی گئی ہیں۔ یہاں کمبل اچھی تیار ہوتی ہے۔ قمیص کے کپڑے سوزنیاں، نوال، نوار، نجاری میں میز، کرسیاں، پلنگ وغیرہ خصوصاً سفری پلنگ بہت سستے دام ملتے ہیں یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولوی سید قاسم صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ مکتھل بحیثیت منتظم مدرسہ صنعت و حرفت بلا معاوضہ اس اہم کام کو انجام دے رہے ہیں۔ یہ نہایت منتظم اور جفاکش فرد ہیں۔ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ مدرسہ اس قدر ترقی کر رہا ہے۔

دار المطالعہ محمودیہ بیدر

محمد عبد السلام صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ اعلیٰحضرت بندگانعالی سلطان العلوم خسرو دکن نواب میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے سفر دہلی کی یادگار میں بمقام مدرسہ محمودیہ (مدرسہ محمود گاواں) ایک دار المطالعہ کا افتتاح عالیجناب مولوی سید محمد حسین صاحب بی اے (آکسن) ناظم تعلیمات ملک سرکار عالی نے بتاریخ ۱۴؍دے ۱۳۳۸ف فرمایا ہے۔

جلسہ سالانہ مدرسہ مستعدپورہ

مدرسہ وسطانیہ مستعدپورہ کا سالانہ جلسہ عمارت مدرسہ میں بتاریخ ۳۰؍بہمن ۱۳۳۸ف بصدارت جناب مولا بخش صاحب مددگار ناظم جنگلات سرکار عالی منعقد ہوا۔ طلبہ کے والدین اور معزز مقامی اشخاص نے بھی بطور خود شرکت فرمائی۔ کارروائی جلسہ کا آغاز تقریباً ساڑھے ۵ بجے شام کے بعد ہوا۔ عالیجناب صدر نشین صاحب نے رپورٹ کے بعض اہم حصوں پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ تعداد طلباء میں جو توفیر بتلائی گئی ہے۔

مثلاً مڈل میں فلاں سنہ میں اسقدر طلبار شریک امتحان کیے گئے۔ اور اس قدر کامیاب ہوئے درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتلانا چاہیئے تھا کہ سکنڈ فارم اور فرسٹ فارم میں کتنے طلبا، اس وقت ایسے موجود ہیں جو تھرڈ فارم میں آنے کے قابل ہیں۔ اور انہیں اس کا اہل بھی بنایا گیا ہے یا نہیں۔ ہنوز جتنی تعداد طلبار ہونی چاہیئے تھیں ہوئی یعنی تعلیم یافتہ طبقہ نے اس قدر ترقی نہیں کی جس قدر حکومت چاہتی ہے اور روپیہ صرف کر رہی ہے!

عالیجناب صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ نے صدر نشین صاحب کے تجاویز اور مفید تحریکات کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ حالیہ رپورٹ معائنہ مدرسہ سے پتہ چل سکتا ہے کہ جماعت سکنڈ فارم اور فرسٹ فارم میں طلبار کی اہلیت طمانیت بخش ہوتی جا رہی ہے۔ موصوف نے اس سلسلہ میں سررشتہ تعلیمات کی ان کوششوں کا بھی ذکر کیا جن کا تعلق طلبار کی فراغت تعلیم کے بعد کسب معاش سے ہے۔ مثال کے طور پر مڈل کامیاب طلبار اگر ٹائپ رائٹنگ وغیرہ سیکھنا چاہیں تو اوس کے متعلق سررشتہ نے سہولتیں مہیا کر دی ہیں۔

لنگوافون سینما کی طرح گراموفون سے بھی تعلیمی کام لیا جانے لگا ہے۔ جدید رجحان یہ ہے کہ میکانیکی آلات جہاں جہاں ممکن ہو سکے استعمال کیے جائیں۔ اگراموفون انگلستان کے مدارس میں کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں اور ان سے بجد فائدہ ہونچ رہا ہے۔ غیر زبانوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص قسم کے ریکارڈ تیار کیے گئے ہیں جن کو "لنگوافون" کہتے ہیں ہندوستانی مدارس میں یہ لنگوافون غیر معمولی طور پر کارآمد ثابت ہونگے خصوصاً انگریزی لب و لہجہ اور تلفظ سکھانے میں ان کی فائدہ رسانی لاانتہا ہو گی۔

تنقید و تبصرہ

ابتدائی مدارس ہند میں تعلیم۔ یہ چھوٹی سی کتاب مس کوری گارڈن صاحبہ کی تالیف کا ترجمہ ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مضمون کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ایک ماہر فن تعلیم سے لکھوایا گیا ہے جو ہندوستانی حالات سے بخوبی واقف ہیں اور یہ نصاب ٹریننگ کالج کے طلبا کے واسطے لکھی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ امتحان معلمی کے پرچوں کا جواب دینے میں یہ کتاب نہایت مفید و ممد ہوگی۔ عام مدرسین کیلئے بھی جو طریقۂ تعلیم کا ذائقہ چکھنا چاہتے ہیں یہ کتاب کار آمد ہے۔ ترجمہ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے لائق لکچرار مولوی مہدی حسن صاحب زبیری بی اے۔ بی ٹی (علیگ) نے نہایت پاکیزہ اور سلیس اردو میں کیا ہے جس سے اس کی قدر و قیمت دو بالا ہوگئی ہے اگر مترجم صاحب مقامی لحاظ سے اس میں تعلیم اردو پر ایک باب کا اضافہ کر دیتے تو زیادہ مناسب ہوتا بصورت موجودہ بھی یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مدرسہ اور ہر مدرس کے کتب خانہ میں رہے۔

قیمت صرف ۸/ سکہ عثمانیہ ہے اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے ملسکتی ہے

مبادئ نباتات نباتات کے متعلق ۲۰ صفحات کا رسالہ ہے جس میں ابتدائی اصول سیدھی سادھی اور عام فہم زبان میں سمجھائے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب اس یقین کے ساتھ لکھی ہے کہ اردو زبان میں کوئی دوسرا رسالہ نباتات کے متعلق نہیں ہے۔ اگر انھوں نے انجمن ترقی اردو کے شائع کردہ رسالہ نباتات کا مطالعہ کر کے اس کی کوتاہیوں کی تلافی اور تحقیقات جدیدہ کا اضافہ کیا ہوتا تو یہ کتاب زیادہ نفع بخش ہوتی۔ بہرحال اردو زبان کو ہر موضوع پر متعدد کتابوں کی ضرورت ہے کسی موضوع پر نئی کتابیں قند مکرر کا لطف دیتی ہیں ہمیں یقین ہے کہ مسٹر مگموہن لال صاحب جیتر ویدی بی ایس سی۔ ایل ٹی۔ لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج کی یہ تصنیف قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی

ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

is by putting into their work all the energy and zeal that they can and by thus helping him in the noble task of organising education on the soundest possible lines in this State.

Editorial.

Mr. Fazl Mohamed Khan's Message to Hyderabad Teachers.

We publish elsewhere a message to the Hyderabad Teachers from Mr. Khan Fazl Mohamed Khan, M.A. (Cantab), who assumed charge of the office of Director of Public Instruction, Hyderabad Deccan, on the 16th December, 1928. We feel sure that they will fully reciprocate the feelings of friendship and goodwill to which he has given expression. By his sincerity of purpose, sympathy and administrative ability, Mr. Fazl Mohamed Khan had already won their esteem and affection during his career as Deputy-Director of Public Instruction from 1919 to 1924. We know that they are all very pleased that he has come back to guide the destinies of the Education Department. We may confidently expect that under his directorship not only will the progress achieved during the time of Nawab Masood Jung Bahadur be maintained, but improvements will be introduced in our system of education, which while making literacy general, will at the same time provide an education for each pupil for which he or she is best fitted. The questions of compulsory primary education and vocational education have been under the consideration of Government for a long time. Another important question is that of the re-organisation of high school education, which was discussed at length at the last Conference of the Hyderabad Teachers' Association. There is also a pressing need for the introduction of medical inspection of schools. One may safely depend upon Mr. Fazl Mohamed Khan for a proper solution of all these problems. But, needless to say, the success of whatever reforms are introduced in our system of education will depend ultimately upon the co-operation of the teachers. We are therefore of the opinion that the best answer which the teachers can give to the extremely sympathetic message which Mr. Khan Fazl Mohamed Khan has addressed them

2.	City College	.... Schools' Tug-of-war and High School "B" Individual Championship.
3.	Darul-Uloom	.... Primary "A" Shuttle Relay. Primary "B" Individual Championship. Primary "B" Championship.
1.	Nampalli H. S.	.... Primary "A" Individual Championship.
1.	Mahboob College	.... High School "A" Individual Champion ship.

There were two ties in the following two events:—

(1) High School "A" Individual Championship between Chaderghat and Mahboob College

2. Primarj "A" Championship between Darululoom and Chadarghat

Hyderabad Teachers' Association.

The Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association will be held on Thursday and Friday, 4th and 5th July 1929. Members intending to move any resolution or to read any paper at the Conference are requested to inform by the 26th March, 1929 Mr. G. Prakash Rao, M.A., L.T., Assistant, Darululoom High School and Secretary of the Programme Committee.

Members of the Education Department, professors and lecturers in colleges and others engaged in educational work can join the Association by paying O. S. Rs. 4 a year, which will include their subscription for the *Hyderabad Teacher.*

Mr. V. V. Hardikar, Head-Master, Vivek Vardhini Patashala, represented the Hyderabad Teachers' Association at the fourth Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations held in Bombay in November, 1928. An account of the Conference from his pen will appear in our next issue.

progress which the school had made in various directions in recent years. He remarked that it was a significant fact that though the school began as a communal school and was still conducted by a committee whose members were Hindus, the majority of the pupils were Mussalmans. It showed that Hyderabad could still be proud of its traditions of Hindu-Muslim unity. Referring to the request of the School Management for an increase in the grant-in-aid, he said that the Education Department was always willing to help schools which helped themselves. He then discussed the advantages of the proposed scheme for the amalgamation of the Osmania Matriculation and High School Leaving Certificate courses of studies and expressed the opinion that the scheme, when sanctioned, would prove very beneficial to schools like the Mufidul Anam High School.

With a vote of thanks to the Chair, the proceedings were brought to a conclusion.

Inter-Collegiate and Inter-schools Athletic Sports at Hyderabad Deccan.

The preliminary events of the annual inter-collegiate and inter-school athletic sports were held at the Fateh Maidan on the 24th and 25th January and the Finals on the 1st February, 1929. The sports were a great success, on which we congratulate Mr. L. M. Mookerjee, Honorary Secretary, Sports Committee, and Mr. S. M. Hadi, Honorary Secretary, Hyderabad Athletic Association. His Excellency the Maharajah Sir Kishen Pershad Bahadur, G. C. I. E., gave away the prizes at the conclusion of the sports on 1st February. The following are the results:—

1. Osmania College .... Tug of war (Colleges)
2. Nizam College .... Relay, Championship and Individual Championship.
3. Chaderghat High School .... High Schol Relay Championship and Individual Championship.
   Middle School Championship.
   Primary School do

The first prize distribution ceremony of the Mufidul Anam High School, Hyderabad Deccan, was held on Friday the 7th December 1928 under the chairmanship of Mr. Syed Ali Akbar, M. A., (Cantab.), the Divisional Inspector of Schools.

The Mufidul Anam High School Prize Distribution.

The programme began with opening of the Educational Exhibition organised by the Head-Master for the occasion. Among the exhibits were historical and geographical charts which had been prepared with great care and precision. The Head-Master, Mr. K. P. Shastri, B. A., L. T., read an interesting report tracing the growth of the school from the year 1880 A. D. He said that the school was originally a communal one, but its doors had subsequently been opened to students of all sections and creeds, and now it had more than 300 pupils on its rolls. In 1927 the management decided to convert the school into an English High School. Greater attention was now being paid to physical education. The scout troop of the school won a cup for bridge building in the inter-troop competition organised recently by the Boy Scout Head-Quarters. The Literary Association, the honour-badge competition and similar other activities were helping to promote an *esprit de corps* among the boys. Attempts were also being made to secure the co-operation of the parents. A Teachers' Association had been started, which by giving opportunities for the discussion of various questions connected with the school and organising demonstration lessons, was gradually leading to the introduction of improved methods of teaching. In the end, the Head-Master drew attention to the need for starting a Provident Fund and also appealed to the public for funds to enable the Management to improve the library and the kindergarten section of the school.

After giving away the prizes, the Chairman congratulated the Head-Master and the Management on the good

days they worked for nationalism, now they were working for internationalism. The experiences of the war and its after effects had gone a great way in broadening the outlook of students on life. They were tending to be more spiritualistic and less materialistic.

Mr. Henriod related his experiences of student life in the various parts of the world. He remarked that students, whether they were Africans, Americans or Japanese, were now anxious to know of the good points in the culture of one another and were working for the promotion of goodwill and co-operation among the different nations. He incidentally referred to the Floating Universities of America, where bands of earnest students and sympathetic and broadminded professors were undertaking tours in other countries with the object of obtaining first-hand knowledge of their culture. The students of Central Europe were occupying, as it were, a middle position between the culture of Western Europe on the one hand and that of the Eastern Greek Orthodox Church on the other. The gulf between these two systems of thought was being gradually bridged over. There had recently been a general awakening of the spiritual and moral consciousness among all the students including women. They now thought more of social service than of political agitation. He had noticed that similar changes were coming over India. It had given him pleasure to find that in the Indian schools and colleges students of different nationalities moved on terms of harmony and friendship. He urged them to work for the common good of the motherland in a spirit of mutual love and co-operation. The country's future was in their hands, and he appealed to them to make the best use of the opportunities they had for furthering the cause of world-peace.

The Chairman in his concluding remarks thanked the distinguished visitors for their instructive addresses.

---

other and feel that they are not members of warring creeds but all citizens of one great nation. In teaching religion, sciènce, history and humanity need not bé neglected. The claims of religion and science should as far as possible be reconciled. It is necessary to distinguish between essentials and non-essentials and from this point of view it will be found that all religions agree in their essentials. I do not object to special features of any particular religion being taught to pupils professing that religion, but I would like to emphasise that the teacher himself should be a man of culture and place insistence upon those common elements."

Sir P. S. Siwaswami Aiyar.

"Student-life in Central Europe and other parts of the World".

A meeting was held at the Nizam College on the 8th January, 1928 at which the speakers were Prof: J.L.Hromadka of the University of Prague, Czeco-Slovakia and Mr. H. L. Henriod, Secretary, World's Student Christian Federation, who both paid a short visit to Hyderabad after the termination of the annual conference of the Federation in Mysore. Mr. K. Burnett, M.A. (Oxon), occupied the chair. The subject of their addresses was "Student-life in Central Europe and other parts of the World". In the course of his address Professor Hromadka referred to the conditions of 'student life' prevailing in the pre-war period and compared them with those existing in modern times in Central Europe. He observed that the students before the great war of 1914 were taking an active part in politics, but now they paid greater attention to other aspects of life such as economic and social. The distinguished visitor pointed out that in Central Europe the problem of nationalities was a difficult one and the students were trying to bring about harmony and peace among the various nationalities by holding conferences and making a sympathetic study of the aspirations of the students of other nationalities. Whereas in pre-war

Abdulla Yusuf Ali said that the greatest problem in Indian education was that of moral education or character-building. He did not believe in the efficacy of schemes for moral education by text-books. He was afraid that moral instruction as a school subject would only add another subject for cramming. What was required was the supply of teachers with great force of character and personality. At the same time, Mr. Yusuf Ali recognised that this supply could not be hastened in a day and would itself depend on a more healthy and efficient system of education, including the education of women, the makers of the home. Religious education in the manner in which it had been tried in India would not solve the problem. Steps were not taken to organise it on right lines or to prepare teachers who could impart the true religious spirit and command the respect of their pupils by their character and modern attainments.

Character-building in Indian Schools.

We share Mr. Abdulla Yusuf Ali's views, but we think that outdoor games when they are played in the right spirit and Boy Scouting when it is conducted on sound lines can also help much in character-building in our schools.

"I have often pondered over the wisdom or otherwise of religion as a subject in courses of education in view of the frequent troubles arising in differences between one creed and another. The result of such pondering is that I now doubt very much whether it has done very much good to establish separate schools for Hindus and Muslims. By all means let the religion of each community be taught by members of their community, but the young men should be made to feel as members of one great nation, and such a result cannot be achieved by keeping them apart and training them in separate institutions. It is by the frequent opportunities likely to be provided in the school rooms, college halls and universities that young men can understand and appreciate each

Religious Instruction.

Notes & News.

As many senses as possible should be used in learning how to spell a word. While seeing the letters is better than hearing, the child should be required to see, spell and copy the word. Presenting the word singly gives a clearer and more definite impression of it than does its occurrence in a whole sentence, and to spell and pronounce words aloud is better than hearing them read. Polysyllabic words should be presented in syllables. Grouping words together that are similar in spelling is an advantage, as is also the calling of attention to the order of the letters and to double letters, silent letters, and vowels having the same sound as in *or* and *er*. The number of words which occur with sufficient frequency to justify regular drill in learning to spell them is surprisingly small. To learn to spell words that are used, rather than words that are difficult, offers therefore a solution of the problem as to what the school can do and what external requirements seek to impose. Dr. Boyd of Glasgow has selected and graded a list of 2400 common words which every boy and girl should be able to write down correctly.

English Spelling

The above is an extract from an interesting article which appeared recently in the *Times' Educational Supplement.* Bad spelling in the Indian schools, where English is generally a foreign language, is not infrequently due to the in-correct pronounciation of words. Therefore, in addition to paying attention to the above-mentioned suggestions, teachers of English in this country should always take care to see that the boys pronounce each word correctly and distinctly

---

Speaking at the Royal Asiatic Society, London, Mr.

regularly taught during its hours. Carpentry, basket-making, spinning, weaving, making of rubber stamps, fret-work on wood, engraving on metals, book-binding, rope-making, gardening are suggestive examples.

2. The money spent on a handicrafts department is partly recovered from the sale of articles made in it.

3. A handicraft exhibition every term or oftener will act as a stimulus.

4. The school scouts may be encouraged to qualify for their proficiency badges by working in the handicrafts work-shop of the school.

Conservatism and tradition are great obstacles, but they cannot stand against a bold determination to give our boys a good all-round training which will start them off on the way to becoming useful and honoured citizens of the country. The knowledge that he can use his hands as efficiently as his brain gives the boy that self-confidence and that resourcefulness which evolve the great nation-builder. The feeling of being able to "stand on his own legs" gives him a zest for life. He takes an intelligent interest in things and men; there is a brightness in his eye and a springiness in his step; he feels wonderfully alive. What cannot such a boy do for his country and—for the world!

they are as incomplete and one-sided as are our schools and colleges.

The young man who has had the advantage of a vocational training alongside his three R's, his histories and his sciences, approaches the end of his educational career with no uncertain step. He enters life with wonderful self-confidence. The question of a "job" does not worry him as it does a great majority of our boys now. The knowledge that he can turn his hand, if need be, to lucrative manual work gives him an independent and composed outlook on life. It is true that to a certain extent, sports and games cultivate in the student the spirit of meeting difficulties squarely and contending against them boldly; but lacking the necessray knowledge and skill, he fights against great odds. It is a pathetic sight to see a fine, athletic young man rushing about in search of a "job" in an office.

Manual work at the school furnishes him with a hobby at home. It is a notorious fact that most of our boys go home after school either to cram their lessons or to mope. And the devil is ever on the watch for idle hands and minds. A hobby keeps the boy out of mischief and provides him with that variety which is the very spice of life. At the end of the day he looks forward to his useful and pleasant activity.

The kindergarten system, as worked in the primary departments of most of our schools, is not a system at all. It is unmethodical, hap-hazard and unprofitable training. There is no regular, well-thought out syllabus and any teacher with a fancy for cutting paper or modelling clay is deputed to keep the children engaged during the "kindergarten period". If kindergarten work is carefully selected and graded, it could be imperceptibly raised to the dignity of manual training in the Middle and High Schools.

The following suggestions may be of interest.—

1. Every school should have two or more handicrafts

Need for Compulsory Manual Training in Schools

BY

P. VENKATESULU, B. A.,

Head Master, Wesleyan High School, Secunderabad.

IT is humourously said that our great savants are great "boobies" when it comes to the use of hands; that a brilliant graduate of our university can solve knotty problems in mathematics but feels helpless when he has to mend his pencil; that a profound student in philosphy can more easily perform abstruse mental gymnastics than tie his turban. It is, in a sense, true that the present system of education produces men whose intellect is well developed but who are helpless when forced to deal with the hard facts of life. It is this one-sided system that is in a great measure responsible for the woeful absence of great discoverers, of great industrialists, of great technical experts amongst us.

It is to correct and restrain the inordinate development of the brain at the cost of other parts of the body that all modern educational theories lay great stress on the cultivation of useful arts in schools and colleges. The Mysore Education Department is to be congratulated in that it has made a beginning in the practical application of these theories. It has introduced in many schools such useful handicrafts as carpentry and basket-making and in a few, weaving. These form a part of the usual routine of school-work and every boy has to undergo the training. Close association of mental with vocational training is the ideal which should be realised in all schools. A few detached so-called "Industrial schools" do not solve the problem;

grounds as well—a crying necessity in Hyderabad. Anyone who has seen the Victory playground in full swing could not but wish there were a dozen such in this great city to give facilities for the rising generation to express themselves in ways which must conduce to the developing of more efficient citizenship

The Beasley Committee appointed by the Government of Madras have stressed this matter of playgrounds in their official report, and have also laid down that all High school containing 250 pupils should have at least 5 acres of land for playing fields, and that Middle schools should have not less than 3 acres. Further, to be really effective, there must be absolute regularity in physical training or games. One hour or a period a week, is comparatively useless from the point of view of physical training; such training becomes far more effective if at least fifteen minutes be set aside for exercise everyday in order to insure continuity of exercise and development. The committee also recommend that if boys do not attend the playground they should be marked as absent for the whole day—a strong measure perhaps but one which at any rate may bring home to parents the attitude of the authorities regarding this important aspect of education.

If therefore the proposal is put into practice and adequate provision made along the lines indicated above for ensuring its success, a real national service will have been rendered to the country, for as one Assembly speaker aptly said "it is upon the foundation of a true manly spirit that the best chances of success of self Government rests."

5 or 6 hundred boys a score or more in the school teams can win trophies in competitions in no criterion that all the boys are catered for, unless the crack team really represents the apex of the physical educational pyramid whose base is the whole school. It is neither creditable nor really very beneficial for a school to keep a kind of gladiatorial team for school contests, especially when, as is often the case, such a team monopolises the playground to the exclusion of others.

The real value of such a compulsory measure however is not to be found on the physical plane only, but in the generally improved morale and outlook that the regular discipline of school sports and physical training engenders. There are certain virtues that can be learnt in *no other way* but in the rough and tumble of the playground and gymnastics. Pluck, endurance, learning to give way to others, to bear the burden of others, unselfishness, and training in responsibility and initiative are all the results of playground activity and of scouting also when the real scouting spirit is preserved. The spirit of the game is often of more value than the game itself, and it is here the real problem of compulsory education comes. The right attitude and spirit cannot be cultivated by merely fixing physical drill or games into the school time-table. This spirit does not come in a day but is the result of a slow process, which it is the business of the school staff generally, and the sports master and gymnastic instructor particularly, to develop. Teachers are often the product of the present system itself and trained physical instructors of the right type are extremely difficult to find, and so we seem to move in a vicious circle. The first essential therefore for the success of the scheme must be a training college for physical education where teachers and instructors may receive the best kind of physical education possible.

Another factor in the success of the scheme is the provision of playgrounds, not only for schools but public play-

Compulsory Physical Training in Schools

BY

REV. F. C. PHILIP, M. A.

Warden, St. George's Grammar School, Hyderabad Deccan.

THE proposal recently passed in the Legislative Assembly for compulsory physical training for all students in schools and colleges between the ages of 12 and 20 is a great step forward and should go a long way towards remedying "the defects in character training of Indian youths" as emphasised by the Skeen Committee.

The physical advantages that will accrue from the measure are self-evident. When carried into effect it should result in a definite raising of the physical stamina of the boys and indirectly, by its very emphasis, lift physical education from the somewhat spasmodic place it at present occupies to its rightful position in the general educational scheme.

In every school there are boys whose dislike for active exercise is prejudicial to their own health and to their subsequent efficiency as citizens. Others again, from lack of initiative or inexperience of games, do not care to participate in the playground activities. In each case a system of compulsory games and physical exercise is useful. In the first case a defect is corrected, and in the second case the child is led to discover for himself the enjoyment he has been missing and also a profitable way of spending his leisure time, and is far more likely, on leaving school, to employ his spare time in cricket, tennis or hockey, than in bazaar-loafing or in idle company generally.

Such a compulsory measure should also correct a tendency found in some schools to found their reputation for physical education and games on the expertness of the few and not on the average of the many. The fact that out of

shades or other means should be available to make this end possible.

(d) Ceilings and upper portions of the walls should be painted with a light colour to increase the effectiveness of the lighting facilities. The lower portion of the walls should be somewhat darker in tone to render the lighting restful for the eye.

Artificial lighting should be as under.

(*a*) Adequate illumination should be provided from overhead lamps so that sharp shadows may be prevented as much as possible. Individual lamps close to the work should be unnecessary except in special cases.

(*b*) In addition to the illumination provided by overhead lamps, individual lamps should be placed close to the work in those cases where the work is very fine or otherwise trying to the eyes. In such cases the lamps should be provided with suitable reflectors.

Colour of walls and buildings:—The colour and quality of finish of the walls and ceilings of an interior are factors of primary importance in illumination whether natural or artificial. This is particularly true where indirect or semi-indirect lighting systems are used, for in these cases the efficiency of the system depends almost entirely upon the reflecting ability of the walls and ceilings.

The colour should be such as to reflect a high percenttage of the light while at the same time it is not trying to the eyes. For this reason very light tints have been found more satisfactory than white. Also the decorative value of light shades should not be overlooked.

The surface finish of the paint is important, for if too glossy it may cause reflected glare, no matter what the colour. A lustreless surface largely eliminates the possibility of glare and effects a more even distribution of the light.

glare due to the large volume of light rather than the high brightness of the sky.

Location in the field of view.—A given light source may be located at too short a distance from the eye or it may lie too near the centre of the field of vision for comfort. The natural position of the eye during intervals of rest from any kind of work is slightly below the horizontal, and it is desirable that during such periods, it should be freed from the annoying glare. Glare becomes more objectionable the more nearly the light source approaches the direct line of sight. While at work the eye is usually directed at an angle below the horizontal. Glaring objects at or below the horizontal should especially be prohibited. The best way to keep light sources out of the direct line is to locate them well up towards the ceiling. Local lamps, that is, lamps placed close to the work, if used at all, must be particularly well shaded.

Contrast with back ground.—The contrast may be too great between the light source and its darker surroundings. It is a common experience that a lamp viewed against a dark wall is far more trying to the eyes than when its surroundings appear relatively light.

Time of exposure.—Those who are forced to work all day facing windows in badly planned offices or artificial illumination are particularly likely to suffer from this form of glare.

The natural lighting shou d be as under.

(a). The light should be adequate for each person using it.

(b). The windows should be so spread and located that daylight conditions are fairly uniform over the entire room.

(c) The windows should provide a quality of daylight which will avoid glare due to the sun's rays and light from the sky shining directly into the eye, or where this does not prove to be the case during all parts of the day, window

having too much artificial light on a working surface, provided the contrast of the brightness with the darker surrounding is not so great as to cause glare.

Recorded intensities of daylight range from several thousands foot-candles out-doors on a sunny day to a fraction of a foot-candle in an interior on a cloudy day. Recommended intensities for artificial lighting range from less than one to twenty foot-candles, depending upon the use to be made of the lighting.

Distribution of light:—By distribution of light is meant an even intensity of illumination over a wide area. Satisfactorily uniform lighting of all parts of a room can be secured by properly locating and controlling the light sources. There should be no sharp contrast and no direct light shining in the eyes.

Diffusion of light:—The proper diffusion of light, *i. e.*, breaking up the direct rays of light so as to avoid glare from the light source or from reflecting surfaces, is a difficult problem to solve satisfactorily. Diffusion is secured by shades and other devices at the windows and by reflectors, shades, globes on lamps.

Glare:—Glare is one of the most annoying and insidious causes of eye-strain. It is due to incorrect lighting. It may be defined as any brightness within the field of vision of such a character as to cause discomfort, annoyance, interference with vision or eye-fatigue. It is one of the most common and serious faults of lighting installations. Glare is objectionable because it tends to injure vision and to disturb the nervous system; it causes discomfort and fatigue and thus reduces the efficiency of the worker; it interferes with clear vision and increases the risk of accident.

Causes of Glare:—Brightness of source. *i. e.*, The light source may be too bright.

Total volume of light:—The light source may be too powerful for comfort. An unshaded window often causes

centuries. In 1859 the American Petroleum Company was started and since then Kerosine oil has been introduced throughout the world. In 1879 Edison invented his first electric lamp.

Kinds of lighting :—Natural lighting, *i. e.*, daylight—that light which comes from the sun, generally by reflection. Artificial lighting, *i. e.*, that light which is produced by man for use in the absence of the sun's light.

Electric lighting is divided into three systems:—

1. *Direct lighting:*—Most of the light from the lamp is thrown directly upon the space to be lighted either by means of a reflector with an open bottom or through various kinds of diffusing glassware.

2. *Indirect lighting.*—All the light from the lamp reaches the working space indirectly by reflection from the ceiling and upper walls. This is accomplished by an opaque reflector directing the light upwards.

3. *Semi-indirect lighting:*—There are many combinations of direct and indirect lighting by which part of the light is directed upwards to the ceiling and the remainder reaches the working space directly.

Eye-strain :—May be caused by either natural or artificial light. Either may be too bright, or improperly directed, thus causing glare, or there may not be enough light to see properly. It is therefore necessary to consider three important elements of lighting *viz*:—1. The amount of illumination;—2. The distribution of light; 3 The diffusion of light.

Amount of Illumination:—In order that an object may be seen satisfactorily a certain minimum amount of light must fall upon it, or, in other words, it must have adequate illumination. This effect of light upon a surface is spoken of as the "intensity" or the amount of illumination and is measured in foot-candles. There is not much danger of

for the long life and prosperity of our gracious and august Sovereign, H. E. H. Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur and the members of the Royal family.

Illumination

BY

DR. K. P. POPAT.

VISION only occurs when light enters the eyes; therefore the closest relationship exists between the problems of illumination and eye-sight conservation. The rapid development in recent years of the lighting art has placed unusual and unnatural demands upon the eye by extending the time during which the eye can be used for near work. If lighting had not been discovered our school children would not have been obliged to study at night and 25% of our school children in the higher standards would not have defective vision. The eye, which through ages has become adapted to distant vision by roaming and hunting in fields and jungles under the natural light of the sun, has not been able to adjust itself to the increased demands placed upon it by modern civilization requiring children at a tender age to study in artificial light. If then, light is of such paramount importance, it follows that everyone who aspires to be a good citizen, should possess at least a knowledge of the fundamentals of good lighting.

Development of the lighting art:—Lighting is one of the oldest arts, but until recently has been one of the slowest to develop. One can safely say that in the past half century there has been more development in lighting than in all the ages since man first lighted his way by a piece of burning wood. The crude lamps and candles served as the only forms of artificial illumination for

bring down the price of text-books as much as possible. The resolution was carried.

After this, Moulana Sait Yaqub Hasan of Madras delivered a well-thought-out and brilliant lecture on " Hindustani Culture " in Urdu

When the Conference re-assembled after tea, Mr. Mohamed Muzhar moved a resolution suggesting the establishment of branches of the Education Conference in the various districts with the object of helping the poor and deserving students with books and scholarships. After being supported by Mr. Mohamed Ahmed, the resolution was carried. The resolutions passed at the previous sessions of the Conference were then reaffirmed. Dr. Abdul Latif next read an interesting paper on " What is a true University "? In the course of the paper, he said that a University was a seat of learning where distinguished men from all parts of the world met. He thought that the aim of a University was not to propagate knowledge so much as to increase it and it was not a machine for manufacturing graduates. It was, in his opinion, a sacred solemn temple where the devotees of the Muses gathered with the desire of acquiring knowledge. Dr. Latif remarked that an up-to-date library was necessary for a good University. He also expressed the opinion that only those should be admitted to the university who have a genuine desire to prosecute, and who have a liking for, higher studies. After the evening prayers, Mr. Gulam Ahmad Khan, Collector of Nalgunda District, moved a resolution urging the need for periodical medical inspection of children attending village schools. In the course of his speech he described his own personal experiences of the health of boys in the village schools which he had visited as Collector of the Nalgunda District. Hakim Maqsood Ali Khan Saheb seconded the resolution, which was carried.

After Nawab Sadar Yar Jung Bahadur's concluding speech, the conference came to a close with fervent prayers

to frame a suitable curriculum. This resolution was carried unanimously.

Mr. Mohamad Abdul Razaq Chida read a lengthy paper on "Local Bards", in which he extolled the poetic works of Nawab Nizamat Jung Bahadur, Mrs. Sarojini Naidu and others. While he spoke, a number of people present at the Conference who were not acquainted with English were seen yawning in their chairs. It was a great relief to them when Mr. Babu Lalit Mohan Mukerji moved his resolution urging the need for the extension of industrial and technological education in the Dominions, which was ably supported by Mr. Mohd. Bahadur in a spirited speech.

After lunch, the proceedings began with a lecture by Mr. Mahmood Alam on "Western Civilization and India". This over, in the absence of Mr. Hashimi, Mr. Khursheed Ali moved a resolution recommending that in view of the general poverty of the students measures should be adopted for the supply of text-books and other educational requisites to students at a low price. The resolution was supported by Mr. Fazlulla of the Urdu Circulating Library fame. One of the students of the College, Mohd. Faruq, pointed out that it was a pity that the books compiled by Mr. Hashmi were themselves very costly and desired that the original mover of the resolution should first practise before he preached. As some of his statements were misleading and unfounded, Mr. Abdur Rahman Khan, Principal, Osmania College, and Nawab Haji Fakhar Yar Jung Bahadur had to speak on the resolution. Mr. Abdur Rahman Khan pointed out that the difficulty experienced here was being felt all the world over and Hyderabad was no exception to it. He gave the example of a book on mathematics published recently in a number of volumes costing 12s. (*i. e.* about B. G. Rs. 9/-) per volume. Nawab Fakhar Yar Jung Bahadur assured the audience that the aim of the Syndicate was not to realise any profit. The Government had been trying their best to

On the 12th January the Honorary Secretary of the Conference, Mr. Syed Kursheed Ali, read his formal annual report, giving the details of the work done by the Conference during the past year. The report having been adopted, the 1st resolution of the session regarding the collection of funds for instituting a memorial to the late Moulana Murtaza, the founder and zealous Honorary Secretary of the Conference, was moved by Mr. Husain Abdul Muneem and supported by Mr. Mirza Mohamed Beg. In this connection, the President of the Conference described the good qualities of head and heart possessed by the late Moulana Murtaza and made a stirring appeal to the public for funds, which had an immediate respond from some of the gentlemen present.

Moulvi Hisamuddin Saheb Fazil then delivered an eloquent and instructive lecture on "Knowlege and practice". He said: "The mere passing of examinations is not the sole aim of education, and a man cannot be called educated in the real sense of the word unless he has got a good character and leads a clear and upright life. It is necessary that moral education should be included in the curriculum of our schools. We need knowledge not so much to memorize but to put it into practice". Mr. Hisamuddin also dwelt on the importance of religious instruction in the schools.

Nawab Nazir Yar Jung Bahadur then moved his resolution on female education, which was supported by Mr. Meer Akbar Ali Khan, Barrister-at-Law. The able proposer showed by facts and figures how essential it was for us to devise a course for girls which would suit the local conditions and enable them to discharge their domestic duties properly. He rightly said that the type of education imparted to girls in India to-day was not in the best interests of the country and he therefore appealed to the Government to institute a Committee of Enquiry to inquire into the obstacles in the way of the progress of female education and

Troop Bazaar. After this Nawab Fakhar Yar Jung Bahadur, Chairman of the Reception Committee, delivered a short welcome address and proposed Nawab Sadar Yar Jung Bahadur to the chair. Mr. Mohamad Asghar, Bar-at-Law, seconded the proposal in a brief and witty speech. Nawab Sadar Yar Jung Bahadur then took the chair amidst applause and delivered his presidential address. The learned President described the achievements of the Osmania University and the Translation Bureau and paid a tribute to Nawab Masood Jung Bahadur, the retired Director of Public Instruction, for the great progress which the Educational Department had made under his directorship. He emphasised the need for the formation of useful public reading rooms and libraries for combating ignorance. At the same time, he deplored the condition of some of the private libraries where some valuable and rare books were being destroyed by white ants. Referring to the Circular of the Educational Department regarding private schools, he expressed the opinion that in enforcing certain restrictions on private institutions and bringing them within the purview and control of the Department of Public Instruction, Government had acted with the best of intentions, as they were anxious that children attending private institutions should be educated properly. He said, "So far as I can see there is nothing in the regulations which might hamper the management of the Muktabs on correct lines, and this point has been clearly stressed in the instructions issued by the Department to their Inspectors and other officials". It is to be hoped that in view of the precautions which the Education Department has taken to see that the above-mentioned circular does not in any way discourage private effort in education, the misunderstandings to which it has given rise will soon disappear.

After the presidential address, Mr. Shabeer Husain Khan Josh read an Urdu poem in his usual felicitous style.

the examination, should be able to proceed straight to the Intermediate course.

The provision of a special course to meet their special requirements should provide an impetus to such girls as would otherwise stop at the Middle school stage to continue their studies. Some of these girls may find themselves unable to attend schools because of social and economic circumstances. They should be permitted to appear as private candidates. It should be the aim, however, to give instruction to them in those subjects in schools. Some selected schools, either those already preparing candidates for the Matriculation Examination or Middle schools exceptionally situated in regard to supervision and staff, may be entrusted with the new course. The experiment, it is hoped, will justify a general extension along the lines suggested.

Hyderabad Educational Conference

BY

S. M. KHAIRATH ALI.

Assistant Divl. Inspr. of Schools, Hd. Qrs. Hyderabad Dn.

The ninth session of the Hyderabad Educational Conference came off on the 11th and 12th January, 1929 at the Town Hall, Hyderabad Deccan, under the presidentship of Nawab Sadar Yar Jung Bahadur, Sadrus Sudur, Ecclesiastical Department of H. E. H. the Nizam's Government. Among those present were Nawab Zulqadar Jung Bahadur, the then Home Secretary, Mr. Khan Fazl Mohamad Khan, Director of Public Instruction, Nawab Fakhar Yar Jung Bahadur, Financial Secretary and Moulana. Sait Yakub Hasan of Madras. The proceedings began with a hymn recited by the students of Anjuman-i-Khadimul Muslemeen,

(*c*) Algebra and Geometry.

(*d*) History of England.

N. B:—Should it be considered necessary to make Indian History and Geography compulsory, then 8 and 9 may be made alternatives.

In all subjects common to this special course and groups A and B, the syllabus of studies and the papers set should be the same as in groups A. and B. In preparing the syllabuses for the other subjects, the aim should be to keep them at the same level as subjects of groups A and B.

There will be at least two points of criticism, firstly, that the curriculum consists of 8 subjects against the 7 and 6 of Groups A and B. But the numbering should not mislead. English which is admittedly the most difficult subject of the Matriculation course has been largely reduced. Arithmetic takes the place of mathematics and 4 and 6 are subjects which appeal to the interest of girls and are therefore learnt easily. The curriculum suggested is neither more nor less difficult than the curricula in Groups A and B. A second point of criticism will be, that English is given a subordinate place. That criticism has already been answered in discussing the Urdu Middle School Examination. Translation to and from English is made compulsory. Should candidates who pass in this special curriculum desire to proceed to the Intermediate classes, they may be required to appear in English of Groups A and B as those who have passed the Moulvi and Munshi Examinations are now required to.

Those girls who have passed the English Middle School Examination at present take up the alternative A and B Groups. If the special curriculum is considered suitable for girls then these candidates may be permitted to take the English of Groups A and B and the other subjects of the special curriculum, except that instead of any two of 7, 8 and 9, they may take only one. These students, on passing

Mahratti, Telugu, Kanarese, Tamil,

French, German, Latin & Greek.

N. B :—Students taking Group A will have to undergo training in Elementary Science in the Matriculation class for 3 hours a week and girls in Domestic Science. There will however be no university examination in these subjects.

There is practically no difference in the course of studies for boys and girls. The high standard of English demanded places these groups out of the reach of girls who have passed the Urdu Middle School Examination.

I venture to suggest a special alternative course for girl candidates.

Special course for Girl candidates.

1. English—translation to and from English of simple passages of the Middle School standard.

2. Urdu.

3. Arithmetic.

4. (*a*) Domestic Science and Hygiene.

   (*b*) House crafts: Cookery and Needlework (Theory and Practice).

5. Theology or Morals.

6. Any *one* of the following :—

   (*a*) Drawing (*b*) Painting (*c*) Music.

   Any *two* of the following :—

7. History of India and Geography.

8. One of the following languages :—

   Persian, Arabic, Sanskrit, Mahratti, Telugu, Tamil and Kanarese ;

9. One of the following :—

(*a*) Elementary Botany & Natural History of Animals.

(*b*) Elementary Science.

there should be a reform in the curricula of Girls' education, may be kept in mind. Her Highness the Begum Sahiba of Bhopal's remarks regarding this matter in her presidential address to the second session of the All India Women's Conference on Educational Reform, are worth quoting. Talking about educational problems she says, "The foremost among them is the question of a suitable syllabus for girls, a question which has for a long time been under the consideration of those who are looked upon as leaders of thought in that respect, but it is a pity that nothing has been done so far. A certain controversy seems to be going on as to whether the instruction of girls should proceed on the very same lines as that of boys or whether there should be one system for boys and another for girls. There are some who favour an identical course for both, while there are others who will keep the two systems totally distinct from each other. Personally I am inclined to think of both the points of view as the two extremes to be avoided. I would chalk out a *via media* for the conduct of Women's Education".

In preparing our syllabus, we may bear these matters in mind. The regulations of the Matriculation Examination now in force provide two alternative groups of subjects :—

Group A.	Group B.
1. English.	1. English.
2. Urdu.	2. Urdu.
3. Elementary Mathematics.	3. Advanced Mathematics.
4. History of India & Geography.	4. History of India & Geography.
5. Theology or Morals.	5. Theology or Morals.
6. One of the following :— (i) History of England or (ii) One of the following languages :— Arabic, Persian, Sanskrit,	6. Science.

instruction, are beyond their ability, as the smattering of English that is acquired by these students is hardly worth mentioning. There is then no higher course to which they are admitted. It cannot be thought a satisfactory condition of affairs if further educational advance is blocked at this early stage.

Teaching is perhaps the only field open to girls who wish to earn a livelihood. In the Training Schools for girls they indeed receive further education, but it is clear that that does not solve the problem of the girls who have passed the Urdu Middle School Examination.

One solution would be to scrap this examination, insist on English and carry the students through the Matriculation course. But that seems a little premature. I shall leave it those responsible for the introduction of the Urdu Middle School Examination to explain at full their reasons for holding this examination. In the case of girls the following reasons seem to possess sufficient force to retain the examination. The circumstances of the majority of the class which takes the Urdu Middle School course are such that it is too much to hope that they will learn English up to the standard required. Those who are in touch with the teaching of English to this class of girls will, I believe, bear me out. Parents of this class of students also believe that considering their circumstances, English is only a luxury which their children need not indulge in. The preference for the Urdu Middle School course is a practical proof of this.

If the Urdu Middle School Examination is to be retained—and it must be retained at any rate, for girls—in fairness to these students, a course equivalent to the matriculation course, but with a curriculum suited to candidates who have passed the Urdu Middle School Examination, should be provided to enable them to continue their studies.

In providing this course, the persistent and reasonable demand made by well-wishers of Women's Education that

some sort of 'eye-powder' and made his son's eyes the worse for it. It may take some time before we overcome carelessness and obstinacy of the parents. Still, the work of the Medical Inspector of Schools will never be in vain. His advent in the field of education will be a welcome change and mark a new epoch in the history of education in our Dominions.

The financial aspect of the question is, no doubt, a difficult one. It may be confidently expected that no same parent will grudge sharing the burden, if, at all, it is a burden. A time will come when the parents will fully realise the ultimate benefits of the system. Our own Government, which so liberally spends 74 lacs a year on Education, will not hesitate to add a few thousands to this expenditure for the benefit of school-children. Needless to say, the cause of the child is the cause of the nation. We teachers have to prepare the ground for the introduction of medical inspection of schools, which we may be sure, will be organised in the near future.

Secondary Education of Girls in the State: A Suggestion

BY

MRS. P. V. SEBASTIAN, B. A., L. T.,

Head Mistress, Central Zenana Training School, Hyderabad-Dn.

MANY of the Middle schools for girls in this state prepare students for the Urdu Middle School Examination. The position of these students as regards their future education needs to be considered. As things stand, they are in a blind alley. They cannot move forward. The Osmania Matriculation course with English as a compulsory subject, and the H. S. L. C. course where English is the medium of

(iv) No cases of pyorrhea were detected, though the teeth in the lowest class were found to be 'unclean' and in need of greater care.

Detection of Defects.

In the campaign to relieve school-children of their physical handicaps, the first step is the detection of the defects. Before the advent of a Medical Inspector of Schools, the teachers themselves can safely carry on the preliminary work. If a teacher finds that a boy in the back row cannot read what is written on the black-board, or a boy holds a book too near his eyes or misses words or lines while reading, one may be sure that the boy's eyesight is defective. A specially prepared chart is available for about Rs. 3/- to test the index of vision and any intelligent teacher can make a fairly accurate use of the same. To detect cases either of hyper-metropia or myopia is not, after all, a very difficult task. The following causes that tend to produce eye-strain are noteworthy :—

(i) Improper illumination (ii) Glare from the windows or glazed paper (iii) Improper seating (iv) the use of badly printed books (v) Wrong position of the black boards (vi) Drawing pictures or figures in ill-lighted rooms (vii) Tedious and vexatious 'Home-work' and (viii) Frequent Visits to the cheap Cinema-Houses, (ix) Defective posture of the body while reading.

It is to be hoped that the school-architects and the printers of school-books will devise effective means for reducing the eye-strain to a minimum. The defects of the teeth, the nose and the throat can also be easily detected. When once these defects are noted and confirmed by the Medical Inspector of Schools, the guardians should be communicated with and currative treatment should be started. It is, however, possible that illiterate or recalcitrant parents might neglect the cases or make them worse by the use of quack remedies. I know of a case where a father fondly applied

At the welcome suggestion of the Divisional Inspector of Schools, Hyderabad Deccan, I made arrangements recently for the medical inspection of the boys of my school. Dr. Hari Gopal, L. M. S., kindly volunteered to conduct the inspection during his leisure periods. In all, nearly 100 boys were examined and the results obtained were rather instructive, though melancholy. They are briefly as follows:—

(i) The subjective tests of the eyesight showed that the higher the class the greater was the percentage of defective vision. The abnormal vision recorded showed 15% in the lowest class and 28% in the highest. If the refactory errors noted are corrected early by the supply of suitable glasses, it would add to the happiness of the children concerned.

(ii) There is a close relation between defective vision and school-progress. The following table relates its own unhappy tale:—

Classification of boys.	Of defective health in general.	Of defective vision in particular.
1. The Dull	75%	24%
2. The Normal	73%	25%
3. The Bright	68%	29%

Eyesight is seen growing worse among the bright boys. Defective general health is perhaps responsible for the dullness of the 'dull' boys.

(iii) The diseases of the throat and the nose were very common. Cases of polypus of the nose and pharyngitis were also detected. These were supposed to be due to the boys living in insanitary dwellings and, in certain cases, to the habit of smoking. If these be attended to in early life, the general health of the boys must improve.

considerably impaired. When there is a general deterioratation of the physical capacity, the earning power of an individual is bound to decrease and those children who ought to be national assets will continue to drag on a miserable existence as social parasites. With the decline of 'Child-power', 'man-power' must also necessarily decline. The relentless law of the 'survival of the fittest' will come into operation. A decaying race can neither be expected to have a place in the comity of nations nor to keep pace with the march of progress in other civilised countries. Happily, however, there are clear indications that the educationists in this country have already become keenly alive to the paramount need for improving the physical condition of the school-going children. Physical training is becoming a necessary adjunct to school as well as university education. Every important school can now boast of a drill-master and every province of a director of physical education.

But unless and until systematic efforts are made to conduct periodical medical inspections of the Primary and the Secondary schools, not much good can result. If the physical defects in a boy or a girl be allowed to remain undetected and no preventive measures be adopted, the work of the drill-master will be easily undone. We admit that that there may be some congenital defects, but we can not afford to shut our eyes to such environmental influences as tend to produce functional disturbances in the different organs of the body and thereby make the boys or girls physically unfit for school-work in the beginning and for professional work in their later careers. We, therefore, cannot conceive of a school-problem more important than the problem of medical inspection of schools. It is a momentous question, in the solution of which the co-operation of not only the school-master and the Medical Inspector of Schools is needed but also of the parents, of the school-architect and, for the matter of that, of the printers of school-books.

in framing the details of syllabuses and in the methods of teaching is reported to have largely contributed to the efficiency of teaching".

A Few Observations on Medical Inspection of Schools

BY

G. A. CHANDAVARKAR, M. A.,

Head-Master, Residency Middle School, Hyderabad-Dn.

IT is almost a truism to say that educational advancement is the basis of all progress. The needs of extending the benefits of education to one and all are so keenly felt that compulsory education is being gradually introduced all over India. But if we persist in the archaic methods of imparting education, and while making education free and compulsory, neglect the physical well-being of the school-going population, we may be introducing 'compulsory diseases' also. For there can be no denying the fact that at present among the majority of our boys in the schools, there are many physical disabilities which are remediable but through sheer neglect continue to work slow but sure mischief. Equally incontrovertible is the fact that with a little care in the beginning many serious consequences can be averted. If preventive measures be not adopted in time to check the growth of the diseases common among the school-children, it is to be feared that to the already existing keen 'problem of the unemployed', we may be adding one more distressing 'problem of the unemployable' owing to the physical unfitness of the coming generations. Again, the productive capacity of the nation as a whole will be

to sacrifice the interests of the students to save himself from an unpleasant situation. In the latter case, it may be possible for the teacher to complete in six months or even earlier the task appointed for eight months and to use the remaining two months for a thorough and detailed revision; but inasmuch as his work has already been defined for him, there will be no inducement for him to do this, there being no scope for individuality. Again, as regards English, the readers for the lower classes have not their lessons graded in respect of difficulty, and consequently the teacher finds that he cannot follow the book order. Accordingly, he has to make his own selections and that not all at once, for, at the completion of each lesson he has to consult the capacity of the students in the selection of the next lesson. Again, it is worth noting that during the early part of the educational year progress is bound to be slow and that any attempt to fix the monthly portion is merely futile. It is simply ridiculous on the part of a teacher who may be a matriculate, an intermediate or a graduate to be told that he cannot adjust his own work without a board, showing the divisions of his work, always staring him in the face.

There are other measures of a similar nature which will be dealt with subsequently. It deserves to be noted that all such measures, while claiming to minutely guage the teacher's work, cut at the root of real education by obliging even efficient and sincere workers to make a show of work quite against their own conscience. It must be evident from the above considerations that mechanical tests are detrimental to the interest of the taught and that the sooner they are discarded, the better for our school children. It is high time that trust and freedom were restored to their place in the field of education. I shall conclude this article with the following lines from the article, 'Education in Liverpool' published in October last. "The enlightened policy adopted by the Education Committee, in recruiting well trained teachers and giving much freedom to teachers

"The good steed, grievously fatigued with so long a day's journey under a rider cased in mail had no sooner found by the slackened reins that he was abandoned to his own guidance than he assumed new strength and spirit; whereas formerly he had scarce replied to the spur, otherwise than by a groan, he now, as if proud of the confidence reposed in him, pricked up his ears and assumed of his own accord a more lively motion".

It is a principle of universal acceptance that the teacher should make one point clear and impressive before proceeding to the next, and accordingly progress depends on the pace with which the students follow the teacher and this, again, is influenced by the discretion exercised in the matter of admissions and promotions. In case the teacher finds that he cannot, without prejudice to the interests of the taught, complete the year's task in time, he will do only as much as can be well grasped by the students. And if he should have more than average interest in the children, he will arrange for private classes to get the task completed, as is usually the case. But if, instead of leaving the teacher to his own plan and guidance, the details of his work are definitely marked out for him, and if failure to follow the scheme to the very letter involves him in trouble, the teacher, however sincere and interested he may be, will run through the work without heed to the understanding of the children, for he realises that sincerity does not pay and feels that as a member of a respectable profession, he must have regard for his self-respect. It must be noted that this is the state of affairs where the method under discussion has been in operation. The measure tests the progress of the teacher but not of the taught.

Further, there are certain other defects inherent in the measure. It so happens that in a certain year a teacher gets a dull set of boys and in another a bright set. In the former case, insistence on the measure will drive the teacher

Recognising the educational value of the study of music and the Fine Arts as an important factor in character building, I am strongly of opinion that these subjects should be introduced in all schools and colleges.

Anomalies of the School System

BY

K. NARAYAN RAO. B. A., L. T.

Assistant, Government High School, Medak.

IN this article I propose to discuss the efficacy of one of the educational measures which has found its way into our school system during recent times. The question is: how to test the work of a teacher and provide against neglect of duty on his part? The usual method is to have the year's work apportioned into monthly instalments, to insist on the strict observance of the plan and to call for explanation in case of failure. This method sounds very sensible no doubt, in-as-much as it seems to guarantee the completion of the work alloted for the year, but how far it has really proved a success is open to question.

On investigation it appears that this method is mainly inspired by want of confidence in the teacher's sense of duty and that it ignores the basic principle of teaching and the elements of human psychology. It is well-known that trust begets sincerity and that suspicion is father to many vices. The magical effect of freedom as an incentive to effort has not been sufficiently realised in the educational field. This feeling is innate not only in human beings but also in some intelligent animals. The following lines of Sir Walter Scott will illustrate this point :

and arithmetic, and her opinion was endorsed by those present.

It is the duty of the State to provide systems of education which should develop the powers of every child in the best possible way, and the place the teaching of music and of the Arts should occupy in such systems is a question of much importance. Should we look upon music, for instance, as a pastime or should we recognise and use it as a very potential factor in character building?

First, let us consider what is music—Dr. Frotter thus defines it: "Music is the art, by means of musical sounds in rhythmic motion, which can convey feeling and emotional state and sentiments". It is the most useful of all the arts for the expression of the part of our nature that lies beneath the surface; it is the language of the inner nature and in its highest form expresses the deepest feelings of which we are capable.

If the function of education is to foster growth, as Mr. Edward Holmer says, then music is a most important educational element, for it tends to idealise emotion and to promote high aspirations. It stimulates the feeling for beauty latent in each of us, and its power is of the greatest service in education as it is in perpetual conflict with the materialism which is fostered by the educational systems of the present day.

The teaching of music is of real importance in developing the spiritual tide of the nature of a child and in encouraging it to expand in free self-expression. An art which springs mainly from a desire for self-expression can have only this effect.

Plato considered that music had an immense influence on the character and that it was the duty of the law-giver to regulate its study. Aristotle also recognised that it had an important place in Education and that its study should be strictly supervised.

why should we argue differently, when reflection leads us to see in a Universe declared to be 'everywhere alive', the manifestations of a Supreme Mind?

The matters raised in this brief paper are very familiar to students of Indian philosophy, which established contact with Mediterranean thought two thousand years ago, and found its culmination in the minds and mystical experiences of the men we call Neo-Platonists. I have purposely not alluded to Indian dogma concerning the soul, to which there are references in the valuable presidential address to the Philosopy Section of the recent Oriental Conference at Lahore. This address of Prof. Surendranath Das Gupta is reproduced in the *Modern Review* for January 1929.

The Place of Music in Education*

BY

MISS A. POPE

Principal, Zenana Nampalli College, Hyderabad-Deccan.

THIS subject is very near my heart, for I have been an ardent lover and student of music all my life and my experience has taught me to appreciate its educational value.

At the World Federation of Education Associations, which I had the honour of attending last year in Toronto, Mrs Francis Clark read a most interesting paper on "The Golden Age of the Desire for Music", in which she said that music had become the fourth necessity in complete living, following food, shelter, and clothing, as well as the fourth "R" in Education, parallel and equal to reading, writing

*A speech delivered at the Fourth Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations held in Bombay in November, 1928.

culture: the classical world of Greece and Rome was for long complacently disposed of by pedagogic divines, and we have only to look at H. J. Wells' treatment of Islam in his Outline of History for a notorious example. It takes the rarer kind of energy that has produced such works as *The Golden Bough* to rectify this and start human thought on new roads.

It is the soul that guards against preoccupation with problems that have no meaning. History is full of examples of energy wasted on such problems and on futile forms of iconoclasm. The volatile people of the sunlands, who can talk unceasingly but have little power of decision, prefer the raising of a problem to the sweeping away of cobwebs. Common sense is merely another term for a faculty attained by the soul over against the mind, by insight into values, on high levels as well as low. A good deal of modern philosophy is exalted common sense: Pragmatism and Creative Evolution are forms of compromise which abstract thought has taken under the pressure of advance in applied knowledge, especially in science. An excellent example of philosophical thinking reverting from subtlety to common sense is to be found in the following passage from Professor James Ward's *Naturalism and Agnosticism.*

"Why should appearances not be reality? Nay, what else can they be? How can reality appear, shine forth, and get remain totally and forever beyond the knowledge of those to whom it appears? Let us turn, as we have done before, to the case we know best,—the communication of one human mind with another. Assuming good faith, we never regard a man's acts and utterances as masking, but rather as manifesting the man. If they mask when it is his intention to deceive, surely they cannot also work when his intentions are the precise opposite. These acts and utterances may be beyond the comprehension of men on a lower intellectual level, and with narrower horizons, but they are not the less real or true on that account. And

One of the best descriptions of the working of intuition as a function was written before much of contemporary philosophy which lays such stress on this point, and by a poet Whitman:

"There is, apart from mere intellect, in the make-up of every superior human identity, a wondrous something that realizes without argument, frequently without what is called education (though I think it is the goal and apex of all education deserving the name),—an intuition of the absolute balance, in time and space, of the whole of this multifariousness, and general settledness, we called the world; a soul-sight of that divine clue and unseen thread which holds the whole congeries of things, all history and time, and all events, however trivial, however momentous, like a leashed dog in the hand of the hunter. Of such soul-sight and root-centre for the mind mere optimism explains only the surface".

Another poet, Sir Henry Newbolt, speaks ardently of "a return to the way of intuition, to rapture, to direct swift vision: to a more instinctive joy at the sound of every voice from the 'Land of Heart's Desire".

The soul waits on the labours of the mind, keeping watch, by what we call moral principles, on the kind and nature of those labours, guarding against futility and degradation, and all that may pervert the personality. And it is the soul that knows that the mind itself, the armoury of the pioneers of thought, may be affected by its labour or by the material in which it is labouring, and suffer strange transformations. The mentality of a Chinaman is incomprehensible to a Swede, that of a Russian to an Englishman. The problems that face a thoughtful Hindu are not those of the American citizen, and all along the history of the world our difficulty of comprehension is increased by inability to see and understand the problems which were the preoccupation of men. Even encyclopaedic works are vitiated by the application of contemporary values to past

Intuition, as a psychological term, is illustrated in many ways, and many of its operations do seem to mark what we regard as the soul rather than the mind.

It has been said that all the great discoveries of science and solutions in mathematics have been the result of 'floods of intuition, after long brooding in the mind'. Also that what is called the higher dimensional aspect of life does not lend itself to rational analysis, but can only be divined by the intuition.

All these are branchings of a conviction that is very old. Four centuries before Christ a Chinese thinker, whom the world would call mystic, said: "Those alone who are guided by their intuitions find the true standards".

And this is corroborated by testimony from the mind of another Oriental, Moses Maimonides, whose precious thoughts are too little known, except as they live in the minds of those who were his real disciples.

"Intuiton means so high a degree of imagination that a thing will appear to a man as vividly as if he saw it present and perceptible to the sense; and in such man, we say, dwells the spirit of the most high God".

Truly he might have been speaking of the soul, as our modern writers when they say that deep knowledge is of the immediate type, and that our intuitions are the source of all our other knowledge of truth.

It has been suggested, as above, that these intuitions may be the result of secret labour of thought, just as further East they say that we admire the calm beauty of the floating bird, but we cannot see the unceasing toil of its feet. But it is precisely there that the division comes, if division is possible between operations so intimate and organic. The soul, from one point of view, is a unity, the indivisible unity to which we refer when we speak of memory, imagination, heroism, love, eternity and the Divine.

Lucretius has a passage in which he declares the mind to be more essential to life than the soul.

"The mind is more the keeper of the fastnesses of life, more the monarch of life than the power of the soul. For without the mind and understanding no part of the soul can hold out in the frame for a tiny moment of time, but follows in its train without demur, and deserts the chill frame in the frost of death".

These words seem to foreshadow, though in a very meagre way, the distinction we have in Bergson's thought between intuition and intelligence. Instinct has for him, indeed, many of the qualities we attribute to soul. It is, he says, sympathy, the feeling of intimate union with a reality. It is that which enables us to enter into a work of art as an indivisible whole, as distinct from regarding it as external and taking sectional views of it. He goes further and says that the intuition of life is knowledge of reality as it is in itself. Intellect, on the other hand, is given us for the sake of action, and "gives us the same advantage over intuition that the material tool gives to us as compared with the organic tool that the instinct possesses".

Bergson further claims that our knowledge rests on a form of intuition which is never purely intellectual, that this intuition is " of the very nature of life, and the intellect is formed from it by life". This is, of course, not original, for it was said long ago by Plotinus, tersely and suggestively :

"Knowledge has three degrees,—opinion, science, illumination. The means and instrument of the first is sense, of the second dialectic, of the third intuition. To the last I subordinate reason. It is absolute knowledge, founded on the identity of the mind knowing with the object known".

So intellect gives us the sciences, and the sense of order in our life, " the articulation that serves our activity ".

Thoughts on Soul and Mind

BY

E. E. SPEIGHT

Professor of English, Osmania University.

THE relations of the soul to consciousness are many and close. We can know that we have a soul, but this, says a devout writer, is only possible on the loss of innocence.

And our soul can reprove us for the wrong use and direction of our consciousness. There are times when the soul seems one with conscience, and times when its enthusiasm is aroused by the advance of intelligence. The difficulty of stating the difference between the soul and the mere intelligence is probably connected with the fact that the soul includes more than consciousness in its qualities. While consciousness has only the matter immediately presented before it, the soul is able to draw upon inexhaustible resources of intermingling unconscious psychical states, what Bergson means when he declares spirit to be "the memory which holds the past and unites it with the present in the living reality". It is an extraordinarily difficult matter, one in which no existing system of notation or symbols can help us. Wise men of poetical imagination like Plato are content to suggest what cannot be made explicit. It was our English Platonist Henry Vaughan, the contemporary of Milton, who wrote:

> And yet as Angels in some brighter dreams
>   Call to the Soul, when man doth sleep,
> So some strange thoughts transcend our wonted themes,
>   And into glory peep.

It is just these strange thoughts which are the sure indication of the stirring of the soul, and so we call them transcendental.

Message to Hyderabad Teachers

FROM

KHAN FAZL MOHAMED KHAN, Esq., M. A. (Cantab),

The New Director of Public Instruction,

H. E. H. The Nizam's Dominions.

I had the good fortune to be a Hyderabad Teacher once and I am proud to consider myself to be one still. I am fortunate enough to return to Hyderabad to serve the Hyderabad Teachers, their Department and this great State. I have feelings of the greatest friendship and sympathy for the Hyderabad Teachers and I wish them all success in their noble work. I send this message of friendship and sympathy to them through their esteemed organ "The Hyderabad Teacher".

3-4-38 F. **Fazl Mohamed Khan.**

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

	PAGE.
MESSAGE TO HYDERABAD TEACHERS FROM KHAN FAZL MOHAMED KHAN, M.A., (CANTAB:), THE NEW DIRECTOR OF PUBLIC INSTRUCTION, HYDERABAD DECCAN	120
THOUGHTS ON SOUL AND MIND BY E. E. SPEIGHT, PROFESSOR OF ENGLISH, OSMANIA UNIVERSITY	121
THE PLACE OF MUSIC IN EDUCATION BY MISS A. POPE, PRINCIPAL, ZENANA NAMPALLI COLLEGE, HYDERABAD - DECCAN	126
ANOMALIES OF THE SCHOOL SYSTEM BY K. NARAYAN RAO, B.A., L.T., ASSISTANT, GOVERNMENT HIGH SCHOOL, MEDAK	128
A FEW OBSERVATIONS ON MEDICAL INSPECTION OF SCHOOLS BY G. A. CHANDAVARKAR, M.A., HEAD-MASTER, RESIDENCY MIDDLE SCHOOL, HYDERABAD - DECCAN	131
SECONDARY EDUCATION OF GIRLS IN THE STATE: A SUGGESTION YB MRS. P. V. SEBASTIAN, B. A., L. T., HEAD MISTRESS, CENTRAL ZENANA TRAINING SCHOOL, HYDERABAD - DN	135
HYDERABAD EDUCATIONAL CONFERENCE BY S. M. KHAIRATH ALI, ASSISTANT DIVISIONAL INSPECTOR OF SCHOOLS, HD: QRS:, HYDERABAD - DECCAN	140
ILLUMINATION BY DR. K. P. POPAT	145
COMPULSORY PHYSICAL TRAINING IN SCHOOLS BY REV. F. C. PHILIP, M.A., WARDEN, ST. GEORGE'S GRAMMAR SCHOOL, HYDERABAD - DECCAN	150
NEED FOR COMPULSORY MANUAL TRAINING IN SCHOOLS BY P. VENKATESULU, B.A., HEAD - MASTER, WESLEYAN HIGH SCHOOL, SECUNDERABAD - DECCAN	153
NOTES AND NEWS	156
EDITORIAL	163

HOW TO TELL EYE-STRAIN.

If eyes water, burn, itch, frown, twitch squint, giddiness, headaches, nervousness, depression, fatigue, irritability of temper, hysteria, epilepsy, neurasthenia, letters blur and swim, drowsiness on reading, disinclination to read long, truancy, waywardness, backwardness in study, holding books in the abnormal position as shown above.

The above symptoms if unheeded reduce the victim to ill health, pitiful state of nerves, inefficiency and ugly pained, blinking, winking and tired look through falling off the lashes, dark rings and wrinkles round the watery red eyes, with thick lids.

The above **symptoms are S. O. S. messages** (seek optical service) to the sufferer who being too young to realise the danger, parents schoolmasters and eye-specialists in England and America are by Educational Act appointed to look to their eyes with a view to relieve the above mentioned symptoms, which cripple the mental, moral and physical health of a certain proportion of all school children.

Many a child with defective vision (inability to read the school-board correctly) **went through school called a dunce** whereas he was simply at a disadvantage with the other bright children because of his eyes.

It is common experience with observant teachers to find some pupils drowsy and yawning by 2 p. m. owing to the nerve exhaustion due to waste of nervous energy through the eyes and under the circumstances **it is criminally harmful to make the child work mentally as it leads to the above mentioned disorders of the nerves** hard to remedy afterwards.

The above symptoms enable the teacher to find out easily the victims of eye-strain **who should be made to sit nearer the school-board to avoid eye-strain.**

Children are now supplied with splintanil lenses. (Splinter-proof lenses) which do not splinter when broken, hence in case of accident a great boon to children who play games with the glasses.

HARDY & Co.,

Opticians & Oculists (London)

124, James Street, Secunderabad.

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. III.] January, 1929 A. D. Isfandar, 1338 Fasli. [No. 3.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A. (Cantab)
Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A. (Cantab.)

F. C. PHILLIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN,
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1929.

Single Copy Annas 12. (Postage Extra).

جلد ۲ رجسٹری شدہ شہر سرکار عالی نمبر ۴ شمارہ ۴

خورداد ۱۳۳۵ف مطابق اپریل ۱۹۲۶ء

زیر سرپرستی جناب خان فضل محمد خان صاحب ایم۔ اے ناظم تعلیمات ممالک محروسۂ سرکار عالی

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذۂ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

دائرہ ادارت:۔

سید علی اکبر ایم۔ اے۔ (کنٹب) مدیر مسئول
سید فخرالحسن طا۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) مدیر
عبدالنور صدیقی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) شریک مدیر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع دفتر مہتممی تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو پیدا کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔
(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا۔
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۲ روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

صرف اُردو حصہ (عہ ۱۴ ر) فی پرچہ اردو و انگریزی (۱۲ ار) صرف اردو (۸ ر)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اُردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکے گا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم سے متعلق ہوں۔
(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔
(س) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	لـــہ	صہ ۸ ر	سے
نصف صفحہ	صہ	عـال ۱۲ ار	عہ ۸ ر
ربع صفحہ	عـال ۸ ر	صہ ۶ ر	۱۵ ر
فی سطر	۱۰ ر	۸ ر	۶ ر

حیدرآباد ٹیچر

بابتہ ماہ خورداد ۱۳۳۸ف م اپریل ۱۹۲۹ء

جلد ۳ فہرست شمارہ ۴

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	افتتاحیہ		۱
۲	فلسفۂ عمل	جناب نواب سر امین جنگ بہادر	۳
۳	علم و عمل	جناب مولوی محمد حسام الدین صاحب فاضل	۵
۴	تربیت	جناب محمد محسن خاں صاحب متین مدرس فارسی مدرسہ وسطانیہ مستعد پورہ	۱۴
۵	مدرس کی آواز	جناب عبدالشکور صاحب بی۔ اے مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل	۲۲
۶	طلبہ کی ہڑتال	جناب ڈاکٹر جی ایس کرشنیا صاحب پروفیسر تعلیم جامعہ میسور مترجمہ جناب حفیظ اللہ میر صاحب مدرس مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ	۲۶
۷	کم استعداد طلبہ کا مسئلہ نفسیاتی نظر سے	جناب محمد صدیق صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی (علیگ) صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ مستعد پورہ	۳۲
۸	تعلیم ورزش جسمانی	جناب سید مسعود الحسن صاحب بی اے بی ٹی مدرس سٹی کالج بلدہ	۴۰
۹	رپورٹ کمیٹی تعلیم جسمانی بمدارس ثانویہ مدارس		۴۸
۱۰	شذرات		۵۷

افتتاحیہ

سرکار عالی کی دریادلی سے بیشمار نادار طلبہ وظیفے پارہے ہیں لیکن ضوابط وظائف کچھ ایسے ہیں کہ بچوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچتا اور جو تحریص و ترغیب مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتی۔ شاہی مدارس میں عموماً دو قسم کے وظائف دئے جاتے ہیں۔ رعایتی اور ترغیبی ایک اعتبار سے رعایتی وظیفے پانے والے لڑکے ترغیبی وظیفہ پابوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بعض اوقات تو زیادہ مقدار میں وظیفہ ملتا ہے کم از کم جو رقم نامزد ہو جاتی ہے وہ پوری ایصال ہوتی ہے۔ برخلاف ان کے ترغیبی وظائف کی مقدار حالانکہ صرف ۵ ماہانہ ہے لیکن سوائے چند مخصوص مدارس کے بقیہ مدارس میں شاذ ہی پوری رقم منظور ہوتی ہے اور فی کس بمشکل دو روپیہ ماہانہ پڑتے ہیں۔ ہر وظیفہ خوار لڑکے کو پوری فیس ادا کرنی ہوتی ہے اور چونکہ وظیفہ ماہ بماہ ایصال نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے اس لئے ایک طرف تو ان غریبوں کو ماہانہ فیس ادا کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے اور دوسری طرف جو قلیل رقم ان کو ملتی ہے اس میں سے بھی عموماً آدھا یا تہائی حصہ بادائی فیس وضع ہو جاتا ہے اور پس ماندہ رقم ان کی دوسری ضروریات مثلاً فراہمی کتب ولباس وغیرہ کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہوتی۔ مزید برآں وظیفہ اکثر کئی کئی مہینہ کا یکمشت دیا جاتا ہے اس لئے اس کا ترغیبی اثر باقی نہیں رہتا بچوں کو یہ بھی ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو کس قدر وظیفہ ملے گا اور کب ملے گا۔ ان کے نزدیک وظیفہ کی رقم بالکل غیر متوقع ہوتی ہے اور دفعتاً ہاتھ آجاتی ہے اور بے موقع ملتی ہے اور بیجا صرف ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں لڑکوں کو وظیفہ کا خیال بھی نہیں رہتا اور وہ اکثر دوسرے بچوں کی طرح بلا درخواست غیر حاضر ہو جاتے ہیں یا استحقاق سے زیادہ رخصت حاصل کر لیتے ہیں اور جب تقسیم وظائف کا وقت آتا ہے تو وظیفہ کا معتدبہ حصہ وضع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب کسی طالب علم کا نام وظیفہ ترغیبی کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے تو بعض لڑکوں سے پوری فیس ہر ماہ طلب کی جاتی ہے کیونکہ ضابطہ یہی چاہتا ہے اور بیچارے ان کو بڑی دقت پیش آتی ہے

اگر نہیں تو اکٹھا فیس لینے سے حسابی پیچیدگیاں واقع ہوتی ہیں۔ اگر ماہانہ وظیفہ تقسیم ہو تو یہ موریں ہرگز پیدا نہ ہوں۔ ایک اور دشواری یہ ہے کہ نئی جماعتوں میں لڑکے امرداد میں آجاتے ہیں اور وظیفہ کا آغاز آبان یا آذر سے ہوتا ہے اس لئے اول سالانہ امتحان جس کی بنا پر ترغیبی وظیفوں کے لئے نام پیش ہوتے ہیں یا رعایتی وظایف کے لئے سفارش کی جاتی ہے وہ دور ہو جاتا ہے اور لڑکے علت و معلول میں تعلق نہیں دیکھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی سال کے آغاز میں بچوں کو کتب درسی وغیرہ کی فراہمی کے لئے غیر معمولی اخراجات کا سامنا کرنا ہوتا ہے اس لئے ایسے زمانہ میں ان کو وظیفہ نہ دینا گویا وظیفہ کے حقیقی مقصد کو فوت کرنا ہے بنا برایں ہماری رائے میں مناسب ہوگا کہ (۱) وظائف امرداد تا تیر کے لئے اجرا ہوں اور سہ ماہی و ششماہی کا قصہ ختم کر دیا جائے (۲) ہر مدرسہ کے واسطے جس قدر رقم مشخص ہو اس کی منظوری اواخر امرداد میں صدر مدرسین کے پاس آجائے تاکہ وہ پہلے تعلیمی مہینہ ہی سے وظائف ایصال کرنے لگیں (۳) وظائف ترغیبی کی پوری رقم منظور ہوا کرے (۴) چونکہ وظائف کی مقدار بہت قلیل ہوتی ہے اور یہ وظائف ان لڑکوں کو دئے جاتے ہیں جو بہت غریب ہوتے ہیں اس لئے وظیفہ یابوں کی فیس لازمی نہ کی جائے بلکہ صدر مدرس کی صوابدید پر چھوڑ دی جائے۔

ہمیں قوی اُمید ہے کہ ارباب عطائے وظائف ان بیکسوں کی طرف توجہ ضرور مبذول فرمائیں گے۔

فلسفۂ عمل

خطبۂ صدارت نواب سر امین جنگ بہادر

میں پروفیسر جیمس اور موسیو برگسان کے مانند فلسفۂ عمل کا قائل ہوں اور قرآن مجید میں وہ انجیل عمل پاتا ہوں جو مژدۂ حیات جاودانی ہے علم و عمل توام ہیں لیکن عمل مقدم اور علم اس کا معادل ہے دونوں حیات انسانی کی توسیع و تکمیل کے لئے لازم و ملزوم

ہیں ہر آدمی کے کردار نیک یا بد" وہی ہیں جو اُس کو اُس کے ماحول کے موافق زیادہ یا کم بناتے ہیں۔ لیکن جو چیز نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور جو چیز بدی سے باز رکھتی ہے وہ علم ہے اور علم کے سوا اور کوئی چیز نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ پس حیات انسان کی ایزاد و بہبودی کے واسطے اعمال نیک کا سلسلہ یعنے کردار نیک لابد و لازم ہے۔ کردار نیک کا رہنما علم ہے۔ اسی لئے کردار نیک کے خاطر جس قدر زیادہ علم ہو اس قدر بہتر ہے۔ ہم سب سیکھنے کے لئے ہی جیتے ہیں" مگر کون سا علم حاصل کرنے میں ہم اپنی عمر صرف کرتے ہیں؟ ہر شخص کو کس علم کا طالب عمر بھر رہنا چاہیئے؟ محض وہی علم نہیں جو کتابوں یا رسالوں کے مطالعہ سے یا اساتذہ کے لکچروں سے یا تجربہ خانوں کی آزمائشوں سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ اس قسم کا علم جس کو میں فقط نام کے واسطے "تدریسی علم" کہوں گا، نہایت اہم و ضروری ہے لیکن صرف اسی قسم کا علم اغراض حیات کے لئے کافی نہیں بلکہ ایک اور قسم کا علم بھی ہے جسکو میں "اکتسابی علم" کہوں گا، جو تدریسی علم سے بدرجہا اہم اور زیادہ ضروری ہے البتہ تدریسی علم بہترین واسطہ ہے (مگر واسطہ ہی ہے) اس اکتسابی علم کا جو ہر کس و ناکس کے روزمرہ زندگانی کے لئے جلب منفعت و دفع مضرت کے واسطے، راحت پانے اور آفت سے بچنے کے خاطر، درکار بلکہ ناگزیر ہے۔ "اکتسابی علم" ہر شخص، اپنے ماحول کے حالات سے اپنے سامنے گذرتے ہوئے واقعات سے، اپنے مشابہ اشخاص کی خاصیات سے اپنے پرائے مشاہدات سے خود اپنے جد و جہد کے تجربات سے حاصل کرتا ہے۔ اسی اکتسابی علم کی تعلیم مادام الحیات جاری رہتی ہے۔ اسی علم کی تعلیم ہر شخص اپنے آپ کو دے لیتا ہے اور اسی کا متعلم عمر بھر رہتا ہے۔ اسی کا وہ جس قدر زیادہ متعلم رہے گا اسی قدر زیادہ دنیا میں کامیاب رہے گا۔ اسی کا اچھا اثر متعلم بنانے کے لئے آپ کو جامعہ عثمانیہ نے وہ تعلیم دی ہے جس کو میں نے بالغرض "تدریسی تعلیم" سے موسوم کیا ہے۔ ہماری جامعہ کی تدریسی تعلیم کی غایت یہی ہے کہ طلبا کو اکتسابی تعلیم سہل اور اچھی طور سے پانے کا اہل بنادے تاکہ وہ اپنی عمر زیادہ تر راحت و خوشی میں بسر کریں عسرت و رنج کم تر اٹھائیں تاکہ اس دنیا میں اپنی حیات کا ثمرہ پائیں۔ .... زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے اول لیاقت ثانیاً ہمت ثالثاً مردم شناسی چاہیئے لارڈ آورسٹن جو لارڈ ریڈنگ سے پہلے انگلستان کے چیف جسٹس تھے۔ ان کا

قول ہے کہ جب کوئی لائق آدمی ایسی ہمت والا ہو کہ کبھی اپنا کام نہ چھوڑے برابر اس میں لگا رہے تو ممکن نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہو" اسی لئے لیاقت کے ساتھ ہمت چاہیئے جس کا لازمی نتیجہ کامیابی ہوگا۔ اگر ہمت نہ ہو تو لیاقت بیکار ہو جائے گی۔ آپ پر خدا کا بڑا فضل ہے کہ بہ طفیل جامعہ عثمانیہ آپ کو عمدہ لیاقت حاصل ہوئی ہے اب آپ کی ہمت ہی ہے جو آپ کو دنیا میں کامیابی کا تمغہ پہنا دے گی۔ لیاقت و ہمت کے لوازمات میں مردم شناسی بھی ہے جس سے ہمت بڑھتی ہے اور کام آسان ہو جاتا ہے۔ انسان کی حیات کی بہبودی یعنے زندگی کی بہتری کا انحصار رنج و آفت کی کمی پر اور خوشی و راحت کی زیادتی پر ہے۔ "راحت و آفت" "رنج و خوشی" نسبتی الفاظ ہیں جو ہر ایک کی شخصیت پر اور ہر ایک کے وقت اور موقع پر منحصر ہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی راحت کا رنج سے مبدل ہو جانا ممکن ہے۔ بہرحال آپ جیسے تعلیم یافتہ طیلسانوں کے مدنظر اپنی راحت کی کمی بیشی کا کوئی مقیاس یا پیمانہ رہنا چاہیئے۔ اگرچہ یہ کوئی دستور العمل نہیں ہو سکتا لیکن خوش کردار کے جادہ کا اچھا رہنما ہوگا۔ خواہشات نفس لا تعداد و لا تحصیٰ ہیں۔ اور حرص بڑھانے کے لئے بہت سے اسباب موجود ہیں اور نئے نئے پیدا ہوتے جاتے ہیں انسان کی خواہشات بھی نہ صرف وسیع بلکہ تعداد از زیادہ ہوتی جاتی ہیں اور ان میں سے جتنی خواہشات پوری ہو سکتی ہیں اُن کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے ایسی حالت میں طیلسانوں کے لئے اس سے بہتر کیا جادۂ عمل ہو سکتا ہے کہ سادہ زندگی اور بلند خیالی اختیار کریں جس طرح جامعہ عثمانیہ نے آپ کو اپنے جسم و جامہ کے مانند اپنے دل و دماغ کو صاف اور ستھرا رکھنا سکھایا ہے۔ اسی طرح آپ اپنے خویش و اقارب دوست و احباب۔ علی العموم اپنے ملک والوں کو ہر قسم کی صفائی ظاہر و باطن۔ پاکیٔ دل و دماغ کی طرف رغبت دلاتے رہنا۔ اور اس میں اُن کو حتی المقدور مدد دیتے رہنا۔ آپ کے اُس منصب کا فرض ہے جس کے لئے آپ آج طیلسان بنے ہیں۔ آپ کو دنیا کے کاروبار میں اپنے علم و عمل کے محاسن کا نور پھیلانا ضرور ہے۔ اس کو آپ کا ایثار کہیں گے۔ خود آپ کی خوش زندگی کے واسطے ایثار لازم ہے تاکہ آپ خوش رہیں اور آپ کا ماحول آپ سے خوش رہے۔ آپ کے جامعہ کی کوئی نصیحت اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ "خوش رہو خوش رکھو"

علم و عمل

مجھے علم کے فضائل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ظاہر ہے کہ انسان و حیوان میں باہمی فرق صرف علم و عقل کی وجہ سے ہے۔ علم ہی وہ قوت ہے جس کے ذریعہ انسان کائنات پر متصرف ہے۔ ہمارا شخص اور ایک جانور کی زندگی میں کچھ فرق نہیں اس لئے کہ کھانے پینے اور دوسری ضروریات زندگی کی تکمیل میں حیوان لایعقل بھی انسانِ جاہل کا سہیم و شریک ہے اب اگر تحصیل علم کی غرض صرف آسائش جسمانی کی تحصیل اور خواہشات نفسانی کی تکمیل ہی قرار دی جائے تو ع سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست۔ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

علم کا مفہوم اس سے بہت ہی بالاتر ہے۔ ایک اہل علم دنیا میں ہر حیثیت سے ممتاز رہتا ہے اس کی ہستی دوسروں کے لئے بہترین نمونہ ہوا کرتی ہے اس کی معاشرت بہتر اس کی ہر حرکت میں خیر و برکت مضمر رہا کرتی ہے۔ علم ہی تھا جس نے آدم کو مسجود ملائک بنادیا علم ہی کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ٹھیرا ؎

علم آدمیت است و جوانمردی و ادب　　　　وَرنہ دُدی بصورت انسان مصوری

علم نے انہیں بیش بہا خوبیوں ممتاز صفتوں کی وجہ سے دوراندیش انسانوں کو اپنا گرویدہ بنالیا نتیجہ اِن پاک ہستیوں نے اس کی خاطر اپنا وطن چھوڑا عزیز و اقارب سے کنارہ کش ہوئے مصیبتیں جھیلیں جنگل کی جڑی بوٹیاں تک کھا کھا کر سفر کا رستہ طے کیا مگر طلب علم سے دست بردار نہ ہوئے۔ یادش بخیر امام بخاریؒ کو ایام طالب علمی میں ایک سفر میں تہی دستی نے اتنا مجبور کیا کہ تین دن برابر انہوں نے جنگل کی بوٹیاں کھائیں۔ ابوالمنظور نے بہت سی نئی نباتات دریافت کیں ان کا طریقہ یہ تھا کہ جو مقامات روئیدگی نباتات کے واسطے مشہور تھے مثلاً جبل لبنان (شام) ان میں پھرتے تھے اور

---

* یہ تقریر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے نویں اجلاس میں گوش گذار حاضرین کیگئی۔

بوٹیوں کو دیکھتے اور جانچتے۔ ایک مصور ان کے ہمراہ رہتا جس کے پاس ہر رنگ کی روشنائی مہیا رہتی۔ ابوالمنظور نباتات کا خود مشاہدہ کر لینے کے بعد مصور کو دکھلاتے اور وہ اُس کے رنگ و شاخ و برگ و بیخ کا اندازہ کر کے ہو بہو اس کی تصویر کھینچتا۔ یہ محقق طبیب ایک بار کے مشاہدے پر قانع نہ ہوتا بلکہ نشوونما کے مختلف مدارج میں نباتات کا معائنہ کرتا۔ ایام نمو و تازگی کی علیحدہ تصویر کھنچواتا اور زمانۂ کمال کی جدا۔ اور جب وہ بوٹی خشک ہو جاتی تو ایک تیسرا نقشہ لیا جاتا اسی طرح ہر بوٹی کی تصویریں اس نے اپنی کتاب میں جو ادویۂ مفردہ کے حال میں تھی درج کی تھیں جن کو دیکھ کر ناظرین کتاب ان نباتات کے مختلف اشکال صحیحہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تھے۔ غرض ایسی ہزاروں مثالیں ملینگی جنھوں نے علم ہی کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیا اور اسی مبارک مشغلے میں اپنی عزیز عمریں گذار دیں مگر جس طرح جھوٹا سکہ چل نہیں سکتا بے پھل درخت زیادہ کارآمد نہیں ہوتا اسی طرح وہ علم بے کار ہے جس کے ساتھ عمل نہ ہو وہ عالم حقیقت میں جاہل ہے جو عامل نہ ہو۔ شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے

بارِ درختِ علم ندانم مگر عمل　　　　با علم اگر عمل نہ کنی شاخ بے بری

ہمارا حال یہ ہے کہ مختلف علوم میں ہمیں کمال حاصل ہوتا جاتا ہے مگر عملی میدان میں ہم ناقص ہی نظر آتے ہیں۔ مثلاً معاشیات کی ہم نے تعلیم پائی مگر فکر معاش میں سرگرداں ہی رہے۔ اصول تجارت میں ہم نے کافی واقفیت پیدا کی مگر ہماری نظروں میں تجارت کا پیشہ ذلیل ہی رہا اور بہرحال ملازمت ہی کو ذہنی ترجیح حاصل رہی اور معمولی دُکان ہو کہ عالیشان شاپ دفتری کمرے پر کسی طرح فوقیت نہ لے جا سکی۔

سائنس میں ہم کامل ہو چکے مگر سائنس دانی سے فائدہ اُٹھانا ہمیں نہ آیا مثلاً تھرمامیٹر بنانے کی ترکیب ہمیں از بر ہو گئی مگر اپنے گھر کا شکستہ مقیاس الحرارت ہم سے درست نہ ہو سکا۔ ریاضی میں ہمیں پوری مشق حاصل ہو گئی مگر زندگی کے کاروبار بے حساب ہی طے ہوتے رہے۔ میرے گھر کا واقعہ ہے بوریا بنوایا گیا حساب کے وقت الف۔ اے اور کیا کیا کامیاب حضرات موجود تھے۔ میں نے اُن سے کہدیا کہ بوریا بات کا حساب

کر دیجیے وکا مل ایک گھنٹے تک دو دو چار چار تعلیم یافتہ سرگرداں رہنے کے بعد بالاتفاق آرا یہ اہم حساب اس طرح تکمیل کو پہونچا کہ مبلغ تین سو روپے میرے نام بورئے کی قیمت میں واجب الادا ٹھیرا دیے گئے میں حیران تھا کہ بار خدایا بنوایا تھا بوریا شطرنجیوں کی قیمت کس طرح ادا کروں۔ پھر غریب بوریا باف کی طرف رجوع ہوا تو اُس نے فوراً کہدیا کہ تیس بتیس روپے ہونگے اُس لئے عمداً کچھ روپئے بڑھا کر بتلائے کہ شاید تحقیق نہ ہو اور اس کو زیادہ قیمت مل جائے۔ بوریا باف کی رہبری پر ہمارے حساب داں اصحاب نے مکرر محققانہ حساب کیا تو چھبیس روپئے قیمت میں آئے۔ یہ ہے ہماری حسابی مہارت اور اس کی عملی قوت۔ ہم نے فن ڈاکٹری سیکھا مگر ادویہ کی فراہمی میں اوروں کے دست نگر ہی رہے۔

خوش قسمتی سے اگر ہمیں علم زراعت میں کچھ مہارت ہو بھی جاتی ہے تو بھی زراعت کے سرایہ فائدہ بخش پیشے سے انفرت ہی رہا کرتی ہے۔ ہم خوش ہیں کہ برقی روشنی سے ہمارے گھر منور ہوگئے مگر یہ خیال نہ آیا کہ برقی روشنی کا سامان جو وقت بے وقت ناقص ہوتا جاتا ہے اس کی درستگی تک ہم نہیں کر سکتے جدید اختراع تو درکنار۔ موٹروں کی پرشوکت سواری سیکلوں کی سبک رفتاری دیکھ دیکھ کے ہم پھولے نہیں سماتے مگر ہم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ آج تک بگی یا دوسری سواریوں کے وسیلے سے پرورش پانے والے تین تین چار چار ملازمین پھر ان کے زیر پرورش نفوس اب کیا کھا رہے ہونگے کرائے کی گاڑیاں ہانکنے والے غریب کس طرح زندہ ہوں گے۔ آٹا پیسنے چھالیا کترنے غرض معمولی سے معمولی کام کے انجام دینے والی مشینیں غیر ممالک سے ہمارے پاس آگئیں اور ہماری سب حاجتیں انہیں اوزار سے پوری ہونے لگیں مگر ہمیں اس کا احساس نہ ہوا کہ چکی میں پیس کر جینے والی بیوائیں چھالیا پھوڑنے کی مزدوری سے پلنے والی غریب عورتیں اب کیا کریں گی اور کس طرح جیتی رہیں گی۔ قوم پروری کی انتہا ہوگئی کہ ہم میں ایسی ہستیاں بھی ہیں کہ صرف ڈیڑھ دو سو روپئے ماہوار مگر ان کے خرد سال بچوں کے کپڑے تک دریا پار سے سلکر آتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ منگوایا دوسرے ملکوں سے

ہماری جو کچھ آراستگی ہوئی اوروں کے وسیلے سے۔ انصاف فرمائیے بیگانی صنعتوں پر
ہمارا ناز غیر ملکی اشیاء پر ہمارا فخر کہاں تک زیبا ہو سکتا ہے ؎
اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری
تحصیل علم کے بعد صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے عوض ہمارے تکلفات
اور بڑھ جاتے ہیں۔ ہماری لیاقت کے ساتھ ساتھ پُر تکلف لباس اور ظاہری بے موقع
وضعداری میں خاصی ترقی ہونے لگتی ہے مثلاً کسی طالب علم نے ادھر کوئی امتحان پاس
کیا اُدھر اس کی شان و شوکت میں ترقی کے آثار نمایاں ہو گئے غریب ماں باپ کا گھر
ان کے بنائے ہوئے کپڑے ان کے پاس کی معمولی غذا غرض سبھی چیزوں سے
نفرت سی پیدا ہو گئی بدبختی سے یہ ماں باپ کی سرپرستی میں خوش و خرم رہتا ہے نہ خود
کما کر اپنی خواہشیں پوری کر سکتا ہے اس کے لئے اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور
یہ ماں باپ کے لئے وبال جان ہو جاتا ہے۔ صنعت و حرفت سے بے توجہی اور پیشہ وری
و ہنرمندی کو عیب سمجھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک ملازم باپ جب انتقال کر جاتا ہے تو
اس کے خاندان کی تباہی آجاتی ہے۔ خود میری آنکھوں نے بھی دیکھا ہے کہ کل جن کے
گھر دولت و ثروت کے گہوارے بنے ہوئے تھے آج اُن کے ناز پروردہ بچے نانِ
شبینہ کو محتاج پھر رہے ہیں۔ آباء صاحب اقتدار تھے صاحبزادے دربدر بھیک مانگ
رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آج خلیفہ مقرر ہوئے اور کل کپڑوں کی گٹھری
کاندھوں پر لئے ہوئے بازار کا ارادہ فرمایا۔ تاکہ کپڑے بیچ کر اہل و عیال کی پرورش کا انتظام
کریں۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُولوالعزم جانشین کی اس منکسر المزاجی پر غور فرمائیے
اور آج کل کی بے جا تمکنت ملاحظہ کیجئے چشم دید واقعہ ہے چار مینار کے پاس ایک تعلیم یافتہ
نے سگریٹ کا ڈبا خریدا (غور فرمائیے کیسی بھاری چیز خریدی) پھر کرائے کی گاڑی ٹھیرائی اور
سوار ہونے لگے میں نے عرض کیا آپ کا مکان یہاں سے بالکل قریب سواری کی اس وقت
آپ کو کیا ضرورت جواب دیا کہ سگریٹ کا ڈبا اٹھائے ہوئے راستہ طے کرنا کسر شان ہے
حضرات یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں اعلیٰ مراتب لوگ بھی بازار جانے میں عار نہیں کرتے۔

جنوبی ہند کا سفر کرتا ہوا میں اوٹی کمنڈ گیا تھا ایک مارکیٹ میں دیکھا کہ ایک میم صاحبہ موٹر سے اتریں کچھ ترکاری خریدی اس کو رومال میں باندھ لیا پھر موٹر میں سوار ہو کر چلی گئیں حیرانی یہ ہے کہ ہم لوگ تعلیم پانے کے بعد اپنے بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں نہ ان معاملات میں یورپ والوں کی چال چلتے ہیں ؎

عجیب وضع عجب رنگ ہے ترا کیفیؔ   نہ تجھ کو رند سمجھتا نہ پارسا کوئی

اتفاق کے فوائد ہم پڑھتے ہیں اس پر مضامین لکھتے ہیں" نااتفاق مگس نیشو دپیدا الخ"۔
بچپن سے ہمیں درو زبان ہے مگر عملی کیفیت کا یہ حال کہ ایک دفتر ایک مدرسہ ایک گھر والوں میں ایک بادشاہ کی رعایا بلکہ ایک باپ کی اولاد میں کہاں تک اتفاق سے گذرتی ہے ظاہر ہے اور ایک دوسرے کا کس قدر بہی خواہ ہے اظہر من الشمس ہے ؎

خانہ آباد جو اُجڑے ہوئے ہوں اُن کو بسا   نہ کہ یہ قصد کہ کوئی کہیں آباد نہ ہو

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں ایک موچی رہتا تھا جو نہایت رنگین طبع اور شراب خوار تھا رات بھر اپنے ہم مشرب احباب کے ساتھ شراب خواری اور گانے بجانے میں مصروف رہتا اور اکثر یہ شعر گاتا ؎

اَضَاعُونِی وَاَیَّ فَتًی اَضَاعُوا   لِیَوْمِ کَرِیْھَۃٍ وَسِدَادِ ثَغْرٍ

(یعنی لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھویا جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا) اگرچہ اس کے یہ حرکات امام صاحب کے ذکر و شغل میں خلل انداز ہوتے مگر آپ فرط اخلاق کی وجہ سے کچھ تعرض نہ کرتے ایک رات کوتوال شہر نے اس کو گرفتار کر کے قید خانہ بھیج دیا امام صاحب کو خبر ہوئی تو فوراً کوفے کے گورنر کے پاس تشریف لے گئے اور سفارش فرما کر اپنے ہمسایہ موچی کو قید سے رہائی دلوادی اور راستے میں اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ" کیوں ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا۔

بڑے پڑوسیوں کے ساتھ بزرگوں کی اس ہمدردی کو دیکھئے پھر اپنوں کے ساتھ ہماری بے دردی ملاحظہ فرمائیے۔

ایثار کی خوبیاں ہمارے ذہن نشین ہیں مگر عمل کا یہ حال کہ طاعون کی گرم بازاری

مخلوق کی پریشانی تمہیں جانیں جارہی ہیں مگر خوش ہونے والے خوش ہوتے ہوئے پائے گئے کہ لوگ مریں گے جائدادیں خالی ہوں گی امیدواری کا نتیجہ برآمد ہوگا ملازمت اور تجارت کا باہمی فرق ملاحظہ ہو ملازمت کے خواہاں بندگان خدا کا مرنا چاہتے ہیں کہ خود جانشین ہوں تجارت پیشہ ان کی صحت و درازی عمر کے لئے دعا کو ہیں کیونکہ اپنی تجارت بڑھے گذشتہ زمانے میں غنیم کی فوج نے چند مسلمانوں کو گرفتار کر لیا سزا یہ تجویز کی کہ مختلف چٹھیوں پر قتل یا قید وغیرہ کی مختلف سزائیں لکھدیں اور ان چٹھیوں کو ان قیدیوں میں لٹا دیا گیا تاکہ جس کے ہاتھ جس قسم کی چٹھی آئے وہی سزا اسے دیجائے ایک شخص جس کے نام پر قتل کی چٹھی آئی تھی آبدیدہ ہوا ساتھی نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ضعیف والدہ کے لئے غمگین ہوں اس نے کہا کہ بھائی میں اکیلا آدمی ہوں مجھے ماں ہے نہ اہل و عیال اور میرے نام پر جو چٹھی آئی ہے اس میں چند سال قید کی سزا درج ہے میری چٹھی اپنی چٹھی کے معاوضہ میں لے لو تاکہ میں قتل ہو جاؤں اور تم سلامت رہو حضرات آج اوروں کی خاطر اپنی عزیز جان دینا تو درکنار ایک ہی جائداد پر ہر ایک امیدواری چاہتا ہے کہ میں مامور ہو جاؤں میرا ساتھی اگرچہ مجھ سے زیادہ لائق ہی محروم ہی رہے۔

دیانت داری فی نفسہٖ بہترین چیز ہے اس سے کسی اہل علم کو انکار نہیں ہو سکتا غور طلب یہ امر ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جو اس بار گراں کو بدرجہ اتم اٹھائے ہوئے ہیں ایک باپ اپنے بیٹے کو ساتھ لئے ہوئے میوہ چرانے کے واسطے ایک باغ کے پاس پہنچا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ مجھے چوری کرتا ہوا کوئی دیکھ لے تو مجھے خبر کر دینا یہ کہا اور باغ میں داخل ہوا تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ چلانا شروع کیا کہ ابا جان تمہیں ایک شخص دیکھ رہا ہے باپ گھبرایا ہوا فوراً واپس آ گیا اور پوچھا کہ وہ دیکھنے والا کون تھا بیٹے نے کہا خدائے تعالے جو تمہیں اور مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ میرے بزرگو! آج ہم میں حقیقی طور پر خدا کو حاضر و ناظر ماننے والے کتنے اصحاب ہیں راست بازی اور دیانت داری پر اگر ہم کافی طور پر عمل پیرا ہوتے تو دفاتر وغیرہ سادر کے لئے سرکار عالی کو علیحدہ انتظام کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی اور قلم وغیرہ پر سرکاری تحریر کی نوبت نہ آتی۔ باوجود اس کے خدا جانتا ہے

دیانت داری کی پرداخت کرنے والے کتنے ہیں اور مالک حقیقی سے ڈرنے والوں کی تعداد کیا ہے۔

وفاداری کے متعلق زبانی جمع خرچ تو بہت ہوسکتا ہے حضرات! اغراض اقوال سے نہیں افعال سے ہے ایک ڈاکو نے اپنے ساتھیوں کو لے کر بادشاہ کے خزانے میں ڈاکہ مارا جب یہ اور اُس کے ہمراہیوں نے زر وجواہر پر قبضہ کرلیا اور گٹھریاں باندھ لیں تو انہیں کچھ فاصلے پر ایک سفید سی چیز نظر پڑی چاندی سمجھ کر یہ ڈاکو نزدیک گیا معلوم ہوا کچھ سفوف ہے چکھا تو اس کو نمک پایا فوراً گٹھری رکھ دی اور گٹھریاں بھی چھوڑ دیں اور خالی ہاتھ واپس ہوا۔ صبح ہوئی تو بادشاہ سلامت کو خبر پہنچی کہ خزانے پہ ڈاکہ پڑا مگر چور مال اکٹھا کرکے خلاف اُمید خزانے ہی میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں بادشاہ نے امن کا اعلان کردیا تو چوروں کا سردار حاضر دربار ہوا بادشاہ کے استفسار پر پورا حال بیان کیا اور کہا کہ جس چیز کو چاندی سمجھا تھا وہ نمک نکلی چکھنے کے بعد خیال ہوا کہ جس کا نمک کھالیا ہے اُس کے گھر چوری نہ کرنی چاہیئے بادشاہ پر اس نمک حلالی کا خاص اثر ہوا اس کو اپنا سپہ سالار بنالیا اور وصیت کردی کہ اپنے بعد اسی کو تخت نشین کیا جائے۔ آج ہماری نمک خواری پھر وفاشعاری کی کیا حالت ہے ہر صاحب اپنے اپنے دل میں غور فرمالیں ایک آقا خربزہ تراش کے اس کی قاشیں اپنے خادم کو دیتا گیا خادم مزے لے لے کے کھاتا گیا آخر میں ایک قاش آقا نے جو چکھی اس کو نہایت تلخ پایا پوچھا اتنا کڑوا خربزہ خوشی خوشی کیوں کھالیا نوکر نے جواب دیا حضور جن ہاتھوں سے بہتیری میٹھی اور لذیذ چیزیں کھائی ہوں انہیں ہاتھوں سے کبھی کڑوی کسیلی چیز ملے تو انکار زیبا نہیں۔ آج ہمیں کسی حاکم سے ذرا ملال ہوا کہ اس کے سب احسانات بالائے طاق اسی طرح کسی ماتحت کے ذرا سے قصور پر اس کی تمام وفاداریاں برطرف۔ ہمارے پاس وہی عہدہ دار قابل تعریف ہے جو جا و بیجا صرف ہمارے لئے نفع رساں ہو۔

اطاعت کیشی نہایت ضروری چیز ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ گورنر کوفہ نے آپ کو فتویٰ دینے سے منع کردیا۔ ایک دن گھر میں بیٹھے ہوئے تھے

آپ کی صاحبزادی نے مسئلہ پوچھا کہ میں روزے سے ہوں دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا روزہ جاتا رہا یا باقی ہے۔ امامؒ نے فرمایا جان پدر اپنے بھائی حماد سے پوچھ میں فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہوں۔ آج کسی حاکم نے ہمیں کسی بات سے منع کر دیا ہو اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہماری خلاف ورزی کی اُس کو خبر نہ ہو سکے گی تو شاید ہی کوئی ہو گا جو پھر بھی اطاعت کو ضروری سمجھے گا۔

مذہبی احکام کی پابندی علم و عمل کے لئے روح رواں ہے اور انسان کے لئے دارین کی بہبودی کی کفیل۔ مگر افسوس کے ساتھ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ علم و لیاقت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہبی احکام سے بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جاتی ہے فرسٹ فارم کا طالب علم جو نمازی باپ کا بچہ ہے نمازی رہتا ہے تو مڈل پاس طالب علم کبھی کبھی نمازی بن جاتا ہے اوپر کی جماعتوں میں صوم و صلوٰۃ کے پابند طلبہ میں خاصی کمی ہونے لگی ہے۔ ایک صاحب کا حال سُنا گیا کہ انتہائی ڈگری لینے جاتے وقت بڑے پابند اور ذاکر و شاغل بھی تھے بڑی دور سے پانچ چھ بڑی بڑی سندیں لے کر واپس ہوئے تو یہ حال ہوا کہ خدائے تعالیٰ ہی کے وجود کے متعلق ششش و پنج میں پڑ گئے۔ علم نے تواضع نہ سکھائی پیشوایان قوم کا پیرو نہ کیا بلکہ فنائیت کے عوض انانیت اور خدا بینی کے بدلے خود نمائی میں کمال حاصل ہو گیا۔ ؎

بتو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں ۔ نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھیرے

جب یہ بزرگوار جن کو مجبوراً اس زمانے کے علمائے کرام کہنا پڑتا ہے اپنی اصلاح اس طرح فرما چکے ہوں تو قوم کو راہ راست پر لانے میں ان سے کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ ع۔ کون رہبر ہو سکے جب خضر بھٹکانے لگے۔ ایک دفعہ میرے مکان میں قرآن مجید کا ختم ہو رہا تھا۔ میٹرک کے ایک طالب علم ملاقات کے لئے آئے میں نے کہا تلاوت میں شریک ہو جائیے کم فرصتی کے عذر کے بعد مجبوراً جو جزو میں پڑھ رہا تھا اُسی کے صرف دو چار سطریں پڑھنے میرے بازو بیٹھ گئے اور صرف دو سطریں اس طرح پڑھیں کہ جتنے کلمے تھے اتنی ہی غلطیاں کیں۔ مسلمان نوجوان فوقانی درجے کے طالب علم کی صرف لفظی قرآن خوانی کی یہ قابلیت مگر احکام قرآنی کے متعلق یہ میگوئیاں کرنے میں

بچے بچے کو یہ طولیٰ حاصل۔ عیدگاہ میں ایک دفعہ میرے بازو ایک عمر رسیدہ مہذب باپ مع اپنے نوجوان فرزندوں کے نماز عید میں اس وقت شریک ہوئے جب کہ ایک رکعت ہو چکی تھی۔ امام نے جب نماز ختم کی تو حضرت نے بھی سلام پھیر دیا مگر بچوں نے گئی ہوئی رکعت قضا کر لی۔ ماں باپ کی مذہبی احکام سے بے خبری کی اس حالت کے باوجود بعض حضرات کا یہ خیال کہ مذہبی تعلیم بچوں کو ماں باپ گھر پر دے لیا کریں مدارس میں تعلیم دینیات کی چنداں ضرورت نہیں کس قدر حیرت انگیز اور مصیبت خیز ہے جب کہ ماں باپ خود الف با تک بھی نہیں جانتے بچوں کو کیا سکھائیں گے۔ طرفہ یہ کہ مدرسہ ہی کے تعلیمی کام سے طلبہ کو فرصت نہیں تو یہ گھر پر دینی تعلیم کس طرح اور کس سے پائیں گے۔ غرض علم کے ساتھ عمل اور کتابی تعلیم کے ساتھ تجارت و زراعت صنعت و حرفت کی طرف توجہ لازمی ہے اور مذہبی احکام کی پابندی دینی و دنیوی مفاد کے لئے نہایت ضروری۔ اہل علم کی بے عملی ضروری امور سے عقلمندوں کی بے خبری غدانہ کرے بُرے نتائج پیدا کرکے رہے گی ؎

ستبدی لک الایام ما کنت جاہلاً
ویاتیک بالاخبار من لم تزود

محمد حسام الدین فاضل

———(۰)———

تربیت

یہ مختصر مضمون، جو "راہ نو" جلد دوم، باب اول صفحہ ۱۸۔۲۵ سے ماخوذ اور براہ راست فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے بلحاظ اپنے اسلوب اور نوعیت کے دلچسپ ہے۔

اس کے پہلے اسی کتاب کے چوتھے اور پانچویں باب کا ترجمہ "حیدرآباد ٹیچر" کے ناظرین کی ضیافت نظر کے لئے پیش کیا گیا تھا جس کو فن تربیت کے دلدادہ بزرگواروں نے پسندیدہ نظر سے دیکھا اور آئندہ بھی اس کتاب کے دیگر دلچسپ ابواب کو بالاقساط پیش کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ اس لئے ناچیز مترجم نے بامتثال امر یہ تیسری قسط پیش کرنے کی جرأت کی ہے اور اُمید کرتا ہے کہ اگلی قسطوں کی طرح یہ قسط بھی دلچسپی کی نظر سے دیکھی جائیگی فقط

اگرچہ فنِّ تربیت کی تعریف کے باب میں مختلف عقیدے ظاہر کئے گئے ہیں لیکن چونکہ ان میں کا ہر ایک، ایک خاص نقطۂ نظر سے مخصوص ہوتا ہے اس لئے یہ بات فائدے سے خالی نہیں اگر ہم ان میں کے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والے عقیدے پر گہری نظر ڈالیں۔

بعض حکماء کے نزدیک، تربیت مراد ہے اُن عادتوں کی تعلیم سے، جن کے ذریعہ انسان اپنے تئیں اجتماعی زندگی کے ایک مخصوص شعبہ میں داخل کرتا ہے، جس طرح، ہر قوم اور ہر ملّت کے لوگ اپنے لئے چند مخصوص آداب، عادتیں، اخلاق اور شرائط زندگی رکھتے ہیں اُسی طرح، اُن میں کا ہر ہر فرد ــــ جیسی کچھ اُس کی تعلیم ہوئی ہے۔ اپنے آپ کو اُسی قوم یا اُسی ملّت کا ایک تربیت یافتہ جزو تصور کرتا ہے۔

انہی حکماء کی نظر میں، تربیت کا مقصد ہر ایک فرد کو اپنی مکمل زندگی کے شرائط قبول کرنے کے لئے تیار کرنا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ تعریف جامع نہیں ہے

کیونکہ اگر تربیت کا مقصدِ اعلیٰ کسی ایک قوم کی عادتوں اور آداب کی تعلیم ہے تو اس کام کو ہر قوم و ملت — یہاں تک کہ وحشی اقوام بھی — انجام دیتی اور اپنے افراد کو آئے دن زندگی کے آداب و شرائط سے آگاہ کرتی رہتی ہیں۔ اس صورت میں فنِ تربیت کے وجود و تسلیم کا ادعا جائز نہیں ہوتا۔ اور ہر ایک قوم کو چاہیے کہ وہ اپنے موجودہ نظامِ تربیت پر اکتفا کرلے اور اس کے تغیر و اصلاح کی فکر میں نہ پڑے؛ اسی طرح وہ تربیت جو افراد کو ساری قوم میں پسندیدہ نظروں سے دیکھے جانے کے لیے تیار کرتی ہے، اس تعریف سے خارج ہو جاتی ہے۔ یہ تعریف صرف قومی تربیت میں شامل کیجا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں صحیح اور کامل تربیت وہ کہلاتی ہے جو قومی و نوعی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے۔

بعض حکماء نے یہ بھی کہا ہے کہ تربیت ایک فن ہے جو قوائے انسانی کی نشو و نما کے ذریعہ، زندگی کے مختلف ادوار میں تناسب و اعتدال قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی تعریف کی بناء پر ہر وہ شخص جو ایسے قویٰ کا مالک ہوتا ہے (جن کی بطور تناسب یعنے بغیر افراط و تفریط کے نشو و نما ہوئی ہو) تربیت یافتہ شمار کیا جائیگا۔

یہ تعریف فنِ تربیت کی وہ اہم شرط پیش کرتی ہے جس کی غایت اصلی قوائے انسانی کی نشو و نما میں تناسب و اعتدال کا پیدا کرنا اور ان کی نگہداشت کرنا ہے۔ درحقیقت ہم یہ بات محسوس بھی کرتے ہیں کہ وہ تمام مصیبتیں، زحمتیں اور بدنصیبیاں جو آئے دن انسان کو پیش آتی ہیں محض ان کے قویٰ کے درمیان تناسب و اعتدال قائم نہ رکھنے کا باعث ہیں یعنے افراط و تفریط کا موجب ہیں؛ جس حالت میں تربیت اس کو دفع کرنا چاہتی ہے اس کے باوجود یہ تعریف فنِ تربیت کی اصلی غایت کو پیش نہیں کرتی اور نہ یہ بتلاتی ہے کہ بطور تناسب قویٰ کی پرورش کے بعد ان کو کس راہ پر لگانا چاہیے؟ مگر یہ بات جس کو ہم بیان کرنے والے ہیں کہ جہاں کسی ایک فرد کے قویٰ نے اسی طریقہ پر پرورش و ترقی پائی ہے وہ آپ ہی ان کے استعمال کا راستہ پیدا کرلیں گے۔

فلاسفہ کی ایک اور جماعت کے نزدیک، تربیت سے مراد بذریعۂ علم کے احساسات کی پرورش کرنا ہے۔ یہ تعریف بھی ناقص ہے (۱) اولاً چونکہ یہ فن ترکیب کے موضوع کے ایک ہی حصہ کو، جس سے مراد احساسات کی پرورش ہے، بیان کرتی ہے جس صورت میں کہ انسان احساساتِ محض ہی کا نام نہیں جن کی پرورش سے مراد اُس کی تربیت بھی ہو بلکہ جسمانی و دماغی قوئ بھی وجود انسانی کے عناصر میں داخل ہیں اور ان کی پرورش بھی تربیت کی اہم الاہم شرط ہے۔ (۲) ثانیاً یہ تعریف احساسات کی پرورش کا وسیلہ سمجھی گئی ہے جس کا انحصار علم پر ہے۔ درآں حالے کہ ہم نے بہتری چیزیں شعور حیوانی[1]، تقلید اور باہمی ارتباط کے ذریعہ سیکھی ہیں جن میں علم کا بہت کم عمل و دخل ہوتا ہے لیکن وہ تمام کی تمام فن تربیت کے زیر اثر ہوتی ہیں۔

عقلاء کے ایک اور گروہ کے بیان کے مُطابق، تربیت عبارت ہے ایسے اعمال کی تعلیم سے جو انسان کو اپنی مکمل زندگی سے بہرہ مند ہونے کے لئے تیار کرتی ہے۔ اس تعریف نے ایک طرف سے اعمال کو فن تربیت کا موضوع قرار دیا ہے اور اس میں قوائے معنوی اور احساساتِ روحی[2] کے لئے کوئی مقام مقرر نہیں کیا گیا؛ جس صورت میں کہ فن تربیت تنہا ہمارے اعمال کو پرورش و ترقی ہی نہیں دیتا بلکہ ہمارے دماغی اور احساسات نفس کو بھی غذا پہنچانا اور ہدایت کرنا چاہتا ہے مگر ہم یہاں یہ بات بیان کئے دیتے ہیں کہ اگر یہ قوئ اور احساسات بھی، ہمارے اعمال کے لئے، وجود خارجی پیدا کرتے رہے ہیں تو دوسری طرف سے "زندگی کامل" کی تعبیر بھی محتاج بیان ہے جو ہر شخص کی نظر میں کچھ اور ہی قسم کے شرائط رکھتی ہے۔

یونانی فلسفی، افلاطون نے (جس کا زمانہ دو ہزار تین سو برس پہلے کا ہے) فن تربیت کی اس طرح تعریف کی ہے: تربیت عبارت ہے جسم و روح کو کمال و تناسب کے بلند ترین پایہ پر پہنچانے سے۔

---

(۱) شعور حیوانی سے مراد شعور نفس ہے جو قدیم فلسفہ کی اصطلاح ہے ۱۲ (متین)
(۲) اس سے مراد احساسات نفس ہے ۱۲ (متین)

میں اس تعریف کو دوسری تمام تعریفوں سے زیادہ کامل اور موافق پاتا ہوں اس لئے کہ اس نے سب سے پہلے، جسم اور روح کو تربیت میں شامل کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس نے تربیت کی اصلی غایت اور اس کا آخری نتیجہ، انسان کے کمال و جمال کو بلا اختصاص کسی ایک ملت، کسی ایک نسل، اور کسی ایک زمانہ کے قرار دیا ہے۔

اگر ہم، بعبارت دیگر، اسی تعریف کی جو فن تربیت کے موضوع کی روشن ترین دلیل ہے تفسیر کرنا چاہیں تو یوں کہنا چاہیئے۔

"تربیت نام ہے اعضاء جسمانی، قوائے دماغی اور احساسات روحی (جسم و روح) کی پرورش کا، اس طور پر کہ وہ نوع بشر کی خوش نصیبی کا...... سرمایہ ہو"

اس تفسیر سے، اولاً، فن تربیت کی غرض معلوم ہو جاتی ہے کہ نوع انسانی کو خوش قسمت بنانا ہے اور اس کی خوش قسمتی سے مراد اس کا مطلق کمال و جمال کے درجہ کو پہنچنا ہے۔ ہم یہاں یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ محض خوش قسمتی، جو افراد انسانی کے ہر ایک فرد کے شامل ہوتی ہے، خارجی وجود نہیں رکھتی؛ اس لئے کہ خوش قسمتی بھی تمام انسانی خواص و صفات کی مانند، متوارث ہوتی ہے اور ہر فرد کے لئے ایک خاص قسم کی خوش قسمتی مخصوص ہوتی ہے؛ جس طرح ایک دیہاتی کی خوش قسمتی کسی شہر نشین کی خوش نصیبی کے بغیر نہیں ہے اسی طرح ایک تندرست و عاقل آدمی کی خوش قسمتی ایک بیوقوف و بیمار آدمی کی خوش قسمتی کے جیسی نہیں ہوتی۔ لیکن، افراد انسانی کے ہر ہر فرد کی خوش نصیبیاں مجموعی حیثیت سے نوع بشر کے لئے حقیقی خوش قسمتی ہے؛ اسی طرح، کمال و جمال سے مطلق مراد افراد انسانی کے ہر ہر فرد کے جمیع کمالات و تناسبات ہیں۔

ثانیاً، تربیت کی اس تعریف و تفسیر سے درجۂ کمال و جمال پر پہنچنے کا وسیلہ بھی سمجھا جاتا ہے اور وہ اعضاء جسمانی، قوائے دماغی اور احساسات نفس کا پرورش کرنا ہے۔

اسی تعریف کی بنا پر، ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ دنیا کی موجودہ اقوام خواہ وحشی خواہ یا متمدن، ہر ایک اپنے ارتقائی درجہ کی نسبت سے ایک نوع کی مخصوص قومی تربیت

رکھتی اور اپنے افراد کے جسم و نفس کو پرورش کرتی ہے لیکن چونکہ یہ ان کی پرورش جیسی کہ چاہیئے۔ نوع بشر کی سعادت سے متعلق خدمت انجام نہیں دیتی، اس لئے ان کی تربیت و تمدن ناقص ہے اور اصلاح و تکمیل کا محتاج نظر آتا ہے۔

مغربی متمدن قومیں بھی، باوجود ان تمام فراواں و درخشاں ترقیوں کے، جو وجود میں لائی اور لا رہی ہیں اگرچہ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص نوعیت کی قومی تربیت رکھتی ہے لیکن، یہ تربیت و تمدن، انسانی سعادت کا ضامن نہیں اور بہتیری خامیاں رکھتا ہے، اسی وجہ سے، میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ اہل یورپ کی کورانہ تقلید ہم کو سلامت و سعادت کے ساحل پر نہ پہنچائے گی۔ اب ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ایک خاص نوعیت کے تمدن کی بنیاد رکھیں جو افراد قوم کو بنی نوع کے نجات دلانے کے لئے تربیت کرے اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ اس مقصد کو پہنچنے کا واحد ذریعہ، قومی تربیت کا تحفظ ہے

میں یہاں اس امر کی توضیح کر دینا چاہتا ہوں، اس وجہ سے کہ میں نے اس تعریف میں وجود انسانی کو تین قسموں یعنے اعضاء جسمانی، قوائے دماغی اور احساسات روحی پر تقسیم کیا ہے۔

جاننا چاہیئے کہ ہمارا جسم، مانند ایک مشین کے ہے جو رات دن کام کرتا رہتا ہے وہ کپڑوں کی ہر ایک مشین کی مانند، مختلف حصے رکھتا ہے، اس کا ہر ہر حصہ ایک ایک کام کے لئے مقرر ہے۔ ہمارے جسم کی یہ مشین، کام کرنے کے لئے قوت محرکہ کی محتاج ہے جس سے مراد ہمارا نفس ہے۔ اسی طرح اس مشین کی چرخیوں میں سے ہر ایک چرخی دندانے اور مختلف حصے (پرزے) رکھتی ہے جو سب کے سب ایک ساتھ کام کرتے ہیں، اگر ایک ان میں سے ٹوٹ جاتا یا بگڑ جاتا ہے تو دوسرے بھی کام نہیں دے سکتے۔ اور اس طرح سے، غالباً تمام مشین کی مشین بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ ہمارے جسم کی مشین کی بڑی سے بڑی چرخیاں تین قسم کی ہیں۔

قسم اول میں ہمارے جسم کے اعضاء ظاہری و باطنی داخل ہیں جن میں سے ہم بعض کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں مثلاً۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ اور بعض کو

صرف کیمیائی تحلیل یا خوردبین کے ذریعہ، خون کے اجزاء اور باریک باریک رگوں وغیرہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

قسم دوم میں وہ قوتیں شامل ہیں جن کا مرکز دماغ ہے مثلاً: قوتِ فکر، تصور، تخیل، تعقل، ادراک، شعور، محاکمہ، حافظہ، ارادہ وغیرہ مگر یہ وہ قوتیں ہیں جو نہ تنہا آنکھ کے ذریعہ بلکہ دوربین یا خوردبین کی وساطت سے بھی دکھائی نہیں دیتیں۔

قسم سوم میں احساسات نفس شامل ہیں: علاوہ قوائے دماغی کے ہم بعض ایسے حسیات (جذبات) بھی رکھتے ہیں کہ لوگ جن کا مرکز دل کو قرار دیتے ہیں مثلاً: محبت، بغض، کینہ، خوشی، غم، امید، خوف، حسد ان کے سوا اور بھی جذبات ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کا مرکز بھی دماغ ہی ہے اور جب ہمارے قلب میں ان انقباضی یا انبساطی حالات کی تولید ہوتی ہے تو ہمارا قلب بھی، جو خون کے تصفیہ و تقسیم کا مرکز ہے، ان انقباضی و انبساطی اثرات کو ہمارے رخساروں پر ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قلب کو احساسات و جذبات کا منبع سمجھتے ہیں۔ یونانی حکیم ارسطو (جس کو معلم اول کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) ان تمام حالات کا مرکز قلب ہی کو سمجھتا تھا اور اب تک بھی قلب "زبان شعر و ادب"، میں، احساسات کا سرچشمہ اور عشق و الہام کی جلوہ گاہ ہے۔ لیکن آج کل اس پر عقیدہ ہے کہ ان تمام حالات کا تعلق ہمارے جہاز عصبی (تہیج) سے ہے اور یہ ہمارے مراکز دماغ میں پیدا ہو کر، ہماری روح (نفس) کو متاثر کرتا ہے جن کو ہم بھی روحی و قلبی اثرات سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا نفوذ جسم کی مشین کو حرکت دینے میں قوائے دماغی کے نفوذ سے کم نہیں۔

اب ہم اس چیز کی تربیت کا ذکر کرینگے جو ان اعضاء، قویٰ اور احساسات کو اس طور پر ترقی دیتی اور تیار کرتی ہے تاکہ وہ ہماری اور دوسروں کی خوش نصیبی کا سرمایہ بنے۔

ان اعضاء، قویٰ اور احساسات کی پرورش یعنے تربیت، دو راہیں رکھتی ہے:۔ (۱) ایک تو وہ راہ ہے جس کی طرف فطرت خود رہنمائی کرتی ہے اور خود فطرت

ہی ہماری ہی مربی (تربیت کرنے والی) ہے۔ جس وسیلہ پر اس مربی کو قدرت حاصل ہے اس سے مراد شعور نفس ہے۔ چنانچہ بچہ کے پیدا ہونے کے دن سے یہی شعور نفس اس کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ پستان مادر کو ٹٹولے اور چوسے۔

اسی اصول کے مدِّ نظر، بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کے قویٰ اور حواس بھی بیدار اور بیدار ہو کر نمو پاتے ہیں اور وہ بھی تقلید اور تکرار عمل کی وساطت سے بات کرنا، راہ چلنا، پہچاننا، کھانا اور سونا وغیرہ سیکھتا ہے۔ بہرحال، اس ترتیب کے ساتھ وہ بڑا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تربیت کو، جس کا دینے والا سوائے شعور نفس اور ذات فطرت کے کوئی دوسرا نہیں، فطری تربیت کہتے ہیں۔ نوع انسانی اور اکثر وحشی قبائل کی اوّلیں تربیت یہی ہے۔

لیکن اگر ہم اسی پرورش و بالیدگی کو ــــ درآں حالے کہ بچہ خود رو درختوں کی مانند پرورش پا رہا ہے، ــــ شعورِ حیوانی کے سپرد کریں گے اور اس کو فطرت کی روانی اور زمانہ کے انقلاب پر چھوڑیں گے تو زندگی سے جو فائدہ اور غرض کہ ہمارے پیش نظر ہوتی ہے وہ حاصل نہ ہوگی۔ اُس بچہ کا حال اُن خود رو پھولوں کی مانند ہو گا جو تنہا آغوشِ فطرت میں پلکر بڑا ہوا ہو اور کسی قسم کی آبیاری، پرداخت، اور باغبانی (ان والدین) کی طرف سے نہ ہوئی ہو۔ جیسا کہ خود آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس قسم کے پھول بہت جلد مرجھا کر کوڑے کرکٹ اور گھاس پھونس میں پنہاں ہو جاتے ہیں اور اپنا فطری رنگ و بو بھی کھو کر بہت جلد سوکھ جاتے ہیں۔ بیڈھنگی گھاس ان کو کمزور کر کے بالیدگی سے روکتی ہے۔

یہی طور ہے بچوں کی حالت کا، اگر ہم ان کو تربیت نہ کریں اور انہیں اُن کی اپنی حالت پر چھوڑ کر فطرت کے سپرد کریں اور اگر ان کی تربیت میں کسی نوع کی تکلیف اپنے آپ پر گوارا نہ کر کے مادرِ فطرت کی تربیت پر قانع رہیں تو اُس وقت اگلے وحشی انسانوں کی حالت کی جانب، جو حیوانات کے مقابلہ میں کچھ فرق نہیں رکھتے، عود کریں گے۔ یہاں تک کہ اگر ہم ان کی تربیت کریں گے لیکن نہ صحیح طریقہ پر اور نہ فنی قواعد کے موافق، تو

اس سے ظاہر ہے کہ ہم کو اچھا نتیجہ حاصل نہ ہوگا درآں حالیکہ اپنی اور نوع انسانی کی بدنصیبی کا سرمایہ کر رہے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ اکثر قومیں بے تربیتی اور وحشی گری کی حالت میں رہ گئی ہیں اور تربیت میں ترقی یافتہ اقوام نیز مختلف قوموں کے طبقے کے درمیان ایک دوسرے سے دور رہ کر بڑا فرق پیدا کر رہی ہیں۔

اسی خیال کے مدنظر، اس وجہ سے کہ ہم اگلے وحشی انسانوں کی حالت کی جانب نہیں عود کر سکتے اور بخلاف اس کے کہ ہم کو موجودہ حالت سے نکل کر ترقی کرنا چاہیئے۔ یہ سادہ اور فطری تربیت، ترقی کی راہیں سمجھانے اور ضروریات پوری کرنے اور ہماری زندگی کی شرطیں بجا لانے کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے ہم پر واجب ہے کہ خود ہم قوتِ عقل اور تجربہ کے ذریعہ ایک ایسی راہ اختیار کریں جس کے ذریعہ جلد سے جلد نہایت آسانی کے ساتھ، اس مقصد پر پہنچیں اور اس راہ سے مراد تعلیم و تدریس ہے

مترجمہ ابو المحاسن محمد محسن خان متین

مدرس فارسی مدرسہ وسطانیہ مستعد پورہ

———(۰)———

مدرس کی آواز

لائق مترجم نے ذیل میں ایک امریکی ماہر تعلیم ڈیوس صاحب کی تصنیف "دی ٹیچنگ ٹیچرس پرائمر" کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا ہے جو بلحاظ سلاست اور برجستگی قابل تعریف ہے چونکہ یہ کتاب ایک پختہ کار مدرس نے نوآموز مدرسین کے لئے لکھی ہے اس کا لہجہ تحکمانہ ہے، ہر جگہ حکم اور ہدایات کی بھرمار ہے۔ اس استادانہ انداز تحریر کو لائق مترجم نے شروع سے آخیر تک نباہا ہے، جو یقین ہے کہ قارئین کرام کے لئے باعث لطف ہوگا۔

شریک مدیر

مدرس ہونے کی حیثیت سے تمہاری آواز قدرتاً ایک اہم شئے ہے بغیر باقاعدہ آواز کے تم ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تم آواز کو بہتر سے بہتر طریقے پر استعمال بھی کرتے ہو۔ کیا تم اس پر اتنی ہی توجہ کرتے ہو جتنی کہ ضرورت ہے؟ مدرس کی آواز کے متعلق جو آسان قواعد ہیں، ان کی پابندی کو حقارت سے نہ دیکھو۔ اگر تم ان کے متعلق غور کروگے اور ان پر عمل کروگے تو اپنا بہت سا وقت بچا سکوگے۔ اور تمہارے کام میں بہت کچھ آسانی پیدا ہو جائے گی۔

تمہیں آواز کی مدد سے ضبط کے قائم رکھنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کو سراپا گفتگو بن جانا چاہیئے۔ نہیں۔ یہ بات تو مقصد سے کہیں دور ہوگی ضرورت صرف اتنی ہے کہ جہاں تک ہو سکے بے موقع رک جانے کو، بیچ کے وقفوں کو جن میں لڑکوں کے پاس نہ کرنے کو کوئی کام ہوتا ہے نہ دیکھنے اور سننے کو کوئی چیز ہوتی ہے ٹالنا چاہیئے۔ جس وقت تم تختہ پر لکھنے میں مشغول ہوتے ہو ظاہر ہے کہ اس وقت تمہاری نظر جماعت پر نہیں رہ سکتی ایسے موقع پر چاہیئے کہ اس کا خیال رکھو کہ تمہاری پیٹھ جماعت کی طرف نہ ہو بلکہ تم کسی قدر کج کھڑے ہو۔ عادت ڈالو کہ ترچھے ہو کر

جلد اور صاف لکھ سکو۔ اگر تختے پر لکھنے میں تمہیں کچھ دیر لگتی ہو (جیسا کہ اکثر مبتدیوں کا حال ہوتا ہے) یا بہت لکھنا ہو تو چاہیئے کہ لکھتے وقت بالکل خاموش نہ رہو بلکہ کچھ بولتے رہو جو لکھ رہے ہو اسی کے بارے میں کوئی بات کہتے جاؤ۔ لفظ کی صورت یا اس کی کسی اور خصوصیت کے متعلق جماعت کو توجہ دلاؤ۔ غرض یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے کوئی متعلق بات کہتے رہو۔ اس طرح اور بہت سے مختلف طریقوں سے تمہیں نظر آئے گا کہ آواز کا دانشمندانہ استعمال ضبط کے قائم رکھنے میں کتنا مددیتا ہے۔

لیکن شاید اس سے زیادہ اہم آواز کا صحیح استعمال ہے۔ میں یہاں پر بچوں کی بے ہنگم آواز، ان کے گندے تنفس اور منہ کی بدنما حرکات کا ذکر نہ کروں گا۔ یہ چیزیں تو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہینگی۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے کسی اور جگہ بیان کئے جائیں گے۔ جو چیز بہت اہم ہے وہ مدرس کی آواز کا بجا استعمال ہے بولتے وقت، خصوصاً جبکہ بچوں کے ساتھ بات کر رہے ہو تمہیں لفظ کے آخری حرف صحیح یا جزر کو اس طرح حذف نہ کر دینا چاہیئے کہ بچے تمہاری بات کو صاف طور پر سمجھ بھی نہ سکیں۔ اس سے سوءِ فہم کا اندیشہ اور غلط خیالات پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ یہ باتیں ایک مرتبہ راسخ ہونے کے بعد بڑی وقت سے دور ہوتی ہیں۔ کیونکہ عموماً بچہ پہلی مرتبہ جو بات سُن لیتا ہے اسی کو اچھی طرح یاد کر لیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمہیں بولنے میں صفائی کا بہت لحاظ رکھنا چاہیئے اس بارے میں اس کا خیال رہے کہ بات۔ ٹھیک واضح اور بغیر دہرائے کہی جائے۔ لفظ کے آخر کا جزر بے کھٹک۔ صاف اور صحیح ادا ہو۔ اس خوبی کے اکتساب کے لئے سب سے پہلی ضرورت صحیح طور پر سانس لینا ہے۔ تمہیں اختیار ہے کہ سانس منہ سے لو خواہ ناک سے۔ منہ سے سانس لینے میں قباحت یہ ہے کہ ٹھنڈی ہوا منہ کے پچھلے حصے اور حلق سے ٹکراتی ہے جس سے خشکی پیدا ہوتی ہے۔ ناک سے ہوا لینے میں سانس لمبی ہوتی ہے اور گرم ہو کر اور چھَن کر اندر جاتی ہے۔

تنفس کے عمل میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو سانس لینا دوسرے سانس چھوڑنا اور یہ دونوں آپ سے آپ ساتھ ساتھ جاری رہتی ہیں۔ جب تم سانس کی ریاضت

میں (جس کی پابندی ہر شخص کو روزانہ کرنی چاہیئے) مشغول ہو تو تمہیں چاہیئے کہ سانس لینے اور چھوڑنے میں نتھنوں سے کام لو۔ بولنے اور گانے میں منہ کو کھلا رکھنے اور حلق سے منہ تک کے راستہ کو بالکل کشادہ رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ آواز کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ آواز کو کام میں لاتے وقت بقدر امکان ناک سے سانس لیا کرو اور منہ سے سانس چھوڑا کرو۔

لیکن یہ خیال مت کرو کہ بولتے (یا گاتے) وقت سانس بھرنے سے پہلے تمہیں پھیپھڑوں کو خواہ مخواہ خالی کرنا ہی چاہیئے۔ زور دے کر سانس نہیں چھوڑنا چاہیئے کیونکہ جنجرہ اس دباؤ کی تاب نہ لا سکے گا۔ ایسے موقع پر زور دینے سے اکثر اوقات آواز خراب ہو جاتی ہے ایسی عادت سے تم اپنا لہجہ بگاڑ بیٹھو گے۔ جہاں تک ممکن ہو تھوڑی سانس سے کام لو۔ تمہیں ہلکی سانس کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تمہیں چاہیئے کہ سیدھے کھڑے رہا کرو۔ سامنے کے ڈسک یا میز کا سہارا نہ لو تختے پر جھکنے سے بھی بچو۔ پھیپھڑوں کو ہوا سے اچھی طرح بھر لو۔ بولنے (یا گانے) میں چھوٹی سے چھوٹی سانس سے ابتدا کرو۔ ہوا کی کمی کو پورا کرتے جاؤ یعنی پھیپھڑوں کو بالکل بھرا ہوا رکھو فقروں کے آخر میں گفتگو یا گانے کے بیچ میں مناسب موقع سے تھوڑی فاضل سانس لے لیا کرو

ہرگز اس طرح سانس مت لو جسے "ہنسلی کی ہڈی سے سانس لینا" کہتے ہیں۔ یعنی ہنسلی کی ہڈی کو اٹھا کر سانس نہ بھرو۔ اس طرح کرنے میں سینہ کے نشیب کے اوپر کے حصہ کو سکوڑنا پڑتا ہے۔ حالانکہ اس کو ڈھیلا رکھنے کی ضرورت ہے۔ پیٹ بچکا کر بھی سانس نہ لیا کرو۔ سینہ کے نشیبی حصہ کو تین سمت (قطروں) میں پھیلا سکتے ہیں۔ عمودی قطر میں پیٹ کو بچکا کر آریار والے قطر میں پسلیوں کو دونوں پہلو کی جانب حرکت دے کر پیش وپس کے قطر میں پسلیوں کو آگے کی جانب حرکت دے کر۔ ان تینوں حرکتوں کے مجموعہ سے غالباً بہترین نتائج پیدا ہوں گے۔ سانس لیتے وقت نیچے کی پسلیوں کو خاص کر باہر اور اوپر کی جانب حرکت دینا چاہیئے۔ بیداری کی حالت میں اس کی مشق کرو نیند میں خود بخود عادۃً تم ایسا کرنے لگو گے۔ پھیپھڑے کی ورزش کی بھی مشق کیا کرو نشست و برخاست کے

اندازہ کا خاص طور پر خیال رکھو۔ جب آہستہ بولنے سے آسانی سے کام چل سکتا ہے اور شاید بہتر طریقے سے چل سکتا ہے تو خواہ مخواہ چیخ کر نہ بولو۔

پھیپھڑے کی ورزش پہلی اہم شئے ہے۔ اس کے بعد آواز کی ورزش کا درجہ ہے۔ منہ کو پورا کھولنے کی عادت اس طرح ڈالو کہ دانت اچھی طرح دکھائی دیں پھر ان کو چھپا لو۔ جہاں تک ہو سکے زبان کو اندر کی طرف سمیٹے رکھو۔ غرض یہ ہے کہ اپنے منہ سے بھی ڈمبل والی ریاضت کرو۔ اس کے بعد حروف صحیح خصوصاً ٹ۔ م۔ ن۔ ک۔ ج۔ پ۔ ب کا تلفظ خوب واضح طور پر ادا کرو۔ اس کے بعد مشکل الفاظ کے تلفظ کرنے کی کوشش کرو تمہیں اس کی اکثر مشق کرتے رہنا چاہیئے یہ بات ناگوار تو معلوم ہوگی بعض لوگوں کو شاید عبث بھی نظر آئے۔ لیکن تم اس سے غفلت مت برتو۔ یہ ایک اہم شئے ہے۔ اور مدرس ہونے کی حیثیت سے تمہارے سارے کام پر اس کا نمایاں اثر پڑے گا۔ جوں جوں تم اپنے کام میں ترقی کرو گے تمہیں اپنی جماعت کے خراب تلفظ کی شکایت کا زیادہ موقع ملے گا۔ ایسی حالت میں تمہیں دیکھنا چاہیئے کہ تلفظ کا جو نمونہ تم پیش کرو وہ بہتر سے بہتر ہو۔ زور سے پڑھنے اور بولنے کی مشق باقاعدہ اور مسلسل جاری رکھو۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ روزانہ زور سے پڑھنے میں کم سے کم دس منٹ صرف کرو۔ اگر کوئی شخص سننے والا اور ٹوکنے والا تمہیں مل جائے تو تمہارے لیئے اور بھی بہتر ہے۔

اپنی جماعت کے بچوں کے سامنے تمہیں اکثر قصہ گوئی بھی کرنی پڑے گی۔ ایسے موقع پر موثر قصے سنایا کرو۔ اس سے بچوں میں دلچسپی اور گرویدگی پیدا ہوگی لیکن یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ تمہاری زبان صاف اور تمہارا تلفظ صحیح ہو۔ اپنی آواز کا خیال رکھو اور صحت و اطمینان کے ساتھ صاف صاف بات کیا کرو۔ شور و غل کو اپنی آواز سے دبا دینے کی کوشش نہ کرو۔

مترجمہ

سید عبدالشکور

طلبہ کی ہڑتال

(از)

جناب ڈاکٹر جی ایس کرشنیا پروفیسر تعلیم جامعہ میسور

عام طور سے طلبار کی ہڑتال کو سیاسی ہڑتال کا ضمیمہ اور تحریک سوراج اور عدم تعاون کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں قسم کی ہڑتالیں اور سلف گورنمنٹ کے حصول کی جدوجہد اور مستقل کوششیں ایک ساتھ شروع ہوئیں۔ غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ ابتدائی اسکولی ہڑتالیں سیاست بازوں کے اشتعال و اغوا سے ظہور میں آئیں۔ لیکن جتنا یہ غلط ہے کہ اسکولی ہڑتالیں عام ہڑتالوں کی آواز بازگشت ہیں اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ غلط ہے کہ ہر اسکولی ہڑتال کے پس پشت سیاسی ریشہ دوانیاں سرگرم عمل ہیں۔ بعد کی ہڑتالوں کا سیاست اور سوراج سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اسکولی ہڑتالیں، سوراج اور سیاسی ہڑتالوں کی طرح ان فطری احساسات و جذبات کی بیداری کا نتیجہ ہیں جو عرصہ سے خوابیدہ تھے۔ مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے اور یہاں بھی جابر و مجبور کے دو متقابل فریق ہوتے ہیں۔ اگر ان میں اشتراک عمل اور باہمی ہمدردی نہ ہو تو تعلقات ناخوشگوار ہو جاتے ہیں اور جب معاملہ فہمی کی کوئی صورت نہیں رہتی تو مجبور طبقہ حقوق طلبی کے لئے اس آلہ حرب سے کام لیتا ہے جسے عرف عام میں ہڑتال کہتے ہیں۔ احمد آباد اور میسور کی ہڑتالیں اسی حق تلفی اور حق طلبی کی کشاکش کی مثالیں ہیں۔

ذیل کے فاضلانہ مضمون میں جامعہ میسور کے لائق پروفیسر تعلیم ڈاکٹر جی ایس کرشنیا نے ہڑتال پر نفسیاتی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور اس کے اسباب و علل کی صراحت کر کے جو مشورہ دیا ہے اس پر عمل کرنے سے ہڑتال کے وقوع کا امکان باقی نہیں رہتا بلکہ معمولی حالت میں بھی اس طریقہ عمل سے تعلقات معلم و متعلم میں خوشگواری کلام میں عمدگی اور خوش اسلوبی اور دلفریبی پیدا ہو جائیگی۔

مدیر

ہڑتال کے اسباب متعددہ میں سب سے زیادہ مقدم سبب یہ ہے کہ مدارس میں بچوں کے حیوانی جذبات کو کام میں نہیں لایا جاتا۔ یہی بند قوت فطرۃً کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈتی ہے۔ جو نظام تعلیمی "خاموش بچوں" کو سراہتا اور "خاموش باش" کی ہمیشہ تلقین کرتا ہے اس سے یہ توقع عبث ہے کہ فاضل بخارات کے مناسب مصرف کی کوئی سبیل نکالے گا۔ اس لئے مدرسہ کے کند نظام العمل سے کونسا لڑکا گاہے گاہے بچنا نہیں چاہتا۔ ہڑتالوں کا ہونا تعجب خیز نہیں بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ ہڑتالیں زیادہ نہیں ہوتیں۔ اگر نوعمر بچے جو عنفوان شباب کے فطری ولولوں سے لبریز ہوتے ہیں ایک دن تعطیل نہ منائیں یا کام میں ڈھیل نہ دیں یا کوئی خلاف عادت کام نہ کریں تو اُن کا یہ فعل قانون فطرت کے منافی ہوگا: امریکن طلباء کو ایک دن ایسا ملتا ہے جبکہ وہ ادباشوں کی تمثیل کرتے ہیں۔ اس دستور شکن جدت طرازی اور آزادانہ کھیل و تماشے تناؤ کو ڈھیلا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات بچوں کی تعلیم میں کھیل کی زیادہ ضرورت پر زور دے رہے ہیں آج کل جدید خیالات کے حامیوں کی خواہش ہے کہ معاشرتی، تعلیمی نیز جسمانی اوصاف کھیل سے حاصل کئے جائیں۔ اور اس مقصد کے لئے بازی گاہوں پر اگر پختہ کار و تجربہ کار حضرات کی نگرانی کا انتظام نہ ہو سکتا ہو تو کسی معمر طالب علم (Adults) کی نگرانی کا ہی انتظام کیا جائے۔ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ نوعمر بچوں کو حکام کے وضع کردہ قواعد کے توڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن بہت کم لوگ اس پر غور کرتے ہیں کہ جب خود حکام اپنی ناممکن ضروریات کی غیر طبعی بجا آوری کے لئے خدا اور قدرت کے ہر ایک حکم کو توڑیں تو اُس وقت کیا ظہور پذیر ہونا چاہیئے۔ ہم میں سے بعض یہ بمشکل یقین کریں گے کہ مدرسے طلباء کے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ طلباء مدرسہ کے لئے۔

زائد مصروفیتیں کسی ممنوعہ ولولے کے لئے جو پہلا موقعہ ملے اس سے فائدہ اُٹھانے کی آمادگی کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ مدرسہ سے متعلق مدرسہ کے اندر اور باہر بہت سی مصروفیتیں مہیا کی جائیں۔ چونکہ روایتی نصاب تعلیم مصروفیتوں کے لئے بہت کم وقت بچا پاتا ہے۔ اور قوت و جوشش کے ہولناک ذخیرہ کو بہت کم

کام میں لایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ خارج از نصاب مصروفیتوں مثلاً تفریحات، اجتماع، اسکوٹنگ، کھیل، مدرسہ کے اخبار و رسائل، ڈرامہ کلب، انجمنہائے مذاکرہ، انجمن موسیقی اور مجلس الطلبہ وغیرہ کو رواج دیا جائے۔

ایک اور سبب مستعدہ، طلباء، اساتذہ اور حکام کے درمیان ہمدردی کی کمی ہے۔ اس عدم توجہی اور سرد مہری سے قطع نظر جو اکثر اساتذہ اور حکام کے درمیان ہوتی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ طالب علم کے دماغ اور فطرۃ میں وہ ادراک نہیں ہے جس سے طلبا اور دوسروں کے درمیان باہمی اخوت کا احساس پیدا ہو طالب علم کو ایسی جنس خیال کیا جاتا ہے کہ جس پر حکومت کی جانی چاہیئے اور مطیع و تابعدار رکھا جائے جب تک اساتذہ اور مدارس کے حکام اپنے سلوک اور طرز روش سے یہ نہ ظاہر کریں کہ انہیں یقین ہے کہ مدرسہ بچہ کے لئے ہے اور وہ اس تعلیم گاہ کا سبب ہے اس وقت تک بچہ اس سلوک کو جو اس کا حق ہے حاصل نہیں کر سکتا۔ انسان ہمدردی کی خواہش کرتا ہے اور چونکہ طلبا بھی انسان ہیں اس لئے وہ بھی اپنے بالادست سے ہمدردی چاہتے ہیں۔ جب وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ حاصل نہیں ہو سکتی تو فضا ہڑتال کے امکان سے بھر جاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہڑتال افسران بالا کی لاپرواہی اور سنگدلی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہے اور برائیوں کی اصلاح کی معقول کوشش کی نہیں بلکہ ناسمجھی کی کوشش کی قابل غور مثال ہے۔ جلد نتیجہ برآمد کرنے اور معمولی اصلاح کے لحاظ سے غالباً ہڑتال کی کوشش عارضی قدر و قیمت رکھتی ہے لیکن اخلاقی حیثیت سے یہ چوہے کی اس کوشش کے مماثل ہے جو وہ پنجرے سے نکل بھاگنے کے لئے کرتا ہے جس کی اصلیت سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔

جب ہمدردی ظہور میں نہیں آتی اور انسدادی تدابیر سے ڈرایا جاتا ہے تو ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ بچپن کا جھگڑالو پن ظاہر ہوتا ہے اور وہ مقابلہ کے لئے ابھارتا ہے۔ وہ پیام جنگ قبول کر لیتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا عنصر ہے جسے نہ توٹالا اور نہ ناراض کیا جا سکتا ہے بازی جیتنے کی

خواہش ہوتی ہے اور ان کو سامنے یہی کھلا رستہ نظر آتا ہے کہ وہ وہاں سے چلے جائیں کم از کم جب دباؤ سے بغاوت کا احتمال ہو تو ارباب نظم ونسق کے اختیار نیسری کو دلیری پر ترجیح دینا چاہیئے۔ بچپن اور جوانی کی نفسیات کا مطالعہ اساتذہ اور حکام دونوں کے لئے نہایت بے بہا ثابت ہوگا۔ فی الحقیقت یہ امر عجیب وغریب ہے کہ اسے اب تک ضروری خیال نہیں کیا گیا۔

مدرسہ سے محبت تیسرا سبب جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے تعلیم گاہ سے جس سے کہ کسی طالب علم کا تعلق ہو، وفاداری کی عام کمی ہے۔ ہندوستانی مدارس اور کالجوں میں یہ کمی نمایاں ہے۔ مدرسہ سے محبت کی کمی پھوٹ ڈالنے والی اور تفرقہ انداز قوتوں کا (جو کم وبیش ہمیشہ موجود رہتی ہیں) جلد شکار ہونے کا موقع دیتی ہے۔ (محبت کے حاصل کرنے سے پہلے تعلیم گاہ میں کسی خصوصیت کا جو باعث فخر ہو، ہونا ضروری ہے اور یہ فخر اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک وہاں ایسی اشیا موجود نہ ہوں جن پہ طلبا فخر کریں۔) عام طور پر ان کو کسی ایسے کام سے روکنے کی کوئی چیز نہیں ہے جو ان کی تعلیم گاہ کی بدنامی کا باعث ہو۔ اگر ان میں اپنی تعلیم گاہ کے نیک نام کی تعظیم وتکریم کرنے کی ذمہ داری اور فرض شناسی کا احساس پیدا کر دیا جائے اور وہ اس خیال کو آئندہ نسلوں میں زیادہ بہتر اور شریفانہ طور پر منتقل کر دیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ ان امور سے جن کے وہ عام طور پر عادی پائے جاتے ہیں احتراز کرنے لگیں۔

اتحاد کے احساس کو ترقی دینے اور کالج کا جوش بڑھانے کے لئے کئی چیزیں سہولت سے کی جا سکتی ہیں۔ اساتذہ اور طلبا کے ہفتہ واری یا اس سے کم عرصہ کے اجتماع تو بہت بڑی بات ہیں اگر کم از کم ہر میقات کی ابتدا اور اختتام پر باقاعدہ اجتماع کا بندوبست کیا جائے تو طلبا اور اساتذہ کو باہمی تعارف کا موقعہ ملے گا اور انہیں احساس ہوگا کہ وہ ایک ہی علمی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم گاہ کی روایات اور تاریخ کے متعلق عام معلومات کا ذخیرہ طالب علم کی نوٹ بک اور ڈائری محفوظ کر دے گی۔ جھنڈیاں مخصوص جھنڈے تمغے کالج کے گیت بہت بڑے اتحادی ذرائع کا کام دیتے ہیں۔ مدرسے سے طلبا کے

تعلق کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے اور اس کا حق رکھنے کی نسبت اور بھی کم۔ رجسٹر طلبائے قدیم طلبا کو اپنے مدرسہ سے اور موجودہ طلبا کو ایک دوسرے سے ارتباط رکھنے کا کام دیگا۔

مدرسہ میں طلبہ کی دلچسپی کو مدرسہ کی مصروفیتوں کے انتظامات میں کچھ حصہ دے کر بڑھایا جا سکتا ہے۔ خواہ طلبا خود اپنا ضبط قائم رکھنے کے قابل نہ ہوں لیکن وہ مدرسہ کے متعلقہ معمولی کاموں کا انتظام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کسی نے کہا ہے کہ "لینے سے دینا زیادہ بہتر ہے" بہت درست کہا ہے جو طالب علم اپنا وقت اور قوت مدرسہ کے لئے صرف کرتا ہے وہ اپنے اس حصہ کے خیال سے اس کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے۔ اگر ان مواقع کو زیادہ کیا جا سکے تاکہ زیادہ طلبا مدرسہ کے کاموں میں حصہ لے سکیں تو مدرسہ کے زیادہ دوست پیدا ہو سکیں گے۔ اور ایسی دلچسپیوں اور ذمہ داریوں سے فساد کا مسئلہ ناممکن ہو جائیگا۔ نیز یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں نہایت برا اور نامعقول ضبط وہ ہے جو خوف سے قائم کیا جائے اور بہترین وہ ہے جو خود بخود پیدا ہوا اور اس لئے پیدا ہو کہ پورا گروہ اپنے دستور کو قائم رکھنے پر ناز کرتا ہے۔ قواعد وضوابط مقابلہ کے لئے بلاوا ہیں۔ تہدید، تہدید دینے والوں کی تکلیفوں میں صرف اضافہ کرتی ہے۔

مجلس نمائندگان طلبہ سے ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ وہ نہ صرف مدرسہ کے انتظامات میں حصہ لینے لگتے ہیں بلکہ اپنی تکلیفات اور مسائل کے ظاہر کرنے کا جائز راستہ حاصل کرتے ہیں اگر طلبا میں یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ مدرسہ کی شہرت قائم کرنا اور عمدہ روایات کا بنانا ان کی مشترکہ ذمہ داری ہے تو نکتہ چینی اور عیب جویانہ اعتراضات میں بہت کمی پیدا ہو جائے گی ہمارے کالجوں اور مدرسوں نے انتظامی معاملات میں طلبا کو شریک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شرکت کا احساس بغاوت کے خلاف مستعد کرنا ہے۔

طلبا میں اہلیت پیدا کرنا | ایک اور قابل لحاظ مسئلہ جسے یہاں نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا طلبا میں تاقین و تشہیر کی اہلیت پیدا کرنے کی ضرورت کا ہے۔ اس سے وہ ہر ایک عقیدہ سے متاثر ہونے سے باز رہیں گے جو ان کے سامنے آئے۔ ہماری طرز تعلیم کے نقائص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ طلبا کو خود غور کرنے اور علمی اصول کا طرز اختیار کرنے کا بہت کم موقعہ دیتی ہے طلبہ کو نہ کبھی مشاہدہ کا موقعہ دیا جاتا ہے اور نہ ان کو امور مندرجہ کتب اور اساتذہ کی رایوں سے اختلاف کرنے کی ہمت دلائی جاتی ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ طلبا میں ذاتی فراست پیدا ہو وہ ان تمام امور پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں جو وہ سنتے یا پڑھتے ہیں۔ اور وہ اکثر ان قیاسی حقائق کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔

جب سے کہ ہندوستان میں برطانوی طریق تعلیم کی برائیاں سمجھ میں آنے لگی ہیں ماہرین تعلیم تنقیدی طرز کو ترقی دینے کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک کہ امتحانات میں کسی دوسرے شخص کی رائے یا خیالات حرف بحرف ادا کرنے سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں، نیز جب تک مدلل اختلافات کو نہ مانا جائے۔ جماعت میں زائد مطالعہ کو رواج دینا چاہئے۔ اور اختلافی بیانات کو وقعت نہ دینے کی بجائے ان کی خواہش کرنی چاہیئے۔ مطبوعہ صفحہ کے واجب التعظیم خیال کو ان غلطیوں اور اختلافات کو جو اخبارات، رسائل اور کتب میں اکثر پائی جاتی ہیں بتا کر کم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ جمہوریت اور حق تو طن میں زیادتی کرنے کے لئے ایسی تنقیدی رغبت ناگزیر ہے۔ مدرسہ ہی کے ذریعہ سے خاموش غور اور مشاہدہ کی اہمیت کی تربیت دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیئے۔ اور ایسی تربیت نوجوانوں کے بلا غور تجویز اور پروپاگنڈا کرنے کو ناممکن کر دے گی اور جلد بازی سے کام لینے سے جو ایسے تیز و تند نوجوانوں کا خاصہ ہوتا ہے روکے گی۔ جب تک کہ عقلی قابلیت کی مشق معاشرتی سچائی کی حد تک بلند نہ ہو، لاعلمی و جہالت کے نتیجہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔

مترجمہ حفیظ اللہ میر

اول مددگار مدرسہ وسطانیہ چنچل گوڑہ بلدہ

کم استعداد طلبہ کا مسئلہ نفسیاتی نقطہ نظر سے

کسی جماعت یا مدرسہ میں ایک ہی قسم یا ایک ہی ذہن کے بچے نہیں ہوتے ہیں کچھ ذہین ہوتے ہیں اور کچھ غبی۔ اور کچھ تو بالکل ہی کمزور دماغ کے ہوتے ہیں جو معمولی سی بات کو بھی نہیں سمجھتے۔ جب بچوں کی حالت میں بلحاظ ذہن اور قوت کے اس قدر اختلاف ہوتا ہے تو بھلا اندازہ کیا جائے کہ کہاں تک ہم اُن کو ایک ہی جگہ اور ایک ہی طریقہ سے تعلیم دے سکتے ہیں اسلئے ہم کو مجبوراً ان کمزور بچوں کے لئے کوئی جداگانہ طریقہ اختیار کرنا اور دورانِ تعلیم میں ان کی استعداد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں بچوں کی ذہنی حالت دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ مدرسین کو ہمیشہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اُن کی تعلیم و ترقی کا دارومدار بھی ان ہی حضرات کی کوشش اور عمل پر موقوف ہے اس لئے مدرسین کے لئے بیحد ضروری ہے کہ بچوں کے عادات و خصائل کو پہچانیں اور ان کی عقل و ادراک کا اندازہ لگا سکیں۔ علم النفس ایک ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ سے انسان کے نفسی حالات کی تشریح و توضیح کی جاسکتی ہے مگر پھر بھی کوئی ایسے اصول مرتب نہیں ہو سکتے جن سے ذہنی ارتقار کی تجزی ہو سکے اور کسی خاص شخص کے اندرونی حالات اور قلبی واردات کو بیان کیا جاسکے چونکہ ہم کو اس علم سے بھی پوری مدد نہیں ملتی لہذا ہم کو اپنے ذاتی مشاہدہ پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور مجبوراً ایسی کوئی تدبیر اختیار کرنی پڑتی ہے جس سے بچوں کے عادات و خصائل اور ذہنی قابلیت کا اندازہ ہو سکے۔ ہر مدرس اپنے تجربہ کی بنا پر اس فرق کو معلوم کر سکتا ہے جو کہ ایک تیز فہم اور کند ذہن لڑکے میں ہوتا ہے۔ جب ایک لڑکا بہت جلد سبق یاد کر لیتا ہے مگر بہت جلد بھول بھی جاتا ہے تو دوسرا دیر سے یاد کرتا ہے مگر زیادہ یقین کے ساتھ۔ ایک لڑکا مستعد چالاک اور زندہ دل ہوتا ہے تو دوسرا شاید و بیا ہی غبی اور سست۔ ایک لڑکا کسی مسئلہ پر غور کرتا ہے مگر نہایت عجلت کے ساتھ اوس کے متعلق رائے قائم کر دیتا ہے تو

دوسرا لڑکا حزم و احتیاط کو کام میں لا کر پورے استقلال اور کامل غور کے بعد رائے قائم کرتا ہے۔ ایک لڑکا باوجود کوشش پیچھے رہتا ہے تو دوسرا اپنی ذہن کا پکا ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنی ان تھک کوششوں کو جاری رکھتا ہے۔ (ایک لڑکا تیز طبیعت کا ہوتا ہے مگر دل کا شریف اور دوسروں کی حالت پر رحم کھانے والا) دوسرا لڑکا جلد غصہ میں نہیں آتا مگر بعض وقت اُس کو لوگوں پر بالکل رحم نہیں آتا۔ ایک لڑکے میں قوت کشش زیادہ ہوتی ہے اور وہ جلد ہر دل عزیزی اختیار کر لیتا ہے تو دوسرے لڑکے کو زیادہ وقت کی ضرورت ہے مگر جب وہ دوسروں کی مہربانی حاصل کر لیتا ہے تو اُس کو پھر کبھی نہیں کھوتا۔ ایک لڑکا موجودہ واقعات کو مدنظر رکھتا ہے تو دوسرا مرد عاقبت اندیش ہوتا ہے اور مستقبل کو پیش نظر رکھتا ہے۔

بچوں کی طبیعت اور ذہن تیز یا سست ہونے کے سوائے قوی یا کمزور بھی ہوتے ہیں اس بنا پر طبیعت کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ تیز۔ افسردہ۔ جوشیلی۔ کاہل صفراوی طبیعت کے لوگ قوی اور تیز ہوتے ہیں اور یہ لوگ ظاہری واقعات کا خیال زیادہ کرتے ہیں۔ سوداوی طبیعت کے لوگ اکثر افسردہ اور غمگین اور ذکی الحس ہوتے ہیں اس قسم کی طبیعت کے لوگ جب کسی بات کا دل میں بہت دیر تک خیال کرتے رہتے ہیں تو اُن کو اُسی بات کا خیال بار بار تکلیف دیتا رہتا ہے تیسری قسم کے لوگ دَموی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جوشیلے۔ شوقین اور اُمیدوں سے بھرے ہوئے تو ہوتے ہیں مگر اُن کو استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوتھی قسم میں بلغمی طبیعت کے لوگ ہیں جو کاہل ہوتے ہیں مگر طبیعت کے مستقل۔ طبیعتوں کی تقسیم اس طور پر جالینوس نے سترہ سو سال پیشتر کر دی تھی۔ ایک مدرس جو اپنے شاگردوں کی طبیعت انفرادی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اوس کے لئے یہ قدیم قاعدہ درحقیقت بہت کارآمد ہے۔ مگر مدرس کو نہ چاہئیے کہ بچوں کے طبائع کو بالکل اس قاعدہ کے مطابق تقسیم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ بعض بچوں کی طبیعت ایک سے زیادہ قسم میں داخل ہو سکتی ہے۔ بعض بچوں کی ذہانت اوسط درجے سے بھی گری ہوئی ہوتی ہے جن کی حالت کو

غیر معمولی (Abnormal) کہتے ہیں۔ ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ جن کے متعلق مدرسین کے لئے معلومات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ کمزور لڑکے ان ہی میں سے ہوتے ہیں ہیں سب سے نیچے کے درجے میں احمق (Idiot) ہوتے ہیں۔ ان بدقسمت لڑکوں میں ذہنی قوت نہیں ہوتی۔ یہ لڑکے اپنی حالت سنبھالنے کے قابل نہیں ہوتے ان کے لئے نگرانی کی اتنی ہی سخت ضرورت ہے جتنی کہ ایک چھ ماہ کے بچے کے لئے۔ دوسرے درجہ میں ضعیف العقل شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ لڑکے دماغ کے کمزور ہوتے ہیں۔ اگرچہ اپنی نگرانی آپ کر سکتے ہیں مگر دوسروں کے توسط سے کام نکالنا نہیں جانتے مثلاً کسی جسمانی خطرہ سے خود کو بچا سکتے ہیں مگر کسی قسم کی نوکری کرنے اور روزی کی تلاش کرنے کے قابل نہیں ہوتے اس لئے ان کو خاص نگرانی اور اعانت کی ضرورت ہے۔ تیسرے درجہ میں وہ لڑکے شامل کئے جاتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی کارخانہ میں نوکری کر سکتے ہیں مگر ان کی تعلیم معمولی تحتانیہ مدارس میں نہیں ہو سکتی ان کو عام طور سے کمزور دماغ کے لڑکے کہتے ہیں۔ چوتھے درجہ میں غبی اور سست لڑکے شمار کئے جاتے ہیں ان کو اوسط درجہ کے بچوں کے ساتھ تعلیم دے سکتے ہیں مگر ان کی تعلیم میں مدرسین کو بہت سخت زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور عام طور سے مدرسین کو ایسے ہی لڑکوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بچوں کی بہتری کے لئے اور سوسائٹی کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے پہلے دو نوں درجہ کے بچوں کے لئے اسپیشل مدارس ہونے چاہئیں تیسرے درجہ کے بچوں کے لئے انگلستان اور جرمانیہ میں خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے۔ ان کی آبادی دو یا ایک فیصدی ہوتی ہے ان کو خانگی زندگی کے اثرات سے دور کردینا اور اوسط درجہ کے بچوں سے ملنے جلنے سے روکنا ایک غلطی خیال کی جاتی ہے البتہ ان کو ایک چھوٹی سی علٰحدہ ٹولی میں زیادہ تر دستکاری کی تعلیم دیجاتی ہے اوسی کے ذریعہ ان کے دماغ کی ساخت کی اصلاح بھی کی جاتی ہے۔ تجربہ کار حضرات کا خیال ہے کہ اگر ان کو اچھی طرح تعلیم دی جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ معمولی مدارس کی

شرکت کے قابل ہو جاتے ہیں گو وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ نہ پڑھ سکیں اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں کے بعض طالب علم کوئی ایک پیشہ دستکاری کی قسم سے اختیار کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں جس میں کافی ہوشیاری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اس موقع پر نوجوان مدرسوں کو ایک مفید مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے چند بچوں کے متعلق خاص طور سے کافی معلومات پیدا کریں۔ اگر ان بچوں میں وہ ایسے ایک دو بچوں کو بھی شامل کر لیں جن میں کہ جسمانی اور ذہنی حرکات غیر معمولی نظر آئیں تو یہ بات اون کے مقصد کے لئے نہایت مفید ہے۔ مدرسین کو چاہیئے کہ اُن کی جسمانی اور ذہنی حالت اور حرکات کو نوٹ کر لیں اور اُن کے ہم عمر اوسط درجے کے لڑکوں سے جو فرق بلحاظ بصارت سماعت تنفس اور قوت میں نظر آوے اوس کو بھی نوٹ کر لیں۔ اون کی اشتہا اور نیند کے متعلق بھی اطلاع حاصل کی جائے۔ اون کی قوت توجہ۔ قوت حافظہ۔ قوت ذائقہ۔ مزاج۔ طبیعت۔ کے متعلق جو کچھ معلومات حاصل ہوں اون کو لکھ رکھے۔ اگر کوئی مدرس اس طرح تحقیقات کیا کرے اور وہ اپنے مقصد میں مستقل رہے تو یقیناً وہ چند روز میں نفس اطفال کا خاصہ مطالعہ کرنے والا مدرس بن جائے گا اور اُس کو بخوبی معلوم ہوگا کہ ہر ایک بچہ ایک علیحدہ شخصیت رکھتا ہے ایسی صورت میں مدرس کا فرض ہے کہ اون کی شخصیت کا خیال ضرور رکھے اور طریقہ تعلیم و تربیت بھی اسی لحاظ سے جداگانہ ہونا چاہیئے۔
اسی ضمن میں مدرسین کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کے گذشتہ حالات پر جہاں تک کہ اون کا حافظہ مدد دے غور کریں بلاشبہ اون کو اپنے بچپن کی باتیں مکمل طور سے یاد نہ آسکیں گی بلکہ فرداً فرداً کچھ یاد آجائیگا اور اُس میں کچھ اون کا تجربہ بھی شامل ہو جائیگا۔ اُس کے بعد اپنے بچپن کے حالات سے موجودہ بچے کی حالت کا جو اون کے زیر تعلیم ہے مقابلہ کر کے دیکھیں اور سوچیں کہ اگر وہ بھی اس حالت میں ہوتے تو اون کے ساتھ کیا کیا جا سکتا تھا۔ اون کو اپنا وہ پچھلا زمانہ یاد کرنا چاہیئے کہ جب وہ بچے تھے تو کس طرح سوچتے تھے اور اُن کی قوت احساس کتنی تھی۔ بہر حال اس قسم کے نتائج بہت مفید ثابت ہونگے۔

ذہنی مطالعہ کے سوائے بچوں کی جسمانی حالت کا بھی معائنہ لازمی ہے۔ اُن کی عمر لکھ لی جائے۔ وزن بلندی اور سینہ کی چوڑائی بھی دیکھ لی جائے۔ اُن کی سماعت و بصارت کا امتحان کر لیا جائے۔ اون کی آنکھوں کی حرکات سے جسم کی وضع قطع سے اور تھکاوٹ سے اون میں ترقی کے معاملات کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا اُمور کا لحاظ کر کے سبق دیا جا سکتا ہے اور اُن کی خوراک کی مقدار نیند کی ضرورت اور تازہ ہوا کی حاجت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مدرسوں میں بعض بچے آدھا پیٹ کھا کر آتے ہیں۔ لباس پورے طور سے مہیا نہیں کر سکتے۔ ایسے کمزور اور مفلس بچے خوش حال لڑکوں کی طرح ذہنی محنت نہیں کر سکتے۔ اگر ان بچوں کو ہوم ورک دیا جائے تو اون کی صحت اور بھی برباد ہو جاتی ہے۔

اس معاملہ میں ایک بڑے مدرسہ کو زیادہ مواقع حاصل ہیں بشرطیکہ وہ اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہئے کمزور طالب علم میں ایک خاص ذہنی حالت ہوتی ہے اوس کو بتدریج سکھلانے اور دیر تک تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ بسا اوقات اوس کو بالکل علحدہ نصاب کی ضرورت ہوتی ہے وہ تیز اور ذہین لڑکوں کے ساتھ تعلیم نہیں پا سکتا۔ اس لئے ایک بڑے مدرسہ کے مدرسین زیادہ تعداد سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جماعت کے لڑکوں کو استعداد یا ذہنی قوت کے لحاظ سے ٹولیوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کسی جماعت کے دو حصہ اس طرح کئے جانے چاہئیں۔ ایک حصہ ہوشیار لڑکوں کا ہو اور دوسرا کمزور لڑکوں کا۔ اس قسم کی تفریق سے تعلیم میں بہت سہولت ہوگی اور ہر قسم کے طالب علم کو مکمل طور سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس قسم کی تقسیم کا علم لڑکوں پر ظاہر نہ ہونے پائے کہ ایک فریق کند ذہنوں (BIOCKHEADZ) کی بھی ہے۔ تفریق میں حقارت آمیزانہ طرز عمل نہ اختیار کیا جائے بلکہ ضرورت کے لحاظ سے اور لڑکوں کی بہتری تصور کی جائے۔ اس تدبیر کے ذریعے ایک بڑے مدرسہ میں مشکلات آسان ہو سکتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ایک چھوٹے مدرسہ میں مدرس ان مشکلات کا سامنا کس طرح کرے؟۔ اور کس طرح کمزور اور قابل لڑکوں کا ایک ہی جماعت میں لحاظ کرے۔

عام طور سے لوگ ذہین اور تیز لڑکوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور کمزور لڑکوں کی طرف سے چشم پوشی کر لی جاتی ہے صرف اس خیال سے کہ لایق لڑکوں سے اوستاد اور مدرسہ کی نیک نامی ہوتی ہے اس کے سوائے بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسے لڑکے بہ نسبت غبی لڑکوں کے دنیا اور قوم کے کام آسکتے ہیں مگر ہم کو ایسا ظلم نہ کرنا چاہیئے بلکہ غبی لڑکوں کو بھی کارآمد بنانے کی کوشش کی جائے۔ غبی لڑکوں کی مدد کے لئے ہم کوئی خاص قاعدہ نہیں جاری کر سکتے کیونکہ اس کے متعلق قواعد کا جاری کرنا اوستاد کی سمجھ اور قابلیت پر موقوف ہے علم ریاضی میں ایک جماعت کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ جماعت کا ایک حصہ الجبرا شروع کر سکتا ہے جبکہ دوسرے کمزور لڑکے حساب کی مشق کرتے رہیں کیونکہ اُن کو ابھی اس مضمون میں زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ اگر دوسرے مضامین میں اس قسم کی تفریق نہ ممکن ہو اور مشکلات پیدا ہوں تو ذہین طلبا کو زیادہ مشق کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ لڑکے اسی کام کو کرتے رہیں اور اپنے کام میں مشغول رہیں جبکہ اوستاد کمزور طلبا کی طرف خاص توجہ کرے۔

اوستاد اپنے طریقہ تعلیم میں ایک خاص خصوصیت پیدا کر سکتا ہے جبکہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں کمزور بچوں کا خیال رکھے گا۔ البتہ اس صورت میں بہت سے سوالات کمزور لڑکوں سے کئے جائیں گے مگر تمام سوال آسان ہوں گے۔ نئے سوال پیچیدہ باتیں اور دریافت طلب عقل لڑانے کی باتیں تیز لڑکوں سے پوچھی جائیں گی۔ ان ہی سوالات کا اعادہ غبی لڑکوں سے کرایا جائے گا۔ جو کچھ تیز لڑکے جواب دے چکے ہیں اور حل کر چکے ہیں۔ اُن ہی کا خلاصہ غبی لڑکوں سے کرایا جا سکتا ہے۔ ایک وقت سُن لینے کے بعد وہ اوس کو کس قدر آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اوستاد کو سمجھنا چاہیئے کہ لڑکے اگرچہ جماعت میں مختلف قسم اور لیاقت کے رہتے ہیں مگر وہ سب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں اور اون کی حالت مشترک حیثیت رکھتی ہے۔ جماعت کو ایک قسم کی اجتماعی زندگی کا شعبہ تصور کیا جائے نہ کہ انفرادی زندگی کا۔ جماعت میں نمبرات کے ذریعہ انفرادیت پیدا کرنے کے عوض اشتراکیت کا مادہ پھیلایا جائے تاکہ سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔

اس موقع پر ڈاکٹر مونٹاسوری کے طریقۂ تعلیم کا حوالہ دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کیونکہ اوس کے اصول اور طریقے ابتدا ایں ناقص القویٰ بچوں کے لئے مخصوص تھے۔ ڈاکٹر مونٹاسوری ملک اطالیہ کی پہلی لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اوس کو اپنے ملک کے پاگل خانہ میں کام کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اوس کو اپنے دوران ملازمت میں دیوانے اور ناقص القویٰ بچوں سے جو خاص دلچسپی ہوگئی تھی اوس کی وجہ یہ تھی کہ اولاً اوسنے اون کے عادات وحرکات اور خصوصیات کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا تھا نیز اوس کو اُن کی تعلیم دینے کی تدابیر پر اچھی طرح غور کرنے کا موقعہ ملا تھا بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہونچی کہ بچوں کے قویٰ کی کمزوری اور ذہنی نقص کا علاج دوا سے زیادہ تعلیم کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ایک خاص طریقہ اون کی تعلیم کے لئے اختیار کیا جائے۔ اس کے بعد اوسنے ناقص القویٰ بچوں کے لئے ایک مدرسہ کا افتتاح کیا۔ وہ اُس مدرسہ میں مخصوص طریقہ پر تعلیم دیتی تھی اور مدرسین کو بھی خاص طور سے اسی غرض کے لئے تربیت کرتی تھی اوس نے پیرس اور لندن میں جاکر اسی مسئلہ کے متعلق تجربہ حاصل کیا۔ آخر میں اوس نے اپنی محنت اور کوشش کے ذریعہ یہ رائے قائم کی کہ جن طریقوں سے کہ پاگل لڑکوں کو تعلیم دی جاتی ہے اون میں کے بعض طریقے اوسط درجے کے لڑکوں کی تعلیم میں کارآمد ہوسکتے ہیں اور معمولی تحتانی مدارس میں بھی ان طریقوں کو رواج دینا چاہیئے۔ اُس نے اس مسئلہ کے متعلق کتابیں شائع کیں اور اون کو مدارس میں جاری کردیا۔

ڈاکٹر مونٹاسوری کے خیالات فلسفیانہ نہ تھے۔ وہ تحصیل علم کا واحد ذریعہ برخلاف عام خیال کے تجربہ اور آزمائش کو خیال کرتی تھی۔ آزادی تعلیم کا نہایت اہم جزو ہے اُس کا مطمح نظر یہ تھا کہ بچوں میں جمہوری خیال کی پرورش کی جائے۔ بچہ کے نفس احساسات اور تحریکات اور اندرونی خیالات کو آزادی کے ساتھ ظاہر ہونے دیں اون کو خودمختاری دی جائے کہ وہ اپنا انتظام آپ کرسکیں۔ بغیر دوسروں کی مدد کے کام کرنے کے قابل بن جائیں جماعتوں میں پڑھنے کے لئے مجبور نہ کئے جائیں بلکہ اون کو اُن کی خواہش پر چھوڑ دیا جائے۔

ڈاکٹر مونٹاسوری کا اصول ہے کہ بچہ کا ذہن بچہ کی ذاتی سعی کے ساتھ ساتھ ترقی پائے اس غرض سے اُس نے خاص آلات تعلیمی جاری کئے ہیں جو تعداد میں ۲۶ ہوتے ہیں بچوں کو ان آلات سے خاص مشق کرنی پڑتی ہے جن کے استعمال سے بچہ اپنی غلطی آپ محسوس کرتا ہے اور درست بھی کر لیتا ہے۔ مونٹاسوری کا اصول نہیں چاہتا کہ بچوں کی قوت تحریک پر کوئی بیرونی اثر پڑے بلکہ وہ اندرونی قوتوں کو کام میں لائے۔

بعض ملکوں میں جو لڑکے ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اُن کو علیحدہ طور سے تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ اُن کو اُسی قسم کی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کے دماغ کی ساخت ناقص ہوتی ہے ان کے دماغ کے اُس حصہ کو جس میں حرکت کرنے کا مادہ ہوتا ہے پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اُن کو دوسرے بچوں کے ساتھ تعلیم دی جائے تو کوئی فائدہ نہیں اُن کے لئے خاص تعلیم کی ضرورت ہے جس کی ابتدا ممالک متحدہ امریکہ میں ۱۸۳۷ء میں کی گئی اور تعلیم کامیاب ثابت ہوئی۔ جرمنی میں اس قسم کے بہت سے اسکول قائم کئے گئے اور اُن میں ایک عرصہ سے دستکاری کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

محمد صدیق

بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ مستعد پور۔

تعلیم ورزش جسمانی

نظام کالج میں ۱۸ اپریل سے ۲ مئی ۱۹۲۹ء تک تعلیم ورزش جسمانی کا ایک کلاس منعقد ہوا تھا جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ اس کلاس کی شرکت سے جو زبردست فائدہ ہم لوگوں کو ہوا ہے میں چاہتا ہوں کہ اوس سے اُن حضرات کو بھی باخبر کردوں جن کو شرکت کا موقع نہیں ملا۔

ابتدا میں تین چار روز تک تو یہ کلاس محض ڈرل ماسٹر صاحبان کے لئے مخصوص تھا لیکن ۲۲ اپریل سے مختلف مدارس کے دیگر اساتذہ بھی آنے شروع ہوگئے اور مجموعی تعداد ۱۳۳ ہوگئی۔

سب سے پہلے میں جس امر کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ مسٹر ویبر کی شخصیت ہے ہر شخص کو ایسا ہی خوش مزاج خوش اخلاق کشادہ دل اور کشادہ دماغ ہونا ضروری ہے صاحب موصوف نے ہر وقت ہنسی مذاق سے کام لیا۔ خود بھی ہنستے رہے اور دوسروں کو بھی ہنسایا۔ دوسروں سے کام لینے کا بھی ایک خاص ملکہ ہوتا ہے جو مسٹر ویبر میں نمایاں طور پر پایا جاتا تھا۔ اگر اس قسم کا مزاج تمام اساتذہ اور ڈرل ماسٹر صاحبان کا ہو جائے تو نہ کبھی لڑکوں کو سزا دینے کی نوبت آئے اور نہ "صدر صاحب" یا "افسر متعلقہ" سے کسی قسم کی رپورٹ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ لڑکے ہنسی خوشی ہمارے احکام کی بھی تعمیل اسی طرح خوبی اور دلچسپی سے کریں جیسے ہم نے مسٹر ویبر کے کہنے پر عمل کیا۔ مثال کے طور پر پابندی وقت ہی کو لے لیجئے۔ ہم لوگ سب ساڑھے سات بجے سے دو چار منٹ قبل ہی موجود رہتے تھے۔ اگر کسی کو کبھی آدھے منٹ کی بھی دیر ہوگئی تو مسٹر ویبر نہایت پر مذاق لہجہ میں اوس پر آواز کس دیتے تھے۔ مذاق کا مذاق ہو جاتا تھا اور کسی کو اُن کا فقرہ ناگوار بھی نہیں گذرتا تھا۔

دوسری بات جو صاحب موصوف میں نہایت نمایاں تھی وہ احساس مساوات تھا۔ وہ اپنے اور ہمارے مابین کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ اکثر نکتہ چینی یا مباحثہ کے وقت ڈرل ماسٹر صاحبان نے دیگر مدرسین کی "فوقیت" کا احساس کرکے ان کی غلطیوں پر زبان نہ کھولی اور اپنی غلطیوں کو خواہ مخواہ تسلیم کرکے خاموشی اختیار کرلی حالانکہ وہ بخوبی اعتراض کا جواب دے سکتے تھے۔ مسٹر وبر نے اس قسم کے امتیاز کو مذموم اور مانع اصلاح و ترقی قرار دیا۔

مختصر یہ کہ ایسے اوصاف حمیدہ جس مدرس میں پائے جائیں گے وہ نہایت کامیاب مدرس ثابت ہوگا۔ جن حضرات میں خندہ پیشانی تحمل و برداشت خوش مذاقی اور خوش اخلاقی نہیں پائی جاتی ان کو چاہیے کہ کامیاب استاد بننے کے لئے ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کریں درشت خو اور سخت گیر اساتذہ کے احکام کی تعمیل بھی بچے کرتے ہیں لیکن زبردستی بخوف سزا یا بجبر و اکراہ۔

اب میں ان فوائد کا تذکرہ کرتا ہوں جو ہم کو حاصل ہوئے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر جو لوگ ناواقف تھے وہ جسم انسانی کی ساخت مختلف اعضائے رئیسہ کے محل وقوع اور اوصاف و افعال مختصہ سے باخبر ہوگئے۔ متعدد رگوں اور ان کی اہمیت، دوران خون، خون کی اچھائی برائی کمی زیادتی اور کمی کے نفع و نقصان وغیرہ کا بھی علم ہوگیا۔

غذا اور ہوا کی اہمیت حالانکہ پہلے سے بھی معلوم تھی لیکن مسٹر وبر نے اپنے لکچروں میں ان کے متعلق بہت کچھ بتلایا خصوصاً غذا کے متعلق جو انہوں نے تشریح کی اور کیلوس و کیموس بنکر خون صالح پیدا ہونے کا نظام قدرتی بیان کیا وہ خالی از دلچسپی نہ تھا بلکہ ہماری معلومات میں اضافہ تھا۔ مریضان قلت دم کے متعلق خاص غذاؤں کا حال بیان کیا اور مختلف لوگوں کے لئے مختلف غذاؤں کے مفید اور مضر ہونے کی عقلی اور طبی دلیلیں بھی پیش کیں۔ کھلے مقام پر صاف ہوا میں رہنے کی تاکید کی اور لباس و مکان کی صفائی کے ساتھ طبیعت کی نفاست و ستھرائی پر زور دیا۔

ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہم میں سے جو حضرات ذرا دن چڑھے تک سونے کے عادی تھے وہ بھی سویرے اٹھنے لگے جس سے تندرستی پر اچھا اثر پڑا۔ پھر کئی گھنٹہ کھلے میدان میں ورزش وغیرہ کرنے کی بدولت جسم میں غیر معمولی قوت اور دماغ میں ایک قسم کی تروتازگی محسوس ہونے لگی۔ دن بھر طبیعت بشاش رہتی تھی اور زیادہ کام کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لطف یہ کہ تھکن بھی بہت کم یا قطعی محسوس نہ ہوتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ورزشیں جو مسٹر وِبَر نے طالب علموں کے لئے بلحاظ سن و سال مقرر کر دی ہیں برابر کرائی جائیں تو بچوں کو اس سے بھی زیادہ فائدہ ہوگا جتنا ہمیں پندرہ بیس دن میں محسوس ہوا۔

آج کل مدرسوں میں جس قسم کی ڈرل رائج ہے اُس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں۔ خیر "نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے" اگر اس کے بجائے مسٹر وِبَر کی مقرر کردہ ورزشیں رائج ہو جائیں تو لڑکوں کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا اُمید ہے کہ امسال مدرسوں کے نظام الاوقات میں بجائے "ڈرل" کے "فزیکل ایجوکیشن" کا ایک پیریڈ (گھنٹہ) ضرور رکھا جائیگا۔

اب میں اُن ورزشوں اور اُن کے بنیادی اصولوں کے متعلق اس موقع پر نہایت مجملاً کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ہر ایک ورزش کو مسٹر وِبَر نے چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اول وہ حصہ جس میں صرف بازوں کا کام ہوتا ہے دوسرا وہ جس میں پیروں کا تیسرا وہ جس میں جسم (دھڑ) کا اور چوتھا وہ جسے بریدنگ اکسرسائز (ورزش نفس) کہتے ہیں۔

جن اصولوں پر ان ورزشوں کا دارومدار رکھا گیا ہے وہ بھی چار حصوں میں منقسم ہیں۔ جسمانی، دماغی، اخلاقی، اور روحانی۔ دماغی، اخلاقی اور روحانی حصوں کے متعلق اس وقت کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔

ان کے متعلق اگر علحدہ علحدہ مضمون لکھے جائیں تو ایک زبردست کتاب بن جائے اس موقع پر صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ چاروں حصے آپس میں ایک ہی ہیں ایک کی بہتری سب کی بہتری ہے اور ایک کو نقصان پہونچا تو سب متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن سب پر بہتر یا بدتر اثر کرنے والا حصہ اول ہے۔ یعنی اگر جسمانی حالت اچھی ہے تو عموماً بقیہ تین حالتیں

بھی اچھی ہونگی۔ اسی طرح ضعف جسمانی عموماً اخلاقی دماغی اور روحانی ضعف کی دلیل ہے

اصول ورزش جسمانی :-

۱۔ ورزش ایسی ہونی چاہیئے جس سے تنفّس، دوران خون، تغذیہ (غذا کا صحیح ہضم ہونا اور اوس سے صحیح مقدار میں خون صالح پیدا ہونا) اور اعضائے رئیسہ کے بنیادی افعال و فرائض میں ہرج یا خلل واقع نہ ہو۔

اس کا لحاظ تمام ورزشوں میں رکھا گیا ہے کہ پھیپھڑوں پر کسی قسم کا بار نہ پڑے اور سانس کا فعل درست رہے ورنہ بجائے فائدہ کے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح دوران خون اور تغذیہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

۲۔ "ورزش کا مقصد اولین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ جسم کی عام حالت سے متعلق ہو۔ کسی خاص حصہ جسم کو ضرورت سے زیادہ تنومند نہ بنادے"

اکثر ورزشیں ایسی ہوتی ہیں جن سے مثلاً سینہ اور بازو تو بہت نمودار ہو گئے لیکن رانیں یا پنڈلیاں سوکھ گئیں۔ اس قسم کا اندیشہ ان ورزشوں میں نہیں۔

۳۔ "ورزش محافظ صحت، مؤید معلومات، باعث تفریح اور وسیلۂ اصلاح ہونی چاہیئے"

وسیلۂ اصلاح کے متعلق یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ورزشیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو عیوب جسمانی کی اصلاح کرتی ہیں۔ مثلاً ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے کف پا بالکل سید ہے یعنی سپاٹ ہوتے ہیں۔ اُن کو چلنے میں بھی تکلف ہوتا ہے اور جلدی تھک بھی جاتے ہیں۔ اس عیب کو رفع کرنے کے لئے دو ایک ورزشیں مقرر کی گئی ہیں جن کو "اصلاحی" ورزش کہتے ہیں۔ ایسی بھی ورزشیں ہیں جو اون لوگوں کے واسطے مخصوص ہیں جن کے سینے اندر کو دھنس گئے ہیں اور پشت اوپر کی جانب ابھر گئی ہے۔

۴۔ "ہر نقطۂ نظر سے وہی ورزش سب سے بہتر ہے جس میں کسی قسم کے ساز وسامان مثلاً "ڈمبل" یا "کلب" وغیرہ کی ضرورت نہ ہو۔ صرف ہاتھ پیروں سے کام لیا جاسکے"

سفر وغیرہ کے موقع پر اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوں تو ورزش ہی نہیں ہو سکتی۔ ریل کے ڈبہ میں "بکدرہ" اُلٹا خطرناک بھی ہے مبادا کسی اجنبی مسافر کے سر پر لگ جائے تو نہ معلوم ورزش کنندہ کن آفتوں میں مبتلا ہو جائے۔ اس محتاجگی کو رفع کرنے کے لئے اور دیگر فوائد کے مدنظر فری ہینڈ ورزشیں بہترین قرار دی گئی ہیں۔

۵۔ "اگر جمناسٹک کا سامان استعمال کیا جائے تو اوس کا منشا یہ ہونا چاہیئے کہ ورزش کنندہ اُس کے اوپر سے کود جائے یا اوس کے اطراف پھرتی سے گھوم جائے نہ یہ کہ اُس پر تادیر مسلسل ورزش جاری رکھی جائے یا نٹوں کے سے کرتب کئے جائیں۔"

اس کا اصلی منشا یہ ہے کہ ورزش میں جو حرکت بھی ہو وہ انتہائی پھرتی کے ساتھ ہو اور جسم کے تمام اعضا کی حرکتوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جائے۔ اس سے سارا جسم خوبصورت اور سڈول ہوتا ہے۔

۶۔ "ہاتھوں یا بازوؤں کی حرکت سب حرکتوں سے زیادہ تیزی اور پھرتی کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ پیروں کی اوس سے ذرا کم لیکن تقریباً مساوی۔ اور صدر (سر تا کمر) کی سب سے آہستہ۔"

ان تمام حرکتوں میں ڈرل ماسٹر صاحبان کا اصرار اس امر پر ہونا چاہیئے کہ لڑکے ان کو پوری اور صحیح طور پر ادا کریں۔

۷۔ **منہیات:۔**

(ا)۔ "ایسی ورزشیں جن میں بازوؤں کے موقتی تھماؤ کے علاوہ تادیر مزید بار پڑتا رہے۔"

مثلاً "پیرلل بار" پر ہاتھوں کے بل اولٹے کھڑے ہو کر تادیر بالنس قائم رکھنے کی مشق کرنا۔ اس سے ورزش کا اصلی مقصد فوت ہو جاتا ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ مضر بھی ہے۔

ب۔ "کسی ایک امر میں بہ ترکِ امورِ دیگر مہارت پیدا کرنا۔"

ج۔ "عرصہ تک ایسی قائمہ حالت میں رہنا جس سے گردن سے ناف تک صدر

کے اوپر غیر معمولی بار پڑے۔"

ایسی ورزش سے خصوصاً اجتناب لازم ہے جس میں سینہ اندر کی طرف کو دبے اور پشت باہر کی طرف ابھرے۔

۷۔ "شدید زور آزمائی خواہ عام ہو یا خاص۔"

مثلاً پنجہ کشی۔ موٹر روکنا۔ زنجیر توڑنا۔ بساط سے زیادہ وزن اوٹھانا۔ وغیرہ۔

۸۔ ورزش نہایت دلچسپ اور ہر لڑکے کی استعداد کے موافق ہونی چاہئیے۔"

اسی لئے بلحاظ سن یہ ورزشیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ بچوں کے لئے جو ورزش مقرر ہے اوس میں بڑوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی اور بڑوں کے واسطے جو ہیں وہ بچوں کی استعداد سے باہر ہیں۔ اگر کوئی جماعت ایسی ہے جس میں چند بچے ۹ یا ۱۰ سال کی عمر کے ہیں اور چند ۱۷ یا ۱۸ سال کے تو فی الوقت وہ ورزش کرانی چاہئیے جو چھوٹوں کے لئے مقرر ہے۔

۹۔ ہر ورزش کی بنیاد فطرت انسانی پر ہونی چاہئیے۔ ورزشیں ایسی ہوں جو بتدریج ایک دوسرے سے مشکل ہوتی چلی جائیں تاکہ انسان کو بتدریج فائدہ ہو۔ مثلاً دوڑنا۔ کودنا۔ پھینکنا۔ درخت وغیرہ پر چڑھنا۔ تیرنا اور مارنا چونکہ یہ سب باتیں فطرت انسانی میں داخل ہیں اس لئے بچوں کو ان میں دلچسپی ہوگی۔"

۱۰۔ "پاسچر" یعنی کھڑے ہونے اور بیٹھنے کے وقت جسم کا حقیقی پوزیشن درست ہونا چاہئیے۔"

مثلاً سینہ اندر کی طرف نہ دبے۔ پیٹ باہر کی طرف نہ نکلے۔ (صحیح قامت کے متعلق تصویر ملاحظہ ہو)

ان اصولوں پر تمام جدید ورزشیں مبنی ہیں۔ ان سے بچوں کے اعضاء و اعصاب مضبوط ہوتے ہیں ساتھ ہی دماغی ترقی ہوتی ہے جس پر ترقی عقل کا مدار ہے۔ ان ورزشوں سے حسب ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

جسم بہت زیادہ تنومند نہیں بلکہ خوبصورت اور سڈول بنتا ہے۔ اور انسان کیا

صحیح قامت یہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے
برائے صفحہ ۴۵ ماحول کے مناسب بنا سکے اُس کا نظامِ عظمی
وعصبی مضبوط اور قد وقامت درست ہوتا ہے
دل میں مسرت اور نئی اُمنگ پیدا ہوتی ہے
اپنی طبیعت پر قابو اور بھروسہ ہو جاتا ہے ۔
حیا بلند ہستی خوش اخلاقی راست بازی ۔ مروت
بنی نوع اور احباب کے ساتھ محبت اور ہمدردی
اور ان سب سے بالاتر خدا ترسی کا مادہ دل
میں پیدا ہوتا ہے ۔

مسٹر وبر نے چند کھیلوں کے متعلق لکچر
بھی دیے اور ہمیں عملی طور پر ان کی اہمیت
کو بھی سمجھایا ۔ کئی مدرسوں سے سیکڑوں بچے
بھی نظام کالج کے میدان پر بھیجے گئے تھے
جن کو ہم نے ورزشیں بھی کرائیں اور کھیل
بھی کھلائے ۔ ان کھیلوں کی خصوصیت یہ
ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لڑکے
شریک ہو سکتے ہیں اور انفرادی نفع ونقصان
کا گذر نہیں ۔ ان کی بدولت انسان میں
بچپنے ہی سے دوسروں کے ساتھ مل کر کام
کرنے کی قابل قدر صلاحیت پیدا ہوتی ہے ۔
لطف یہ کہ کسی وقت کوئی شخص بیکار نہیں رہتا
اور ایک منٹ کے لئے دلچسپی میں فرق
نہیں آتا ۔ ان کھیلوں کو مدرسوں میں ہاکی
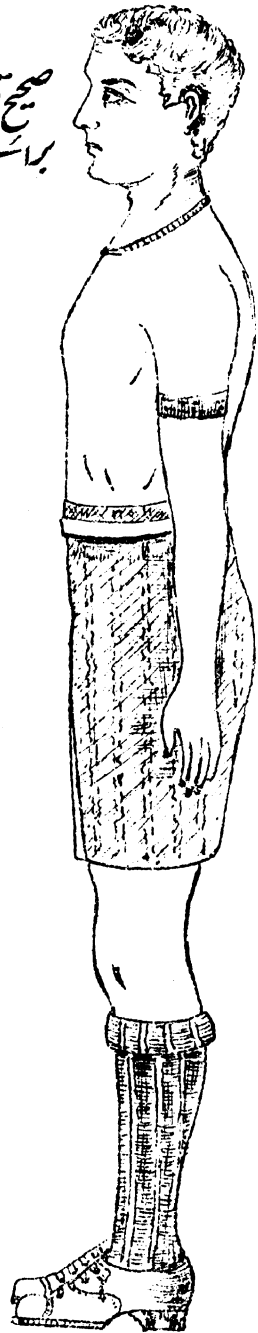
فٹ بال وغیرہ کے ساتھ ضرور رائج کرنا چاہیئے۔

ہمیں روزانہ دوپہر کو فتح میدان "حمایت باغ" میں تیرنے کا بھی موقع ملا نہایت پرلطف منظر ہوتا تھا ہم میں جو لوگ تیرنا جانتے تھے وہ "نوگرفتاروں" کو سکھاتے اور خود مسٹر وبرسے اکتساب کمال کرتے تھے۔ مسٹر وبر نے ہر شخص پر توجہ کی اور چند ایسے "اناڑیوں" کو تیرنا اور غوطہ لگانا سکھادیا جو پہلے کبھی پانی میں نہ گھسے تھے۔ ان کے کمالات دیکھ دیکھ کر ہر شخص کے دل میں سیکھنے کا ولولہ موجزن ہوا۔ مختصر یہ کہ ہر شخص نے حسب استعداد کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیا اس فن سے واقفیت ہونا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔

آخر میں میرا فریضہ یہ بھی ہے کہ میں جناب سید علی اکبر صاحب اور جناب خان فضل محمد خاں صاحب کی مساعی تحریک اور عملی تائید کا تذکرہ بھی کر دوں۔ یہ دونوں حضرات اگر گہری دلچسپی نہ لیتے تو نہ یہ کلاس منعقد ہوتا اور نہ ہم لوگوں میں اس قدر جوش و خروش اور ہیجان پیدا ہوتا۔ دونوں حضرات برابر وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے اور ہمارے کاموں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور ہماری ہمت افزائی فرماتے رہے۔ مسٹر کے برنٹ پرنسپل صاحب نظام کالج بھی مستحق تذکرہ و شکریہ ہیں جنہوں نے اپنے کالج کا میدان ہمارے لئے وقف کر دیا تھا۔

سب سے آخر میں میں افسران تعلیمات سے بصد ادب ملتجی ہوں کہ ان ورزشوں کو مدارس میں رائج فرمائیں تاکہ ایک تو مسٹر وبر کی یادگار قائم ہو جائے اور دوسرے ہم لوگوں کی محنت ٹھکانے لگے۔ یعنی اس مملکت ابد مدت کے نوخیز پودوں کی آبیاری میں ہم لوگ کامیاب ہو سکیں۔ میں جناب ناظم صاحب ورزش جسمانی کی خدمت میں یہ التجا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح اسکاوٹ ماسٹروں کی ٹریننگ کے لئے ہر سال ایک کیمپ منعقد ہوا کرتا ہے اسی طرح اس تعلیم ورزش جسمانی کا بھی کلاس ہر سال منعقد ہوا کرے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر مرتبہ مسٹر وبر جیسے قابل شخص کی گراں قدر خدمات ہم دست نہ ہو سکیں گی۔ لیکن پھر بھی اس منعقدہ کلاس کے چند نفوس ایسے دستیاب ہو سکتے ہیں جو "نقل مطابق اصل" ٹریننگ دے سکتے ہیں اور یہ کچھ ہونے سے

بہتر ہے۔

خدا کرے اساتذہ اور طلبا اور ان سے زیادہ باشندگان شہر ورزش کی اہمیت کو سمجھیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ عملی صورت میں لائیں جو عمل پیرا ہیں اون کی مساعی میں کامیابی حاصل ہو۔

سید مسعود الحسن بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔
مدرس سٹی کالج۔ بلدہ

رپورٹ کمیٹی تعلیم جسمانی بمدارس ثانوی احاطہ مدراس

(۲)

مدراس لیجسلیٹو کونسل کی تحریک منظورہ جنوری ۱۹۲۸ء کی بنا پر گورنمنٹ نے ذریعہ مراسلہ صیغۂ تعلیمات نشان ۱۳۱۵ مورخہ ۱۵ ؍ جنوری ۱۹۲۸ء مدارس ثانویہ میں تعلیم جسمانی پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جن کے صدر مسٹر جسٹس ایچ۔ او۔ سی۔ بیسلے تھے۔ اس کمیٹی کے پہلے تعلیم جسمانی پر تین کمیٹیاں مقرر ہوئی تھیں۔ پہلی کمیٹی نے ۱۸۸۰ء میں مشورہ دیا تھا کہ ہفتہ میں ایک گھنٹہ تعلیم ہو اور اوقات مدرسہ کا باہر لڑکے معلم جسمانی کی نگرانی میں جس قدر چاہیں مشق کریں جمناسٹک کی ترغیب دیجائے اور ہر بچہ کو لازمی طور سے ان کسرتوں کا نصاب پورا کرنا چاہیئے اور ہر سال رجسٹر جمناسٹک میں جسمانی ترقی کا اندراج ہو۔ دو سال کے بعد تعلیمی کمیشن نے سفارش کی کہ ہر مدرسہ کے حسب حال دیسی کھیل، کرتب، ڈرل اور دوسری ورزشوں کو رواج دے کر جسمانی ترقی کو فروغ دیا جائے۔ ناظم تعلیمات کی پنجسالہ رپورٹ بابتہ ۱۹۰۱ء سے مترشح ہوتا ہے کہ ڈرل اور جمناسٹک مدارس ثانویہ میں عملاً لازمی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ معلمین جسمانی نے ایک ہی وقت میں کئی بچوں کو مشغول رکھنے کا سلیقہ نہیں سیکھا ہے اور جو وقت تعلیم جمناسٹک کے لئے الگ کر دیا گیا ہے اس کا صرف ایک حصہ لڑکے مشق میں صرف کرتے ہیں۔ اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ کھیل صرف فوقانی مدارس میں کھیلے جاتے ہیں۔ دوسری

پنجسالہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم جسمانی میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ طلبار کا بڑا حصہ ڈرل اور جمناسٹک کلاسوں کی لازمی جسمانی تعلیم سے زیادہ فائدہ حاصل کیئے بغیر نصاب مدرسہ ختم کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معلمین جسمانی کی کافی تعداد برسرکار رکھنا ناممکن ہے۔ دوسری رپورٹ میں درج ہے کہ جسمانی تعلیم کا کمزور پہلو یہ ہے کہ جن لڑکوں کو ورزش کی سب سے زیادہ ضرورت ہے ان کو سب سے کم موقع ملتا ہے۔ ڈرل بے جان اور لچلچی ہے اور جمناسٹک چند بچوں تک محدود ہے۔

بہرحال ۱۹۱۶ء میں سررشتہ تعلیمات کو ڈاکٹر نوہرن کی، جو تعلیم جسمانی کے خصوصی ہیں انیم وقتی خدمات حاصل ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس میں ورزش جسمانی میں بے نظیر دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ڈاکٹر نوہرن کا کام مسٹر بک اور مسٹر انڈریو دنے جاری رکھا اور گو بہت کچھ ترقی ہوگئی ہے لیکن اب کام چلانا ناممکن نہیں معلوم ہوتا جب تک بنیادی تبدیلیاں عمل میں نہ آئیں۔

تعلیم جسمانی کے اغراض و مقاصد اس کمیٹی کے نزدیک تعلیم جسمانی کے مقاصد و اغراض یہ ہیں (۱) طلبار کی عام جسمانی حالت کو سدھارنا اور جفاکشی اور اندفاع مرض کی قوت کو بڑھانا۔

(۲) ضبط و تحمل کی تلقین کرنا۔

(۳) حقیقی کھلاڑی پن سے محبت اور ٹیم اسپرٹ پیدا کرنا۔

(۴) حفظان صحت کی تعلیم دینا۔

یہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ جسمانی ورزش افعال بدنی کو باقاعدہ رکھنے اور تندرستی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ قدیم زمانے میں اس قسم کی ریاضت انسان کو اپنی کٹھن طرز زندگی سے حاصل ہو جاتی تھی۔ بہت سے عضلات ترقی پاتے تھے۔ اور ایک کامل نظام عصبی پیدا ہو گیا تھا جس سے عضلات اور اعضائے رئیسہ اپنے افعال صحیح طور پر انجام دیتے تھے۔ جب انسان باکار زندگی بسر کرتا ہے تو سب ٹھیک رہتا ہے، لیکن مدرسہ کے بچے مصنوعی فضامین رکھے جاتے ہیں، جہاں ان کی فعلیت محدود ہو جاتی ہے۔ اس کی

طالب کے لئے دماغی ورزش کے مقابلہ میں جسمانی ورزش کے لئے مقررہ گھنٹے الگ کر دینا ضروری ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے کمانی کند ھے، دھنسے ہوئے سینے، نکلی ہوئی تو ند، ریڑھ کے خم اور لا ابالی بے ڈھنگی چال کا، جو اسکول اور کالج کے طلباء کے امتیازی نشان ہیں، انسداد ممکن ہے۔

(۱) جسمانی تعلیم نہ صرف بہت سی خرابیاں دور کرتی ہے بلکہ سارے ڈھیر اور اعضائے رئیسہ کو طاقت دیتی ہے، طاقت اور قابلیت کا احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے، وہ طالب علم کو خوب تیار کرتا ہے اور قوت اور گرفت کا احساس پیدا کرتا ہے جس سے وہ دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

(۲) ضبط و تحمل کی قوت بڑھانے میں کھیلوں کی اہمیت بالکل ظاہر ہے۔ کھیل بچوں کو چست، دلیر اور مستقل مزاج بنا، دوسروں کے حقوق کا لحاظ اور افسروں کی اطاعت کرنا اور فتح و شکست میں مناسب اسپرٹ دکھانا، سکھاتا ہے۔ اور ان میں راست بازی اور سچا کھلاڑی پن پیدا ہوتا ہے۔ تعمیر کردار میں ان صفات کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔

(۳) ٹیم سسٹم سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے مطابق جماعتیں ٹولیوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اور یہ ٹولیاں اکثر ریاضتوں اور کھیلوں میں اپنے لیڈروں کے تحت کام کریں اور کبھی کبھی دوسری ٹولیوں سے مقابلہ کریں۔

(۴) حفظان صحت کی تعلیم بچوں کو اس غرض سے دینا چاہیئے تاکہ وہ محسوس کریں کہ (الف) دماغی کارفرمائی کے لئے جسمانی صحت برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔

(ب) ریاضت کرنے اور نہ کرنے کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔

(ج) بیماریوں کے اسباب اور انسداد کی طریقے کیا ہیں۔

(د) قوت اور نشو و نمائے جسم کے لئے کس قسم کی غذا کی ضرورت ہے اور غلط قسم کی غذا استعمال کرنے سے کیا بُرے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

نتائج تفتیش | اپنی تحقیق و تفتیش کے بعد کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ تعلیم جسمانی میں حسب ذیل

نقائص ہیں :-

(۱) موجودہ معلمین جسمانی نہ تو تعلیماً اور نہ فنّاً اپنے کام کے اہل ہیں۔

(۲) تمام لڑکے تعلیم جسمانی میں کافی وقت نہیں دیتے۔

(۳) معلم جسمانی، اساتذہ، والدین اور طلباء کھیلوں کی اہمیت کو نہیں محسوس کرتے

(۴) بازیگاہیں عام طور پر ناکافی ہیں۔

(۵) اکثر لڑکے مناسب غذا نہ ملنے کی وجہ سے ناتواں ہیں۔

(۶) حفظانِ صحت کی تعلیم کا نصاب مدارس میں لحاظ نہیں کیا گیا ڈرل کلاس عام طور پر نہایت کٹھن خیال کیا جاتا ہے اور اس کلاس سے کھسک جانے کی متعدد کوششیں کی جاتی ہیں۔ اور جب لڑکے حاضر ہوتے بھی ہیں تو جس مہمل طریقے سے مشقیں کرائی جاتی ہیں ان سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ ان کلاسوں سے بیزاری کا سبب کچھ تو یہ علم ہے کہ معلم جسمانی نہایت ادنیٰ قابلیت کا آدمی ہے اور بچے ان کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب ریاضتیں ٹھیک طور سے نہیں کرائی جاتیں تو ان سے بچوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ زچ ہو جاتے ہیں اور ضبط کا خیال نہیں رکھتے۔ ماسوا یہ معلم کھیلوں کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے اور ان کی ساری کوشش جسمانی ورزشوں تک محدود رہتی ہیں۔ اس لئے کھیلوں کی شرکت ضروری نہیں کھی جاتی، اور بالکل بچوں کی خوشی پر چھوڑ دی گئی ہے۔

لیکن اگر معلمین ورزش جسمانی کھیلوں میں دلچسپی بڑھانے کی کوشش کرتے تو بھی بازیگاہوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کرسکتے۔ اس عدم موجودگی کی عمومیت کا غالباً احساس نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس احاطہ میں (۵۰۳) ثانوی مدارس میں سے (۷۰) میں بازیگاہ ہے ہی نہیں، (۱۷۵) کو ایک ایکڑ اور (۱۱۷) کو تین ایکڑ سے کم زمین نصیب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ خصوصاً مدراس اور دوسرے بڑے شہروں میں حسب ضرورت میدان حاصل کرنا مشکل تھا لیکن اکثر صورتوں میں بازیگاہوں کے نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ مدرسہ کے منتظمین اور اساتذہ کھیلوں کی اہمیت کا احساس

نہیں کرتے۔

تجاویز: ان کوتاہیوں کے مدنظر، کمیٹی حسب ذیل تجاویز پیش کرتی ہے اور اس کو یقین ہے کہ اگر ان پر عمل نہ کیا گیا تو تعلیم جسمانی میں حقیقی ترقی نہ ہوگی۔ ان سفارشوں کو پیش کرتے وقت، کمیٹی کو احساس ہے کہ ان کی بابجائی کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہوگی۔ مگر چونکہ اس کمیٹی کو مقرر کرکے گورنمنٹ نے ثابت کیا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں سنجیدگی اور موثر طریقہ سے ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے اس لئے کمیٹی کو بھروسہ ہے کہ مالی لحاظات سنگ راہ نہ ہونے پائیں گے۔

(۱) جسمانی ورزش اور کھیل تمام طلباء کے واسطے لازم قرار دئے جائیں سوائے ان لڑکوں کے جن کو مدرسہ کا معالج ناقابل قرار دے۔ اور اس غرض سے گھنٹوں کی مناسب ترتیب دی جانی چاہئیے۔ جماعت چہارم سے نیچے درجہ والوں کو بڑے کھیل کھیلنے کی ضرورت نہیں۔ صدر مدرس کی اجازت بغیر تعلیم جسمانی اور کھیلوں سے غیر حاضری کو مدرسہ سے سارے دن کی غیر حاضری تصور کرنا چاہیئے۔ اب تک جسمانی ورزشوں کی تعلیم ہفتہ میں ایک بار ہوتی تھی کمیٹی کے نزدیک یہ زیادہ موثر ہوگا اگر ہر لڑکے کو ۱۵ منٹ روزانہ ورزش کرائی جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر بچوں کو ہفتہ میں صرف ایک بار زیادہ دیر تک ورزش کرائی جائے تو اس سے بہت کم نفع ہوگا۔ ورزشوں کے لئے ڈاکٹر نوہرن کی کتاب بعد نظر ثانی استعمال کی جائے۔ کھیلوں کے انتخاب میں بڑی گنجائش ہے بڑے کھیلوں میں فٹ بال ہاکی کرکیٹ (ان سب کے لئے وسیع میدانوں کی ضرورت ہے) ٹانکوائٹ، لیے گراؤنڈ بال، دالی بال، باسکٹ بال اور دیسی کھیل مثلاً کوکو، چیڈو گوڈو، اٹھیا بٹھیا کھلائے جائیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی کھیل کم از کم ہفتہ میں دو بار ہر لڑکے کو کھیلنا چاہئیے۔ مزید ترغیب کے لئے مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہر مدرسہ میں ہاؤس سسٹم قائم کیا جائے۔ اس سسٹم سے اسکول کے لڑکے برابر برابر کئی ٹولیوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں اور ان کا اپنا خاص نام اور نشان ہوتا ہے۔ یہ ٹولیاں ہر کھیل میں انٹر ہاؤس مقابلوں میں حصہ لیں اور سالانہ انعام کے لئے مقابلہ کریں۔ اس کمیٹی کی نظر میں، کسی

منڈلی کے لڑکوں کو جدا جدا مشغلہ دینا نامناسب ہے، کیوں کہ اس طرح مقاصد اجتماع فوت ہو جاتے ہیں۔

(۲) اگر کھیل لازمی قرار دئے جائیں تو بازیگاہوں اور میدانوں کا انتظام کرنا ہوگا بازیگاہیں مدرسہ سے متصل ہوں لیکن کھیل کے میدان بالعموم نصف میل سے زیادہ فاصلہ پر نہ ہوں۔ تمام مدارس فوقانیہ جن میں (۲۵۰) یا زیادہ لڑکے ہوں ان کو بازیگاہوں کے لئے کم از کم (۵) ایکڑ زمین ملنا چاہیئے۔ وسطانیہ مدارس کے لئے (۳) ایکڑ سے کم نہ ہو جہاں جہاں مدرسوں کے آس پاس بنجر زمین پڑی ہے اس کو مدارس کے استعمال کے لئے بشرط ضرورت وقف کر دینا چاہیئے۔ محکمہ صفائی، اور ڈسٹرکٹ بورڈ کو امداد دیجائے تاکہ وہ عوام کے لئے کھلے میدانوں میں بازیگاہوں کا بندوبست کر سکیں۔ گورنمنٹ کو مشورہ دینے اور موزوں میدانوں کے حصول اور ان کی تفویض میں مدد دینے کے لئے مقامی "پلے گرونڈ کمیشن" مقرر ہوں بعض مدارس کے متعلق ضرورت ہے کہ ڈرل ہال تعمیر کئے جائیں جہاں جسمانی تعلیم دی جا سکے۔ مغربی ساحل پر جہاں بارش کئی مہینے ہوتی ہے اور دوسرے مقامات پر جہاں سایہ کافی نہیں ملتا۔ ایسے ہال بیحد ضروری ہیں۔ البتہ اگر ان کی تعمیر سے میدان کے چھوٹا ہو جانے کا خوف ہو تو ہرگز تعمیر نہ کئے جائیں۔

(۳) اگر کھیل لازمی ہوں تو سامان گیم خریدنے کے لئے بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ ان مصارف کی پابجائی کے لئے کمیٹی مندرجۂ ذیل امور پر زور دیتی ہے۔

(الف) گیم فیس کل بچوں سے وصول کرنا چاہیئے۔

(ب) جو گیم فیس طلباء اور اساتذہ سے وصول ہو وہ اور منتظمین کے عطیئے اور سرکاری امداد گیمیں سب کا سب تعلیم جسمانی اور کھیلوں پر صرف کیا جائے اور یہ رقوم ایک علیحدہ فنڈ میں جمع کی جائیں جس کا نام گیم فنڈ ہو۔

(ج) تعلیم جسمانی کے لئے سرکار سے جو امداد دی جائے وہ مجتمعہ گیم فیس سے زیادہ نہ ہو اور شرط یہ ہو کہ کسی حالت میں بھی امداد سرکار مجتمعہ فیس طلباء اور منتظمین کے عطیئے حقیقی مصارف سے زیادہ نہ ہوں۔

مدارس ثانویہ میں معلمین جسمانی کی ادنیٰ قابلیت ثانوی گریڈ کے سند یافتہ معلم کے مساوی ہونا چاہیئے جنہوں نے وائی ایم سی اے کے مدرسہ تعلیم جسمانی مدراس میں فزیکل ٹریننگ سرٹیفکیٹ لیا ہو۔ اس قابلیت کے معلمین اپنا کام زیادہ خوش اسلوبی اور کمال کے ساتھ انجام دے سکیں گے اور جماعت میں خاطر خواہ ضبط قائم رکھ سکیں گے علاوہ ازیں جب اس عمر کو پہونچیں گے جب وہ تعلیم جسمانی موثر طریقہ پر نہیں دے سکتے تو سند یافتہ مدرس ہونے کی وجہ سے وہ نصاب مدرسہ کے معمولی مضامین پڑھا سکیں گے مستثنیٰ صورت صرف اُن لوگوں کی ہوگی جن کے پاس ملیٹری فزیکل ٹریننگ انسٹرکٹرز سرٹیفکیٹ ہو ایسے لوگوں کا تقرر کیا جاسکتا ہے اگر وہ کافی تعلیمی لیاقت رکھتے ہوں اور اگر سرکار کا مشیر تعلیم جسمانی اس کو مناسب سمجھے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ جن لوگوں کا ٹریننگ کے لئے انتخاب کیا جائے وہ کھیلوں میں مشاق ہوں۔ ٹرینڈ معلمین کی تنخواہ کا تعین دو اسکیلوں کے لحاظ سے ہوگا۔

(۱) سند یافتہ ثانوی گریڈ کے معلمین جو ایس ایل سی کامیاب ہوں [illegible]

(۱۱) سندیافتہ ثانوی گریڈ کے معلمین جو ایف اے یا اعلیٰ اسناد رکھتے ہوں۔ [illegible]

جن مدارس میں ۲۰۰ یا اس سے کم طلبا ہوں وہاں کم از کم ایک معلم ورزش جسمانی ہونا چاہیئے اور اگر تعداد ۲۰۰ سے اوپر ہو تو ایک سے زیادہ۔ جن مدارس میں ہزار یا ہزار سے زیادہ طلبا ہوں وہاں ایک ناظم جسمانی بھی ہو جو فزیکل ٹریننگ ڈپلوما کے ساتھ ایل ٹی یا بی ایڈ کامیاب ہو ان سفارشوں سے لازماً مدارس پر مزید مصارف عائد ہوں گے اور زائد صرفہ کو پورا کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

(الف) اُجرت تعلیم میں اضافہ۔

(ب) اُجرت تعلیم میں تھوڑا اضافہ اور امداد سرکار۔

(ج) امداد سرکار بلا اجرت تعلیم میں اضافہ کئے بغیر۔

چونکہ مناسب قابلیت کے لوگوں کی کافی تعداد دستیاب ہونے میں عرصہ لگے گا اس لئے آخری طریقہ بہترین ہے۔

(۵) آٹھ سال سے وائی ایم۔ اسی۔ اے کا مدرسہ تعلیم جسمانی معلمین ورزش جسمانی اور نظمائے جسمانی کی تعلیم انجام دے رہا ہے۔ لیکن یہاں جو لوگ تعلیم پاتے ہیں ان میں سے اکثر ہندوستان کے دوسرے حصوں سے آتے ہیں اور ان سے اس احاطہ کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن آئندہ اگر معلمین ورزش جسمانی کی یافت میں حسب تجویز اضافہ کیا جائے تو ٹریننگ کے لئے زیادہ اُمیدوار ملیں گے اور یہ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ مدرسہ تعلیم جسمانی موقوعہ مدراس میں توسیع کی جائے اور اس غرض کے لئے گورنمنٹ غیر متوالی رقم منظور کرے۔ اب تک گورنمنٹ نے مدرسہ کے مصارف میں کوئی امداد نہیں کی لیکن اگر مستقبل میں اس اسکول کو احاطۂ مدراس کے لئے ٹریننگ اسکول بنانا مقصود ہے تو اس صوبہ کے طلباء کی اُجرت تعلیم یا مارفی کس سالانہ گورنمنٹ کو ادا کرنا چاہیئے دوسرے ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں میں طلباء زیر ٹریننگ کو وظائف دئے جاتے ہیں اس وجہ سے کہ آئندہ معلمین مدارس کے لئے ضروری ہیں اس اصول پر یہ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ جو طلباء اس مدرسہ میں زیر ٹریننگ ہوں ان کو (عـــہ) ماہانہ وظیفہ اس خیال سے دیا جائے کہ مدراس میں مصارف زندگی زیادہ ہیں اور اس لئے کہ ان کو بہت سخت کام کرنا ہوتا ہے۔

(۶) تعلیم جسمانی کی اہمیت اور ٹریننگ کالجوں اور اسکولوں میں اساتذہ کو صحیح طریقہ تعلیم جسمانی سکھانے کی ضرورت کے خیال سے یہ کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ گورنمنٹ ٹریننگ کالج سیدا پیٹ اور راج مہندری میں اور دوسرے ثانوی ٹریننگ اسکولوں میں ایک ایک ناظم جسمانی کا تقرر کیا جائے۔ یہ کمیٹی یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ چند چند ضلعوں کو ملا کر حلقے بنائے جائیں اور ان حلقوں میں تعلیم جسمانی کی نگرانی نظمائے جسمانی کے تفویض ہو فی الحال پورے احاطہ کے لئے صرف ایک ناظم جسمانی ہے۔ کمیٹی کی رائے ہے کہ کم از کم پانچ یا چھ ہوں نظمائے جسمانی کے متعلق کمیٹی کا مشورہ ہے کہ ان کو ایل۔ ٹی کا گریڈ اور (۷۵عـــہ) ماہانہ الاونس دیا جائے۔

(۷) کمیٹی کے نزدیک تعلیم صحت جسمانی تعلیم کا ضروری جزو ہے۔ اور یہ تعلیم اوقات مدرسہ میں معلم جسمانی اور دوسرے اساتذہ دیں اور یہ مضمون نصاب مدرسہ کے مضامین میں شریک ہو۔ کمیٹی محسوس کرتی ہے کہ جب تک جسمانی تعلیم ثانوی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ اور یوروپین اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کی اسکیموں میں (الف) گروپ کے مضامین میں شمار نہ ہو اس وقت تک اس پر کافی لحاظ نہ ہوگا۔ اور اس بنا پر کمیٹی تجویز کرتی ہے کہ ثانوی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ اور یوروپین اسکول لیونگ سرٹیفکٹ بورڈ غور کریں آیا تخفیف نصاب ضروری ہے۔

تمام مدرسین کو چاہیئے کہ لڑکوں کی نشست اور جماعت کے عام ضبط پر خاص توجہ کریں۔ اسکول فرنیچر کی وضع میں اصلاح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے!

کمیٹی خیال کرتی ہے کہ حفظانی وجوہ سے ضروری ہے کہ بچوں کے پاس ورزش کے بعد بدلنے کے لئے پورے جوڑے ہوں۔ یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ورزش کرتے وقت بنیائن اور نکر (جانگھی) استعمال کی جائے۔

(۸) طبی معائنہ کا جسمانی تعلیم سے قریبی تعلق ہے۔ اور یہ نہایت ضروری ہے کہ طبی افسر مدارس کے حفظانی حالات اور صفائی پر سختی سے نگاہ رکھے تدارکی ورزشین کثرت سے سکھانے کی ضرورت ہے کیونکہ مدرسہ کے بچے بسا اوقات ایسے کمروں میں بند رہتے ہیں جن میں کافی ہوا اور روشنی نہیں آتی اور ایسا فرنیچر استعمال کرتے ہیں جو قطعی ناموزوں ہوتا ہے۔

طبی افسر اور معلم جسمانی کے مابین انتہائی اتحاد عمل ہونا چاہیئے اور کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ سرکاری اسپتالوں میں مدرسہ کے بچوں کے لئے خاص شعبے کھولے جائیں جہاں افسر طبی کے سفارش کردہ لڑکوں پر خاص توجہ ہو اور ان کا علاج مفت کیا جائے۔

کمیٹی کی رائے ہے کہ بہت سے طلباء ایسے ہیں جن کے لئے سال میں ایک بار معائنہ طبی کافی نہیں ہے کیوں کہ ان پر سخت نگرانی رکھنے اور ان کا کئی بار امتحان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس غرض سے ہر افسر طبی کو الاؤنس دینا چاہیئے تاکہ سال میں

جب کبھی ضرورت ہو تو خاص مریضوں کو دیکھنے کے لئے وہ بلایا جا سکے اس الاؤنس کی مقدار امتحان شدہ بچوں کی تعداد کے لحاظ سے ہو۔ یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ طبی فیس کا جو اسکیل مقرر ہے اس میں معتد بہ اضافہ کیا جائے۔

(۹) جس عنوان پر کمیٹی کوئی موافق سفارش کرنے سے قاصر ہے وہ جمنیزیم کا مسئلہ ہے۔ گو ٹرینڈ معلمین کی نگرانی میں آلات جمناسٹک کے استعمال سے عضلات اور حسّی توازن کی ترقی میں بلاشبہ بہت مدد ملتی ہے لیکن ان آلات کی گراں قیمتی کے خیال سے اور اس خیال سے کہ بالعموم ان کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور نیز اس خیال سے کہ دوسرے اہم کاموں کے لئے بڑی رقمیں درکار ہیں۔ یہ کمیٹی جمنیزیم اور آلات جمناسٹک کے لئے سرکاری امداد کی حامی نہیں ہے۔

شذرات

(۱)

یوم المحمود عبدالسلام صاحب معتمد انجمن عثمانیہ و دارالمطالعہ محمودیہ بیدر شریف اطلاع دیتے ہیں کہ جناب محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے کی تحریک پر خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں بانی مدرسہ محمودیہ بیدر کی شہادت کے دن بتاریخ ۵ شہریور ۱۳۳۸ف روز جمعہ مدرسہ محمودیہ میں "یوم المحمود" منایا جائے گا۔ اس کے ساتھ بیدر سے متعلق علمی، تاریخی، جغرافی اور سوانحی مطبوعات کی نمائش بھی ہوگی۔

بتوں کے بندے اس کتھرائن میو مصنفہ "مادر ہند" نے ہندی طریق معاشرت پر دوسرا وار کیا ہے اور سابقہ نہج پر ایک دوسری کتاب لکھی ہے اس کتاب کا نام "بتوں کے بندے" رکھا ہے۔ اور اس کے (۳۳۷) صفحوں میں چھوٹے چھوٹے دلکش قصوں کی شکل میں ہندی معاشرت کے مختلف پہلوؤں مثلاً کم سنی کی شادی، دختر کشی، بیوگی، گاؤ پرستی، دیوداسی، کی تصویر کھینچی ہے مس میو کا انداز تحریر نہایت دلاویز ہے اور اس کتاب کا اسلوب بیان تو بالکل سحر آفرین ہے لیکن نفس تحریر کے متعلق دو باتیں خاص کر

قابل اعتراض ہیں۔ اولاً گو مصنف نے ہر باب کے آخر میں ہندوستانی لیڈروں کے اقوال نقل کئے ہیں لیکن اصل مضمون کے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیا۔ دوسرے اگر متذکرہ واقعات مصدقہ ہوں تو بھی جز و کا اطلاق کل پر ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ یہ عجیب بات ہے کہ مس صاحبہ کو ہندوستان میں کوئی اچھی بات نظر نہ آئی۔ بہرحال اگر انہوں نے ہندو استریوں کی دوستی و ہمدردی سے یہ دونوں کتابیں لکھی ہیں، جیسا کہ خود ان کا بیان ہے تو یہ اظہار محبت کی نرالی ادا ہے اور اگر ہندوستان کو بدنام کرنے کے خیال سے خامہ فرسائی کی ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ع عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما در و باشد۔

کتخدا طلبہ پنجاب یونیورسٹی تجویز کر رہی ہے کہ امتحان میٹریکولیشن میں کوئی کتخدا طالب علم جس کی عمر (۱۸) سال سے کم ہو، سرکاری طور سے شریک نہ کیا جائے البتہ ان کو خانگی طور سے شرکت کی اجازت دیدی جائے۔ لیکن فورمن کالج لاہور نے بد قسمتی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ۱۹۲۹ء سے ایف اے میں کسی شادی شدہ طالب علم کی شرکت روا نہ رکھے گا۔

بحری تعلیم یکم دسمبر ۱۹۲۷ء کو حکومت ہند نے ہندوستانی نوجوانوں کو جو تجارتی جہازوں میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں، ابتدائی تعلیم دینے کے لئے انڈین مرکنٹائل مرین ٹریننگ شپ "ڈفرن" مقرر کیا۔ یہ بحری تعلیم تختہ جہاز پر دیجائیگی جو بندرگاہ بمبئی میں لنگر انداز ہے۔ مدت تعلیم ۳ سال کی ہوگی۔ اور ہر سال کو ۳ میقات میں تقسیم کیا جائیگا۔ پہلی میقات ۱۵ جنوری تا ۳۰ مارچ دوسری میقات یکم اپریل تا ۱۵ جون تیسری میقات ۱۵ ستمبر تا ۱۵ دسمبر۔ ماہانہ فیس (صہ) کلدار ہوگی اور ہر میقات کی پیشگی فیس یکمشت دینی ہوگی چند لڑکوں کو (عہ) ماہوار وظیفے دئے جائیں گے۔ تعلیم اور کار آموزی کے بعد تنخواہیں (اصہ سے الے) تک مل سکیں گی۔ جملہ درخواستیں معتمد مجلس انتظامی، تعلیمی جہاز ڈفرن، منزگون بار، بمبئی نمبر ۱ کے پتہ پر بھیجی جائیں۔

گانیوالا کتا فیلو نامی کتے کی سمجھداری اور علمی لیاقت کا ذکر کسی سابقہ اشاعت میں کیا جاچکا ہے۔ حالانکہ فیلو تعمیل احکام میں سر مو فرق نہیں کرتا تھا لیکن اکثر ماہرین

نفسیات کو انکار تھا کہ فیلو درحقیقت الفاظ کے معنی سمجھتا ہے انہوں نے نفسیات کلبی پر بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ کیا کہ فیلو صرف اٹکل سے آواز کا منشا سمجھ لیتا ہے اور اس نے خاص جملوں اور ان کے مفہوم میں ربط پیدا کر لیا ہے اور بس۔ لیکن ایک دوسرا کتا جس کا نام " رُشی " ہے معرض عام پر آیا ہے جس کے مالک مسٹر مارک شلر ہیں یہ کتا بھی جرمن گلہ بان نسل کا ہے اور یہ نہ صرف الفاظ اور جملوں کا مفہوم سمجھ لیتا ہے، بلکہ بولتا بھی ہے اور صاف لہجے میں (ماما) کہتا ہے اور طرہ یہ ہے کہ مدہ بھرے دھیمے سروں میں " پادشاہم زندہ باد " کا قومی ترانہ الاپتا ہے۔ وہ انگریزی اور جرمن دونوں زبانوں میں گفتگو سمجھتا ہے وہ اپنا گلا صاف کرتا اور رقاب کا انتظار کرتا ہے اور جب اس کا آقا راگ نکالتا ہے تو رُشی بھی گلا ملاتا ہے۔ ایک پرانے جرمن گیت میں تو وہ اپنے مالک پر بھی سبقت لے جاتا ہے رُشی کی آواز کتے کی بھونک سے بالکل ممتاز ہے اور اس میں کوئی غلط سر نہیں ہوتا ہے یہ کتا نہ تو نمائشی کتا ہے اور نہ اس کو باضابطہ تعلیم دی گئی ہے۔ صرف اس کے مالک اور مالکہ نے اس پر شفقت کی اور بچوں کی جیسی دیکھ بھال کی۔ رُشی کی زندگی نہایت سبق آموز ہے۔ ایک طرف تو مدرسین کو سبق ملتا ہے کہ اگر وہ بچوں سے جو کتے سے کہیں زیادہ سمجھدار اور تاثر پذیر ہوتے ہیں محبت و شفقت کے ساتھ پیش آئیں تو بہت زیادہ مفید نتیجے نکلیں گے۔ دوسری طرف کشافوں کے لئے مثال عبرت ہے جو اپنی خداداد قوت نطق و تکلم کے ہوتے ہوئے جانوروں کی بولیاں بولنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ ڈارون نے ارتقا کے نشہ میں انحطاط کو فراموش کر دیا البتہ سعدیؒ نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ

پسر نوح بابدان نشست خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند پئے انسان گرفت مردم شد

رہنما کتے ہندوستان کے شہروں میں یہ منظر عام ہے کہ اندھے چھوٹے بچوں یا ہٹے کٹے نوجوانوں کا ہاتھ تھامے در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں حالانکہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اندھوں کو بھی کام میں لگا دیا ہے اور وہ نہ صرف کوچہ گردی کی مصیبت اور دست سوال پھیلانے کی ذلت سے محفوظ ہیں بلکہ قوم ان اپاہجوں کے

بارے بھی سبکدوش ہوگئی ہے چنانچہ امریکہ میں ایک اندھی عورت اندھے بچوں کا اخبار نکالتی ہے اور سارا کام خود کرتی ہے جس سے اُس کی معقول آمدنی ہوتی ہے اگر صرف اندھوں کی ذات کا معاملہ ہوتا تو اتنا بُرا نہ تھا۔ لیکن یہاں کے اندھے جن لڑکوں کو ساتھ رکھتے ہیں وہ بچپنے ہی سے کاہل اور بھیک مانگنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ نیز جو نوجوان اندھوں کی رہنمائی کرتے پھرتے ہیں اگر وہ اس کام سے بچ جائیں تو دوسری خدمتیں انجام دے سکتے ہیں ورنہ ملک پر ایک اندھے کی وجہ سے دو آدمیوں کا بار پڑتا ہے۔ امریکہ میں نوجوان آنکھ والوں کو اس کام سے بچانے کے لیے، اندھوں کی رہنمائی کے واسطے کتوں کو تربیت دی گئی ہے۔ یہ کتے سدھنے کے بعد، اندھے آدمیوں کی رہبری نہایت ہوشیاری سے کرتے ہیں اور انسان رہبروں سے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم ہندوستان میں صرف دیشوا بھارتی ہی ایسی جگہ ہے جہاں ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھا تعلیم دی جاتی ہے اور دونوں صنف کے طالب علم ایک اقامتی ادارہ میں رہتے سہتے اور پڑھتے لکھتے ہیں۔

مُسلمان لڑکیوں کی جبری تعلیم بلدیہ بمبئی نے گورنر اِن کونسل کی سابقہ اجازت سے حسب دفعہ (۲) بمبئی ابتدائی تعلیم ایکٹ ۱۵ بابتہ سنہ ۱۹۲۰ء اعلان کردیا ہے کہ یکم اگست سنہ ۱۹۲۹ء سے ملقے (الف) اور (جی) میں ۶ تا ۱۰ سال عمر کی مسلمان لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم جبری ہوگی۔

اردو رسم الخط کا مستقبل۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت ہند نے صوبجات کی حکومتوں سے استمزاج کیا ہے آیا نستعلیق رسم الخط کو رومی رسم الخط سے بدلنا ممکن ہے یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا کہ جواب کیا دیا گیا یا اس تغیر و تبدل کا حقیقی سبب کیا ہے ممکن ہے کہ ترکی میں مصطفٰے کمال پاشاہ نے عربی کی جگہ لاطینی حروف کے استعمال کا جو حکم عام دیا ہے یہ اسی کی گونج ہو۔ سبب کچھ بھی ہو لیکن اس تجویز میں دشمنان اردو کا ہاتھ ضرور ہے۔ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء میں بھی، در نیکولر اسکیم کمیٹی میں نستعلیق کو ناگری اکثر سے

بدلنے کی زد در وار کوشش ہوئی لیکن خدا بخشے مولانا شبلی کو جن کی یاد داشت کی بدولت "اردو ناگری کی حالت میں آنے سے رک گئی"، غریب ناگری کی گرفت سے نکل کر لاطینی کی زد میں آرہی ہے۔

اردو کا ماضی تو خیر سے گذر گیا لیکن اس کا مستقبل معرض خطر میں ہے ؎
ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

دو دل والا آدمی کسی شاعر نے کہا ہے ؎
ہم معتقد دعویٰ باطل نہیں ہوتے
سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

لیکن نیویارک کا اخبار "نیشن"، دعویٰ کرتا ہے کہ امریکہ میں ایک شخص ہے جس کے سینہ میں دو دل ہیں۔ شاید یہ مستثنیٰ صورت کلیہ کے ثبوت کے لئے ہو۔

اجتماع اسکوٹس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ بتاریخ ۱۴ اردی بہشت ۱۳۳۸ف مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ میں اسکوٹس کا بڑا اجتماع ہوا۔ اس جلسہ کے لئے عمارت مدرسہ کے پہلو میں ایک وسیع میدان کو ہموار اور رسوں سے محصور کر کے کئی خیمے لگائے گئے تھے۔ خیموں کے سامنے کرسیوں کی نشست کا عمدہ انتظام تھا اور اندر مہمانوں کی لذت کام و دہن کے لئے شیرینی و فواکہ و برف سوڈے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی سامعہ نوازی کے لئے فوجی بنڈ خیموں کے بازو میں سرگرم نغمہ سنجی تھا۔ تمام میدان جھنڈیوں اور بیرقوں سے آراستہ ہو کر عجیب نظر فریب سماں پیش کر رہا تھا۔ چار بجے سے اسکاوٹ ٹروپ اور مہمان آنا شروع ہوئے۔ ٹھیک ساڑے چار بجے صدر جلسہ جناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ تشریف لائے۔ صاحب صدر کے آتے ہی اسپورٹس شروع ہوئے جن کے اختتام پر صدر جلسہ نے جیتنے والوں کو متعدد انعامات از طرف محمد علی شریف صاحب مہتمم آبکاری عثمان آباد تقسیم کئے گئے۔ مدرسہ ہذا کے سلامت ٹروپ کو بھی جناب مولوی ابو بکر خاں صاحب مددگار دار الترجمہ کی جانب سے ایک کپ مرحمت ہوا۔ تقسیم انعامات کے بعد صاحب صدر و کل مہمان عصرانہ میں شریک ہوئے اس سے فارغ ہو کر پھر جلسہ گاہ میں تشریف لائے

اس موقع پر جناب علی موسیٰ رضا صاحب مددگار ناظم ہوائے اسکاؤٹس نے مقاصد و فوائد اسکاؤٹنگ پر تقریر کی۔ ازاں بعد آقائے رئیس جلسہ نے ایک قابلانہ و پرمغز تقریر اسی موضوع پر فرماکر سامعین کو محفوظ کیا۔ سب سے اخیر میں جناب مولوی احمد الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا نے آقائے رئیس جلسہ و مہماناں و کارکناں جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد کیمپ فائر ہوئی جس سے عرصہ تک حاضرین لطف اُٹھاتے رہے۔ نو بجے کے قریب جلسہ بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔

زندگی کی تیرہ غلطیاں سین فرانسسکو (امریکہ) کے جج میک کارمک صاحب کہتے ہیں کہ زندگی کی تیرہ غلطیاں یہ ہیں:-

(۱) اپنا معیار راستی و ناراستی قائم کرنے کی کوشش کرنا۔
(۲) اپنے سکھ سے دوسروں کے سکھ کو جانچنا۔
(۳) اس دنیا میں اتفاق آرا کی توقع رکھنا۔
(۴) ناتجربہ کاری کی رعایت نہ کرنا۔
(۵) تمام طبیعتوں کو ایک سانچہ میں ڈھالنے کی سعی کرنا۔
(۶) معمولی باتوں میں طرح نہ دینا۔
(۷) اپنے ہی کاموں میں کمال ڈھونڈھنا۔
(۸) جس کا کچھ علاج نہ ہو اس کے متعلق خود پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا
(۹) جو ہم خود نہ کر سکیں اسے ناممکن سمجھنا۔
(۱۰) جب اور جس طرح ممکن ہو دوسروں کی مدد نہ کرنا۔
(۱۱) صرف وہی باور کرنا جسے ہمارا محدود دماغ سمجھ سکتا ہے۔
(۱۲) دوسروں کی کمزوری کا لحاظ نہ کرنا۔
(۱۳) کسی خارجی معیار سے مساوات کا اندازہ لگانا۔ حالانکہ جو چیز انسانوں کو مساوی کرتی ہے وہ اندر ہوتی ہے۔

انسان کا دماغ سرآرتھر کیتھ نے ایک لکچر میں بیان کیا کہ "انسان کا دماغ اپنی کوتاہیوں کے باوجود صانع قدرت کا شاہکار ہے۔ حال ہی میں وئینا کے ایک پروفیسر اعصابیات قسطنطین اکونوموں نے تحقیق کی ہے کہ ایک یورپین کے دماغ میں جو معمولی ضخامت یعنی (۴۸) آونس کا ہو، تقریباً چودہ ارب جاندار اعصاب ہوتے ہیں۔ اگر کوئی معمولی آدمی اپنے مغزی اعصاب کو تقسیم کرنا چاہے تو دنیا میں جتنے لوگ اب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کو ستر ستر دے سکتا ہے۔ اور پھر بھی اس کے پاس کچھ بچ رہیں گے۔ اگر دماغ کے کسی حصہ پر آدھ آنے والا ٹکٹ رکھ دیا جائے تو اس کے نیچے تقریباً بیالیس لاکھ اعصاب تڑپتے ہوں گے۔ اگر کسی انجنیر کو ایسی کل کا تصور ہو سکے جس میں دماغ کی طرح تاروں کا جال بچھا ہو اور ہر تار سے فی ثانیہ چالیس یا پچاس پیام دوسو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آتے جاتے ہوں تو البتہ اسے اس پیام رسانی کا اندازہ ہو سکے گا جو ہر صبح کو دماغ انجام دیتا ہے۔"

———— (۰) ————

صدارت عظمیٰ یعنے باب حکومت سرکار عالی نے بذریعہ مراسلہ نشان (۹۶۱) مورخہ ۱۰ فروردی ۱۳۳۷ف اعظم اسٹیم پریس کو از راہ قدر افزائی و رعایا پروری گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر مقرر فرمایا ہے سرکار عالی کی اس قدر افزائی کا کارپردازان و مالک مطبع کی جانب سے تہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد جملہ جلیل القدر عہدہ دار صاحبان سررشتہ تعلیمات و صدر مدرسین و اساتذہ صاحبان و طلبا مدارس خانگی و سرکاری کی

خدمت میں استدعا ہے کہ:

حسب منشا ارباب حکومت سرکار عالی اس مطبع کو خدمات طباعت و جملہ سامان تعلیمی و کتب درسی و فارمس وغیرہ کے آرڈر سے سرفراز فرما کر مطبع ہذا کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

انشاءاللہ تعالیٰ یہ کارخانہ بھی اپنے معاملہ داروں سے بپابندی وعدہ اور بہ اخذ اجرت واجبی اپنی سچائی اور خوش معاملگی و خوبی کار سے جو اس کی ترقی کا حقیقی راز ہے مالک و ملک کی خدمت گزاری میں کبھی دریغ نہ کرے گا۔

خاکسار

سید عبدالقادر

مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و تاجر کتب و پبلشر چارمینار حیدرآباد دکن

Quarters are concerned, we entirely agree with the recommendation of the Burnett Committee that until it is possible for the Education Department to give every school a play-ground, an attempt should be made to provide play-grounds common to the schools of selected areas. In the meantime, the heads of schools should endeavour to make the best possible use of such space as is available. As the above-mentioned Committee have pointed out, "many games of great physical value do not require very much space." In view of the importance of swimming in any scheme of physical education, the proposal for the construction of common swimming pools is also worthy of serious consideration by the Department. At present owing to the lack of a swimming pool, there are no arrangements at all for teaching the boys how to swim.

In the end, we trust that, as suggested by the Burnett Committee, Government will be pleased to appoint at an early date a representative committee to investigate the whole problem of physical education.

We regret that owing to the summer vacation, during which two of the members of the editorial staff were out of station, we could not bring out this number of the *Hyderabad Teacher* earlier.

is closely connected with medical inspection. Another vital need for placing physical training on an efficient basis is the substitution of educated and fully trained physical instructors for the present type of drill masters. Both the Committees are agreed that physical instructors should be at least matriculates who have undergone training in physical education and that when they become too old to give instruction in physical training effectively, they should be absorbed in the teaching line. At present there is no provision in Hyderabad for the training of physical instructors. If it is not possible for the Education Department to open a Training College for them, we suggest that a few teachers of the requisite academic qualifications who are really keen on physical education should be sent annually to the Y. M. C. A. School of Physical Education, which is one of the best institutions of its kind in India.

One of the recommendations of the Beasley Committee is that as health instruction is an essential part of physical education, it should be treated as one of the subjects of the school curriculum. While we fully realise the importance of teaching subjects like physiology and hygiene during school hours, we agree with the Burnett Committee that it is not possible at present to add them to the already overcrowded curriculum of the secondary schools. If they are treated as optional subjects, then as the Beasley Committee have themselves pointed out, they will not receive due attention. Under the circumstances, the best plan, in our opinion, would be for the Head-Master of each secondary school to arrange for talks on these subjects to be given to pupils outside school hours either by the science assistant or, if need be, by a medical man.

The question of providing adequate play-grounds deserves the immediate attention of the Government. They should make it easier for the Education Department to acquire land for school buildings and playing-fields. As far as the Head-

Editorial.

Physical Training in Schools.

It is gratifying to find that politicians as well as educationists in India are awakening to the need for giving physical training the place which it deserves in the curriculum of our schools. It is to be hoped that the British Government will soon take action on the proposal for the introduction of compulsory physical training in schools and colleges, which was passed by the Legislative Assembly a few months ago and to which a reference was made in the article on "Compulsory Physical Training in Schools" published in our last issue. As far as the Education Department of H. E. H. the Nizam's Government is concerned, it has recently given ample proof of its interest in physical education by organising a physical training class for teachers, an account of which is given elsewhere in this issue. In the meantime, the Sub-Committee appointed by the Hyderabad Teachers' Association early in April, 1929, has prepared a valuable report, which is to be discussed by the annual conference of the Teachers' Association on the 5th July. The main recommendation of the Sub-Committee is that a committee should be appointed by Government to draw up a scheme of compulsory physical education. We strongly support this proposal. When the Government of Madras felt the need for the improvement of physical education in the Madras Presidency, the first step which they also took was to appoint a committee. The report of this committee, which was published by the Government of Madras last January and a translation of which appears in our Urdu section, is perhaps the best contribution that has yet been made to the literature on physical training in Indian schools.

Like the Beasley Committee of Madras, the Burnett Committee appointed by the Hyderabad Teachers' Association considers that any sound system of physical education

Mr. Venkateswaran's article on " Education in the Philliphine Islands " is also interesting and instructive. According to him, the system of education in those islands is intensely practical. The subjects taught include handicrafts, embroidery, basketry and agriculture. It is remarkable that in one year things produced in the school gardens fetched a sum of half a million dollars. The Director of Education himself is said to have exported 15,000 baskets manufactured in these schools to foreign markets. The Department organises civico-educational lectures on such subjects as cholera, small-pox, beetles and cocoa-palms.

In his interesting article on " Ideals and Idealists " Mr. A. Swaminatha Ayyar describes many incidents in the life of Woodrow Wilson to show that he was a perfect type of an idealist.

The editorial is ably written, while "Topics from Periodicals " at the end of the magazine cover a wide educational field. The journal is well got up and deserves every encouragement. The price is only Rs. 3 a year.

Review

" The South Indian Teacher. "

This is the official journal of the South Indian Teachers' Union, Madras, and it is published monthly. The 'May' number under review contains the following articles :—

1. Notes on Indian Historical Research by Prof. V. Rangacharya.
2. The Folk High Schools of Denmark by Joseph K. Hart, PH. D.
3. Secondary Education by Rao Bahadur, K. S. Appusastrigal, B.A.,
4. Education in the Phillippine Islands by N. K. Venkateswaran.

Dr. Joseph Hart's article is a reprint from " The New Era". It gives a brief history of the Danish Folk High Schools and describes the beneficial effects which they have produced on rural life in Denmark. A Danish Folk High School is a boarding school with 4 or 5 teachers and 125 pupils. The only qualification for admission is that a student must be not less than 18 and not more than 25 years old. The lecturers give talks on history, science, agriculture and co-operation. There are no examinations, no formal studies and no assigned lessons. Yet thanks to the use of the school library, to the lectures and to the informal discussions which are held daily, within a few months the students become interested in knowledge and learn how to think about important matters. Mr. Hart concludes: " The chief explanation of the remarkable progress which the people, especially of the farms and villages, have made in the last seventy-five years, from poverty and misery to prosperity and happiness, is to be found in the work of the Folk High Schools ". These schools have certainly got a great lesson to teach India.

The third biennial conference of the World Federation of Education Associations will be held at Geneva from 25th July to 3rd August. The main subject for discussion at the conference will be how to unite the world's educational forces on the proposition of international understanding and goodwill. All parts of the programme will have a bearing on this theme.

World Education Conference.

Mr. Syed Mohamed Azam, M. A. (Cantab), Principal, City College, and Miss Amina Pope, Principal, Zanana Nampalli College, Hyderabad Deccan, will represent the Education Department, H. E. H. the Nizam's Dominions, and the Osmania University respectively at the conference.
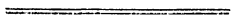
History.	Needle-work.
Geograpy.	Art.
Mathematics.	Music.
Chemistry.	Hygiene.
Botany.	Mensuration & Surveying.
Natural History of Animals.	
Agricultural Science.	

Only such holders of certificates as satisfy the above conditions can be provisionally admitted to colleges, and the admission is to be final only after the recognition in each case is granted by the University.

2 Applications for such recognition must be made within a month after the commencement of the first term of the Junior Intermediate Class, and must be accompanied by the original certificates with the marks obtained and a Treasury Receipt for Rs. 5 (five)—the fee prescribed for considering each application for recognition.

Recognition of the Intermediate Examination of an Indian University by the French Government.

The French Government has recently decided that subject to attestation by the University Bureau of the British Empire, the Intermediate Certificate of an Indian University will be accepted as a qualification for admission to a degree or other course at a French University.

A correction

The Sports Superintendent of the Office of the Chief Inspector of Physical Education, Hyderabad Deccan, informs us that in addition to the 5 trophies mentioned in the last issue of the *Hyderabad Teacher*, trophies for the following events were won by the Chaderghat High School in the Annual Athletic Sports held in January, 1928 :—

Relay Race.	Middle School Division.
Shuttle Relay.	Primary School Division B.
Individual Championship	Middle School Division A & B.

(5) The Teaching of Urdu.

Chairman : Mr. Abu Zafar Abdul Wahed, M. A., Lecturer, City College.

Secretary : Mr. S. Fakhrul Hasan, B. A., B. T., Head-Master, Chanchalguda Middle School.

We have published elsewhere the provisional report prepared by the Sub-Committee on Physical Education. Reports of the other Sub-Committees will be published in our next issue.

The Conference will devote its time mainly to considering the of above-mentioned reports. There will, however, be a lecture on the kindergarten system, which will be delivered by Mr. Sajjad Mirza, M. A., (Cantab:), Principal, Chaderghat High School. It is also expected that Mr. F. Weber, Y. M. C. A. Director of Physical Education for India, will speak on Physical Education. As usual, an educational exhibition will be held along with the Conference.

Resolution of the Madras University regarding the Oxford and Cambridge Senior Local Examinations.

The Syndicate of the Madras University has recently decided that the Oxford and Cambridge (Senior Local Examination) School Certificates will be recognised as equivalent to the Matriculation Certificate of the said University for purposes of enabling such certificate holders to pursue higher courses of study in any of the Constituent Affiliated Colleges of the University under the following conditions :—

1. A candidate should have *passed with credit* in at least four subjects of the Examination of which three should be from the subjects included in Group A as noted below. One of the subjects in Group A should be English. For this purpose the subjects for the Examination have been grouped as under :—

Group A.	*Group B.*
English.	Short-hand.
Any Language.	Book-Keeping.

ation of the fine spirit in which the teachers had taken the work and entered into all the items of the programme.

The Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

Mr. Fazl Mohamed Khan, M. A., Director of Public Instruction, Hyderabad, has kindly consented to preside over the Third Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association which will be held in the City College Hall on the 4th and 5th July 1929. With a view to making the Conference as useful as possible from the practical point of view, the Association appointed early in April 1929 five sub-committees and requested them to submit their reports to the Conference. The names of the sub-committees and of their chairmen and secretaries are as follows :—

(1) Vocational Education.
Chairman : Mr. S. Mohamad Husain Jaferi, B. A. (Oxon), Deputy-Director of Public Instruction.
Secretary : Mr. Mohamed Sultan (Nampalli High School.)

(2) Physical Education.
Chairman : Mr. K. Burnett, M. A. (Oxon), Principal, Nizam College.
Secretaries : Mr. Raghavan, B. A., B.T., Lecturer, Nizam College and Mr. Ali Raza Khan (Madrasae Aliya.)

(3) The Teaching of English.
Chairman : Rev. F. C. Philip, M. A , Warden, St. George's Grammar School.
Secretary : Mr. G. S. Prakash Rao, M. A., L. T , (Darul Uloom High School.)

(4) The Teaching of Mathematics.
Chairman : Mr. Ahmed Husain Khan, B. A., Principal, Darul Uloom High School.
Secretary : Mr. G. Sundaram, M. A. (Methodist Boys' High School).

Weber has done very useful work since he arrived in this country, having conducted physical training classes in Behar, the Punjab and the Bombay Presidency before coming to Hyderabad.

123 teachers (including drill-masters) from nearly 60 different institutions attended the class which was held in Hyderabad from 18th April to 4th May. The work of the class was divided into two parts—theory and practice. We have published elsewhere in this issue an article by Mr Weber which gives the principles taught by him. Of these principles, the one which he emphasised most was that physical training must fit the man to the new age which demands not muscular energy but nervous energy, not muscular power but organic vigour. In connection with the practical side of the course, he gave instruction in posture exercises for correcting and preventing mal-posture in school boys and college students. He also taught five different model exercise drills, each one adapted to the needs of boys of the various grades. Towards the end of the course, games—simple and in the mass—were demonstrated. The Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, placed at the disposal of the class several hundred school boys for the purpose of practice teaching in the model exercise drills and games. Lessons were also given in swimming, and while some teachers learnt for the first time how to swim, others were taught life-saving and diving.

On the 4th May the members of the class gave an entertainment to Mr. Weber. Messrs. Abdul Majeed and Bhasker Narayen made short speeches in Urdu and English respectively thanking Mr. Weber for the great trouble which he had taken and the keen interest which he had displayed in conducting the class Mr. Fazl Mohamed Khan, Director of Public Instruction, then presented to him a few specimens of Bidri work on behalf of the teachers who had attended the class. In his reply, Mr. Weber expressed his appreci-

Notes and News.

Progress of Education in Hyderabad.

The following comparative statement shows that the progress of education in the Hyderabad State in 1928, for which figures are now available, was very satisfactory :—

Grade of institution.	1336 Fasli (1927)		1337 Fasli (1928)	
	No of Institutions	No. of Scholars.	No. of Institutions	No of Scholars.
Colleges	7	1,143	7	1,124
Secondary & Special Schools	151	41,906	154	44,356
Primary Schools	3,979	2,24,983	4,012	2,31,811
Special Schools	49	3,825	51	3,977
Total	4,186	2,71,857	4,224	2,81,268

The direct expenditure on education in 1337 Fasli was as follows :—

	Rs.	as.	ps.
Primary Schools	21,61,687	5	4
Secondary Schools	20,94,953	5	5
Colleges	7,06,929	13	10
Special Schools	3,57,176	15	2
	53,20,747	7	6

Physical Education in Hyderabad.

Taking advantage of the visit of Mr. Weber, M.A., B.P.E. to Hyderabad Deccan, the Education Department of H. E. H. the Nizam's Government organised a physical training class for drill-masters and teachers of primary and secondary schools before the summer vacation. As the Y. M. C. A. Director of Physical Education for India, Mr.

3. The establishment of social service organizations in schools and colleges for promoting the spirit of fellowship and cooperation among the students.
4. The utility of periodical meetings of the members of the managing bodies of schools, the guardians and the teachers.
5. Starting and maintaining public gymnasiums by Municipalities and Local Boards.
6. The raising of the scale of salaries of the primary school teachers.
7. Recommending that teachers of three years' standing should be allowed to appear for Degree, Diploma, or Certificate Examinations in Teaching without having to keep terms at a Training College ; and
8. The provision for the education of the Adult and the education of the Defectives by the public and the Government.

simple pity and sympathy for them but admiration for their exquisite power and skill on different musical instruments and at different handicrafts.*

A group photo of the Delegates, a social gathering, an educational exhibition, and demonstration of educational films by the Kodak Co. were some of the items of the programme of the Conference. The history and use of the Panama Canal, Reforestation in American Wilds, from Iron Ore to Pig Iron, Cotton Growing and Cotton Products were the films shown by the Kodak Co. The exhibition was held in the spacious rooms of the Elphinstone High School The exhibits were tastefully arranged. They included besides the usual drawings, handwriting and similar other. class work of talented pupils, newspaper cuttings giving a brief history of Afghanistan, the crepe flower decoration, Triplywood articles such as frames and other stencil works, handwritten magazines and needlework from girls' schools. The valuable prizes awarded to individual sportsmen and for team-competitions in the Bharda High School of Bombay were also kept in a prominent place. The quality of the exhibits was higher than that of what is usually seen in the educational exhibitions which are held in Hyderabad. The leading publishers had their stalls in the Exhibition and were all very courteous to visitors in showing them their books and catalogues.

About 30 resolutions were adopted. Some of the important ones are the following :—

1. The necessity of using the dominant language of each province as the medium of instruction and examination in the secondary and higher stages of education ;
2. The urgency of making physical training compulsory in all schools and colleges ;

* It is interesting to note that in our Dominions there are 3410 Deaf and Mute, 19,138 Blind, 2,519 Insane, and 4,214 Lepers according to the last Census Report.

on the side of educational research there was hardly any attempt made. Lack of teachers, lack of funds, lack of incentive, lack of organisation, these are the chief causes of the absence of research in the field of education. Therefore trained teachers who go out of Training Colleges must not labour under the belief that they are a finished product and that they have only to apply the methods they have learnt. On the contrary, they should be aware of the fact that a Training College is there to inspire and stimulate, to vitalise and quicken the spirit of enquiry and research.

Sardar Bhagwan Singh, M.A., LL.B., the Director of Public Instruction of Patiala State, read a paper giving a brief history of the progress of education in the Patiala State and showing how to meet the public demand for literacy the Government had drawn up a ten years' programme of educational expansion to be carried out in three instalments.

Mr. Toro, Deputy Educational Inspector of Visual Instruction, dealt in his paper with the different stages of Visual Instruction. At first education depended almost entirely on Hearing, then the printing press brought in the era of Reading, we are now taking the help of Seeing, and perhaps the day will come when all these systems will be time-worn and Doing alone will be in vogue. Excursions, museums, models of objects, maps, globes, drawings on black-boards, wall pictures, lantern projection, stereograph and cinema are all connected with visual instruction, and should be used by teachers for making their lessons interesting and lively.

Professor Chatrapaty of the School for the Blind at Bombay read a paper on the " Education of the Defectives ". He gave figures from the Census Report for different provinces and exhibited lantern slides which gave one an idea of the onerousness of the task of taking care of blind children and of bringing them up in such a way as would not evoke

if the public showed its willingness for their upkeep and management.

A very studied and humourous paper on "English teaching in Colleges" was read by Dr. Parker of Wilson College. He showed how the Bombay University courses were faultily grouped. He recommended a remodelled course which would give a broad general training in four subjects for a Pass Degree with a more advanced training in three subjects reasonably allied to each other for the Honours Degree. He claimed academic freedom for the Professors saying that it was the first and only article of a real educational creed. In its absence colleges were merely mills for turning out Graduates.

In his paper on "Education abroad" Mr. Vakil, Educational Inspector of Ahmedabad, observed that in striking contrast to the general apathy of most of the people in India towards education, countries in Europe and America and also Japan had besides introducing elementary free and compulsory education, made ample provision for adult education and they strove to make education all-sided, caring for intellectual as well as physical and moral education. Mr. Vakil also drew attention to the need for freedom from the dominating influence of examinations and for instruction by highly qualified and trained teachers.

"Theistic Attitude in Education" was the subject taken up by Principal Gokhale of the Karachi Engineering College. He said that a belief in God as some Cosmic Power or Law which worked with unerring precision in the whole Universe, leading to morality as its necessary logical consequence, must be impressed on children of all faiths. He thought that this would ensure religious neutrality of a positive and beneficial kind.

Principal Hamley of the Bombay Secondary Training College remarked that while the names of Bose, Ramanuja, Raman and others were known to all scientists in the West,

and soul together, one-third of the school time must be spent in acquiring some technical skill or doing productive manual labour. To this end our fields will have to become our schools, our schools must be turned into workshops, and colleges must take the shape of industrial laboratories.

Dr. G. S. Krishnayya of the Mysore University read a paper on "Extra - Curricular Activities" He gave some practical suggestions calculated to develop the personal qualities of a student. He advocated the establishment of student councils, literary societies and clubs which would build up a corporate sense among the students, enable them to think and to exercise initiative and independence, and build strong bodies and active minds so that they may be better able to discharge their duties and responsibilities later as grown up citizens.

Professor Karve, the founder of the "Indian Women's University," emphasised the necessity of providing separate High Schools for girls and affording them greater facilities for higher education. The average Indian girl has in her view not so much a professional career as married life. The education which is given to her should therefore be such as to enable her later on to discharge her duties as a mother and citizen with greater ease and efficiency. A large number of girls and even adult women would avail themselves of higher education if the insistence on the present-day standard of achievement in subjects like English and Mathematics was done away with.

Mr. G. K. Deodhar, C. I. E., of the Servants of India Society and Organizer of Seva Sadan Society for the spread of Adult Education for women, gave an idea of the scope of work the society was doing and appealed to all lovers of education interested in the uplift of India to do all in their power to make the Society accessible to as many women as possible, as its branches had been opened in several places all over India and would be organised at other centres also

Himalayas, the root base of eternal India, we have the key-note to the whole of Indian Life, and therefore to the Soul of Indian Education. Let us not look to the West for power, for unity, for lofty purpose, for truth in education: for some parts of the *body* of our education we may, for the *soul*, never."

Several interesting papers were read at the Conference, including papers on Elementary and Adult Education, High School and University Education and Education of Defectives. Some of them deserve to be dealt with at length on account of the food for thought they contain.

In his paper on "Primary Education," Mr. Desai, the School-Board Administrative Officer of Ahmedabad Municipality expressed that only 4·2 per cent of the children of school-going age were attending schools. Out of those who availed themselves of the facilities 80 per cent generally relapsed into illiteracy. Along with the expansion of education attention should also be paid to efficiency in education, and this would require an army of competent teachers. In his opinion primary teachers in general had a narrow outlook, poor intellectual capacity and were wanting in the sense of duty. Therefore, he proposed that primary schools should be manned with matriculates and under-graduates who have undergone a course of training. He wondered why the portals of the Education Dept. alone were kept so wide open as to be indiscriminately hospitable to any body and every body.

Mr. Kachhi of the Holkar State said that India required knowledge through work, work first and knowledge next. Instead of sending out thousands of matriculates and hundreds of graduates from our schools and colleges, they must prepare farmers, traders, shop keepers, carpenters, spinners, weavers, so that the gaunt spectre of starvation that stares the country in the face may disappear. To solve the problem of all problems, that of keeping body

" The object of education, " Dr. Arundale said, " is to enable the individual more and more to absorb such light as there might be *without* so that his own light may shine upon his surroundings. Although, all too little is given to the teacher yet what is demanded from him is far too more and the true teacher must say ' I am vibrantly *myself* ' be ye ardently *yourselves* '. The object of education is not to shield from difficulty and trouble, from defeat and failure but to vitalise in all possible ways the inner will to walk forward at whatever cost. The teacher must, therefore, avoid the words ' Ought ' and ' Must, ' as coercion is the absolute negation of education, as is punishment, as are orders and rules. One who has to fall back upon the crutches of authority for the effectiveness of his teaching is no teacher : he may be a hammer, a prison warder, a straight waist coat. He is a teacher who has in him a divine blend of self-fulness and self-lessness. " While condemning the examination system, he said "Systems ought to play *a part* in educational life but we must not be *wholly* suited to them. Our system of education tends to establish something in the form of a Procrustean Bed. We say ' Fit this Procrustean Bed and we will alphabetise you at the end of your names.' Examinations ought not to be the ends in themselves, if so there would be more mis-fits than fits. It is a matter of great consolation that pioneers are at work throughout the world cleansing such parts of our educational stable as may partake of the nature of its Augean prototype. Students should be educated for living not for livelihood, for joy and happiness, not for temporal success ; for self expression and not for imitation ; for service and not for self-keeping".

" No more splendid back-ground is there in the world for education than India where is the true home of education, where the deepest principles of education lie imbedded in her eternity for those to find who seek the Real in regions eternal rather than in realms of time. In the glorious

of India. He directed the attention of the teachers to the Indian Cinematograph Committee's recognition of the great value of the cinema as an educational force and to their suggestion for introducing travelling cinemas on well equipped lorries as in the Punjab. Further, he stressed the need for providing educational facilities for the adult population. In this connection, he proposed the establishment of public libraries. In the concluding portion of his address, he assured the brother-members of his profession that such annual gatherings not only afforded opportunities for the exchange of opinions and experiences but also gave a real inspiration to teachers of Indian History and Geography. He expressed his sincere desire that teachers would make it a point to attend such annual conferences like the pilgrims of old who used to go periodically to some shrine and carry some of its sacred fire to their distant homes.

The conference was presided over by Dr. G.S. Arundale so well-known in Theosophical circles as well as in the field of education for his work at Cawnpore, Benares, and Madras. In his stirring Presidential address, entitled " Education—A Dream " he discussed the following :—

1. Who is a true teacher ?
2. The object of education.
3. The evils of the examination system.
4. Indian Education.
5. Warning against imitation of the West.

Dr. Arundale made strenuous demands on members of the teaching profession saying, " The supreme gift of a teacher is to be his own very best and biggest self and not a lifeless imitation of some one else. The best he can give to his pupils is himself ; he must not be a gramaphone record, a parrot. The pupil needs *his* fire, *his* light, *his* life. He must be as our Lord the Sun shining more and more unto the perfect day and unto the perfect day of those temporarily entrusted to his care ".

The Fourth Annual Conference

OF THE

All-India Federation of Teachers' Associations

BY

V. V. HARDIKAR,

Head Master, Vivek Vardhini High School, Hyderabad, Deccan.

THE fourth Conference of the Federation was held in Bombay at the Sir Cawasji Jehangir Public Hall on the 4th, 5th and 6th November 1928.

The Executive Committee had arranged this year a varied programme of full three days and the delegates from various and distant places (including many Native States) from all over India evinced keen interest in the proceedings. The officers, both Indian and European, of the Bombay Educational Department made the Conference a great success by reading interesting papers on important educational subjects.

After extending a warm and cordial welcome to those that were assembled, Principal P. Sheshadri, the President of the Federation, gave a brief history of the Federation since its inception in 1925. In his speech he referred to the Educational Report for 1925-26 issued by the Government of India and stated with a feeling of depression that the percentage of boys under instruction had risen during that period from 6 to only 6·5 and that of girls from 1·2 to 1·3. He hoped that energetic steps would be taken both by the Government and the public to bring the entire school-going population within the benefits of instruction. Continuing, he referred to the recommendations made by the several Commissions appointed by the Government such as the Agricultural Commission and expressed the hope that the Hartog Committee would bring together some facts which would be of real value and guidance to the solution of the numerous educational problems

(15) That ultimately due weight should be given to the Physical Training of a boy by means of a certificate which like his vaccination or inoculation certificate would be attached to his application for the different Goverment examinations.

(16) That should some scheme of Physical Education be adopted the beginning should be made with the schools for which least is provided under the present conditions.

(Sd.) K. BURNETT, M.A., (Oxon),
Chairman of the Committee.

in place of Drill-masters and by the close supervision over their work which will be exercised by the Assistant Inspectors.

(12) That one of the difficulties in the way of daily Physical Instruction is to fix on a suitable time. The ideal time is half-way through a session in which case it seems as a break and a stimulus to better brain work.

(13) That another difficulty under the existing arrangement of morning and afternoon sessions is the want of a proper mid-day meal which in some if not many cases may make physical exercises and games in the late afternoon injurious rather than help-ful, wherefore it is thought that the hours 9 a. m. to 3 p. m. might be more suitable than the present 10 a. m. to 4 p. m.

(14) That the cultivation of the Sporting Spirit, Self-control, Self-discipline, which are included in the modern conception of Physical Education, should for the present be arrived at indirectly rather than through direct instruction made part of the school time table. Each school must build up its own tradition as the result of practice rather than of precept—the practice not only of the Head and Assistant Masters but of the Captains of games and Senior Members of teams.

Similarly, instruction in the related subjects of Physiology, Hygiene etc., which are also included in the modern conception of Physical Education, need not be made part of the regular course in any except the highest classes.

As the time available is being reduced it will not be possible to add to the curriculum.

(10) That under the findings 7 to 9 above there would gradually arise in the Department a proportion of Head and Assistant Masters who would be able to really co-operate with the Chief Inspector of Physical Training and his Assistants in making Physical Instruction a live reality in the Schools.

(11) That while the ultimate goal should be for every school a play-ground of some kind and a fully-trained Physical Instructor, it is realised that it may take many years to arrive at this. A more immediate aim is that no school should be entirely outside the scheme of Physical Instruction. Thus

a. For the present an attempt might be made to provide play-grounds (and possibly also Drill-sheds and Swimming-pools) common to the Schools of selected areas, each of which would be in the charge of one the Assistant Inspectors.

For example, much use might be made of the Mir Jumla tank-bed if it were properly drained, while further possibilities may arise if the scheme for moving out the Regular Troops matures.

b. In the district Primary Schools Physical Instruction would for the present have to be in the hands of trained school-teachers who have passed through the Normal School with distinction in Physical Education.

In Head-quarters the Primary schools would be divided into areas each of which would have one Trained Instructor.

The existing arrangements in the Middle and High Schools will be improved by the graded substitution of Trained Instructors

the former for the adequate payment for Medical Inspection and the training of Physical Instructors, for the salaries or allowances of the Instructors when trained, and for the necessary clerical establishment; the latter for the purchase of equipment and in some cases the making of playgrounds, drill-sheds and swimming pools.

(7) That the Chief Inspector of Physical Training should have at least four and possibly six well-paid Assistant Inspectors of Physical Training who should be not only experts in the theory of Physical Training but also skilled exponents of at least one of the Major games. They would be graduates who could after a re-fresher course in the Normal School be absorbed in the teaching line when no longer active enough to play games themselves.

(8) That there should be a large number of fully-trained Physical Instructors (to gradually re-place the old-style Drill-Masters) divided into grades according to their academic qualifications (*i. e.* graduates, intermediates, matriculates) the majority of whom would after a re-fresher course in the Normal School be absorbed in the teaching line as they become too old for the post of fully trained Physical Instructors.

(9) That as for financial reasons it might not be possible to have sufficient full-trained Physical Instructors for all the schools it should be the aim of the department to encourage a large number of its young teachers to be partially trained to give Physical Instruction. They would be of a graduate or intermediate standing and would draw a small allowance for such time as they are still young and active enough to take a practical lead in Physical Instruction.

(3) That there should also be put at the disposal of the proposed Committee the available experience with regard to Physical Education in *a.* other parts of India *b.* other countries notably Japan, America, Great Britain, Germany, Sweden, Denmark.

(4) That any sound system of Physical Education must be closely connected with a Medical Inspection under which in combination with other simple tests the boys would be divided into Grades—Grade A. boys to be eligible for Major and Minor games, Athletic Sports and Gymnastic Classes where the facilities exist; Grade B. boys for less violent forms of exercises; Grade C. boys only for Posture training, Breathing, Bending and other Corrective Exercises; Grade D. boys *i. e.* boys temporarily or permanently debarred from any form of Physical exercise.

Boys would have an incentive to get promoted from C. to B. and from B. to A. inasmuch as the higher grade activities have a larger " re-creation " element and therefore make a stronger appeal to the natural instinct for play.

Subsidiary.

(5) That once a week in Head-quarters the necessary time in the time-table should be given by Head-Masters for letting boys work together according to their Grades while at least three times per week they should all irrespective of their Grade have a short period of Physical Training according to their usual classes. To make the former possible half a day out of the six working days should be devoted to Physical Education.

(6) That Government in the Finance Department should be asked to make liberal grants for Physical Education, both re-curring and non-recurring,

particular lesson. I want the current type of notes of lessons to be given up except where we find them to be really useful and needed. Let us permit teachers to labour as free workers and to maintain their teaching notes in any form that appears useful to them ".

Findings of the Sub-Committee on Physical Education appointed by the Hyderabad Teachers' Association.

Main.

(1) That in view of the universally accepted desirability of giving Physical Education (in the widest sense of the term) its proper place in the curriculum of all Government and Aided Schools and also in view of the present inadequate and defective provision for such Physical Education in Hyderabad, a Committee should be appointed in the year 1339 F. to draw up a scheme of Compulsory Physical Education suitable for the Schools at Headquarters and in each district.

(2) That as a preliminary step to the deliberations of this Committee reports should be made by the Divisional Inspectors on every school in their charge as to

a. its present facilities for Physical Education.

b. the extent to which they are intelligently made use of by the School authorities.

c. what proportion of the boys in the School take advantage of the existing facilities such as they are.

(It is felt that in many cases the Heads of Schools do not realise that many games of great physical value, *e. g.* American games, do not require very much space, and in consequence do not make as much use as they might of such space as is available.)

labour, a teacher may also be permitted to prepare his notes in shorthand if he happens to be acquainted with it. If these conditions are satisfied, the writing of notes of lessons will no longer be looked upon as a drudgery, as it often is at present, but it will become quite an agreeable and interesting task.

It is very important that the range of knowledge of the teacher should be as wide as possible. The main aim of education to-day is to develop the individuality of the child. For this purpose it has been found useful to employ the play-way in education as far as possible. But a teacher can use this method only if he has mastery of his subject. He should therefore be freed from unnecessary formalities, so that he may devote his time to such preparation as *he* thinks is necessary for making him an efficient teacher. Unless he is thus emancipated, he cannot create that atmosphere of freedom in the class which is required for developing the individuality of the child.

Before concluding this brief article, I may state that in the Madras Presidency where there is a considerable proportion of trained teachers and where the system of notes of lessons has for many years been maintained in all its rigour, there has recently been an awakening to the evils and futility of the system as evidenced by the following lines of an enlightened District Educational officer.

"It is unfortunate that a formal and often valueless system of maintaining notes of lessons has come into vogue. It has been rather difficult for me to find out whom these notes help. It seems to me that notes of lessons as written now may well be given up, except in the case of young apprentice teachers. I am not however proposing that the teacher need not write notes at all. They need not be all notes of particular lessons and need not be written absolutely from day to day. They might be brief weekly plans for his guidance or topical notes having no special reference to a

Anomalies of the School System

II

BY

K. NARAYAN RAO, B. A., L. T.,

Assistant, Government High School, Medak.

IN this article I propose to discuss how far notes of lessons are useful as a measure for promoting efficiency in teaching and for guaging the work of the teacher.

Advocates of the system of notes of lessons declare that it helps to show how far a teacher has prepared the lesson which he is going to give and how he is going to handle it. No doubt, however capable a teacher may be, he should prepare his lesson beforehand and should leave nothing to chance. Unless he does so, he will not be able to face his task in the class-room confidently and satisfactorily. But the assumption that one cannot teach without lesson-notes cannot be accepted. While actually engaged in teaching, one usually draws upon one's mental notes rather than on any written notes that one may have prepared. In schools where a teacher is compelled to write lesson-notes, he writes them more for the satisfaction of the headmaster or the inspecting officer than for his own satisfaction. This kind of formality serves no useful purpose. On the other hand, it unnecessarily takes up a good deal of the valuable time of the teacher and thus deprives him of the opportunities for self-improvement.

It may be asked, has a teacher then no need to write notes of lessons at all? The answer is that the writing of notes of lessons must not be imposed from without but the need for it must be felt by the teacher. Their value depends on the extent to which they help him in making his lesson effective. He should always use them as a means and not as an end. It is no good his writing them for mere show. With a view to economy of time and

period are likely to suffer a good deal in their after life. Every teacher must make it a point to see that the boys always keep their teeth clean. The following rules should be carefully observed :

(1) Every boy should be made to clean his teeth carefully either by using a good tooth-paste and tooth-brush or finely powdered chalk or charcoal mixed with a little salt.

(2) If the tooth aches, or it is found that 'tartar' has deposited, the guardians should be informed forthwith and the teeth should be attended to by a dentist, else chronic inflammation of the gums will result.

(3) If there be caries the help of a dentist should be sought without delay, lest they should lead to other complications of dental diseases.

(4) Careful cleaning of the teeth should be attended to at least twice a day and particularly before going to bed.

(5) If brushes are used they should be kept thoroughly clean, else more harm than good will result.

(6) The growing habit of chewing '*Pan*' (betel-leaves) by the boys should be discouraged.

(7) Cases of bad teeth and bleeding gums should be attended to by a competent medical man or a dentist.

The subject of dental hygiene is an important one and every parent and every school-master should see that the teeth of the school-going children are carefully preserved and as a first step towards this, the teachers and the guardians themselves should set an example to the boys and girls. In western countries arrangements are being made to get the teeth of the school children examined periodically and that experiment deserves a trial in India. In the words of Don Quixote "Every tooth in a man's head is more valuable than a diamond."

children and on a careful analysis of the results obtained, I have come to the conclusion that the teeth of 75% of the school-going children are bad and need treatment. An American writer rightly holds that the mouth is the gateway of the whole human system and the teeth are the guardian angels thereof.

Every parent and teacher must realise that defective teeth are responsible for many diseases and make the children susceptible to the following ailments in particular: (1) Pyorrhea, (2) Dyspepsia, (3) Consumption, (4) Pneumonia. Unclean teeth and bad gums give rise to offensive smell and the inflammation of the gums. Those wonderful instruments meant for masticating the food, if neglected in the beginning, will do immense harm. With a little care on the part of the parents, as well as of the teachers, many ailments can be averted and the children rendered better fitted to digest their food and maintain their general health in a sound condition. It should not be presumed that with the removal of an aching tooth and the substitution of an artificial tooth all troubles will end. We should adopt, on the other hand, preventive measures to check the growth of defective teeth and try to maintain the teeth in their full strength for as long a time as possible.

It is the common experience of almost all parents that the teething period of their children is a critical period. Many children suffer from high fever, bad cold and even convulsions during this period. Every care should then be taken of the children. An enducated mother will always see to it that the feeding-bottles and the nipples are perfectly clean. But when school-children have their permanent teeth, greater care is needed for their preservation. Many fond parents erroneously believe that since the teeth of their children drop off sooner or later, they need no care. But there cannot be a greater mistake. Boys and girls whose teeth are neglected during their school-going

"The best teacher is he who knows how to put this activity (of reasoning) into movement. When the child has once made a start, it is sufficient to stimulate him gently, and to call him back when he goes astray, while always leaving to him, as far as possible, the toil and the satisfaction of discovering whatever he wishes him to find. Let the child form the habit of justifying what he asserts, and of expressing himself freely in his own language; allow him even to expose himself to error and have him correct it by showing him wherein he has failed in reflection; this will be the most profitable of lessons. When from the beginning to the end of his studies, he shall have been subjected to this discipline, we may be assured of having formed a good mind, capable (whatever be the profession he chooses) of a rational and successful application."

Dental Hygiene in Schools

BY

DR. B. G. BORGAONKAR,

Dental Surgeon, Secunderabad.

IT is a happy sign of the times that educationists all over India are devising various means to improve the physical well-being of the pupils undergoing instruction in different schools. In some parts of British India and in some of the Indian States, medical inspection of school-children has been already organised. But while great attention is being paid to the diseases of the eye, the nose and the throat, I feel that the subject of dental hygiene in schools has been comparatively neglected. Even parents seem to consider that the care of the teeth of children is not a very important matter. All medical men unanimously agree that teeth play an important part in the maintenance of general health. I have had several occasions of examining the teeth of school

If a problem has really interested the child, the obvious thing to do is to let him attack it. But it is at this point that many teachers make a mistake. They proceed to deal with the problem themselves before allowing the pupils to attempt its solution. It should be borne in mind that if the teacher explains the problem first, it is he, and not the pupil, who does the reasoning proper. It is poor satisfaction to set the boys on to do the problem when the lines of solution have already been laid down; for the mechanical calculation is all that remains. And exercise in this is not the chief purpose in setting problems.

Every rule a teacher would teach should be first of all made the subject of an oral lesson and demonstration. The method of experiment and induction will often enable him to arrive at the rule. In arithmetic the teacher is justified in saying to his pupils, " Believe nothing which you can not understand; take nothing for granted". In short the proper function of arithmetic is to serve as elementary training in logic. The teacher should endeavour to give the pupil skill in grasping the meaning of problems and in interpreting them as well as in attaining accuracy and rapidity in the mechanical work of arithmetic. There is in an Elementary school course scarcely any more effective way of training the boys in thinking and reasoning than is to be found in an investigation of the principles which underlie the rules of arithmetic. When childern obtain answers to problems by mechanical routine without knowing why they use the rule, or when they ask themselves, "what rule or formula should be applied here?" they cannot be said to be well instructed in arithmetic. Plenty of practical work with suitable examples is absolutely necessary.

In conclusion, I should like to give an extract from Compayre (translated by H. Payne) to show what a teacher should do to develop the reasoning power of his pupils. He says,

do not appeal to them. Such problems in arithmetic should be set in the class as would necessitate clear thinking and would be useful in satisfying the actual needs and experience of pupils outside the school.

Many of the errors in arithmetic committed by pupils are due to their inability to correctly interpret the relations expressed in problems. When a teacher finds pupils inaccurate in this way, it is no good his saying to them: " Now be more careful next time"; or "If you do not pay proper attention I shall have to send you back to the lower standard". Pupils, who have not formed habits of accuracy and clear thinking, cannot correct their errors by simply saying to themselves, " I must not commit any mistakes hereafter". Experience teaches us that threats and exhortations addressed to pupils who have developed inaccurate methods of work serve no useful purpose. The efficient teacher will analyse the situation before him seeking to discover the cause of the error made by any pupil.

Every experienced teacher knows that young pupils do not readily detect their own errors. When a novice executes anything, he is practically unable to go back over the detailed steps and detect the one that is wrong. Hence the direction " Now look over your work and see that it is correct " scarcely ever yields satisfactory results, for it is difficult enough for even an adult to detect errors in what he has done.

And yet, we must develop in our pupils the ability to review their work to the fullest extent possible and detect errors. They can be made to eliminate mistakes from all their work if they are required always to check every process and " prove " every problem. No solution of a problem should be accepted from a pupil until it has been checked. When a teacher requires his pupils to go back over their own work and discover their errors, he provides the greatest safeguard against their making the errors again. To know how to check a problem is just as valuable as to know how to solve it.

they should have the children draw a line an inch long, a foot long, and so on. Their principal aim is to have their pupils remember verbal statements they have learnt and apply them in the special formal situations which they usually present to them. But these situations do not really involve any knowledge of actual measurements or weights. They demand only a knowledge of words.

The abovementioned method of teaching weights and measures is entirely wrong, since it does not require the pupils to deal with actual units. When they solve a problem they do not think of the results in terms of actual distance or area or weight or size of the measure employed. Care must be taken in the early years to make the child's arithmetical thinking definite and concrete. The childern should be required to make diagrams to illustrate all problems involving weights and measures. When a pupil is required to work in this way he gains a comprehension of the meaning of his processes, which he can never do if he simply learns tables and then tries to apply them to situations in which he is not acquired to construct anything actually.

A child has little, if any, interest in finding how much paper will be required to cover the walls of an imaginary room which he has never seen. But if he is constructing a card-board model of a small room and wishes to line it with paper, he will see the point in calculating how much paper of a given width he will require. And his calculations in square inches are just as difficult and involve just as much intelligence as the calculations in square yards for the hypothetical room. Both problems require the same kind of reasoning. The difference is that in the one case the boy is really interested in getting his result, in the other case he is not. Much of the failure to get childern to reason in arithmetic, and for the matter of that, in other subjects is due to the fact that the situations proposed in the problems

in knowledge of such words by requiring them to reproduce them verbatim, he would not be able to arouse general thinking ability in the pupils. The chief reason why these pupils do not learn to think as we wish them to is that our teaching situations often do not require thought in the sense in which we use the term. Many of our school-room exercises employ verbal memory largely if not wholly; they cannot cultivate thought power among children.

The child learns by doing. Learning is a process of self-activity. Unless he can take an active part in what is going on, he will not be interested. His activity must be utilised not only in dealing with concrete objects, but in close connection with ideational teaching. Arithmetic should, as far as possible, and especially in its early stages, grow out of, and become incidental to, definite constructive efforts in which the childern are interested.

Let us look at the result of mere verbal teaching in certain phases of arithmetical work. Teachers in some schools endeavour to teach weights and measures to their pupils. They desire that the boy should learn the table of weights by heart. Their children have not handled a tola, they have only a dim idea of a quarter-seer weight. Yet they repeat over and over again that 5 tolas make one chhatak, 4 chhataks make one quarter-seer, and 4 quarter-seers make one seer, 40 seers make one maund and 20 maunds make one candy, and so on. The teachers frequently give problems like the following for drill: How many chhataks are there in half a seer? in 2 seers? and so on. In this work the effort of the children is directed only towards remembering the table and performing correctly the multiplication processes given by the teacher. The teachers apparently never once think of asking them to indicate an approximate weight of a certain thing by feeling it with their hand or in some other way. Similarly, while teaching the tables of linear measure, it does not occur to them as necessary that

The Teaching of Arithmetic as a Logical Exercise

BY

D. C. BHOGLE, B. A., B. T.,

Assistant, Mahratti Normal School, Aurangabad.

In my previous articles I dealt with the teaching of Arithmetic mainly from the utilitarian point of view. In this article I wish to show how arithmetic develops the reasoning powers of the pupils. Arithmetic, if it deserves the high place that it conventionally holds in our educational system, deserves it only if it is treated as a logical exercise. It is the only branch of mathematics which has found its way into Primary and early education, its other branches being reserved for what is called secondary or university instruction.

In mathematical studies the pupil learns the process of induction in acquiring new rules. Individual cases are presented to him and from a study of these a general rule is drawn up, while the application of this rule, thus acquired, affords practice in deduction.

An attempt will be made in this short article to show how a competent and enthusiastic teacher can train his pupils' power of reasoning. The close connection between priniciples and practice and between the abstract and concrete makes Arithmetic the most useful and educative subject in the school curricula.

The pupils should be trained to thoughtful reasoning. The only function of thought is to organise experience and use it to help one to adjust oneself to new situations. No one would acquire thinking ability, unless he works for it either to gratify his curiosity or to minister to his wants of one kind or another. Necessity is the mother of intellectual acumen. If a teacher were to ask his pupils to memorise the words of a textbook and were then to test their success

A Bias for Poultry. Poultry, of all industries, suits the boys best. Apart from its commercial value, it is a fascinating hobby. Boys have an unfailing love for pets. And a breed hen, dark-eyed, large-combed, silver-laced and heavily shanked will send them to ecstacies. Talking of its trade-value, poultry seems to offer an immense field for exploitation. In all cities and towns of India there is a real dearth of good poultry meat and eggs, while it is also true that food-products will never suffer from overproduction. In competition the purer products will invariably command ready and quick sale. We found our fairly large yield from the school farm too small to supply the demands of those living in the compound not to speak of the friendly bargains with our neighbours. It is beyond dispute that poultry-products will never lack market.

Its moral value. Vocational education, above all other considerations, is a great factor in developing character. There is no better way for a boy to cultivate self-reliance, patience and industry than by running his own concern of poultry. It adds personal delectation to the sordidness of a commercial occupation. The Indian student is averse to an industrial career because of the squalid drudgery it involves. Much of this can be avoided by the right choice of the trade. We do not thus ignore the hard facts of a commercial life but we certainly advocate gradual initiation into the process of perfection.

This article is merely indicative of the wide possibilities in this line of venture in our schools. Sooner or later we shall have to solve the unemployment and poverty problem in all its stupendous complication. Our schools have again and again been reviled as factories of raw and incompetent job-hunters. I sincerely believe that our schools have to take the initiative in mending matters. And I cannot imagine a nobler task devolving on school-masters because of the exclusive privilege they have as shapers of the young manhood of our country.

at the end of a year had turned quite a number of boys into vocational channels.

Our method. Success in this direction depends on the efficacy of the method adopted. Mere enthusiasm will not set the boys hobby-riding. In introducing any such industries in the school we have to work on expert lines. Failures are often due to lack of business ways. Talking of poultries, our first step was to import a few birds excelling in beauty and size. That was enough to rouse the whole school. Our beautiful Brahma cock and the fat hen waddling about in the school-compound soon drew a crowd of admirers, while the couple of massive mottled games provided infinite fun for the urchins whose usual violent overtures always met with a dignified pugnacity from the 10 lb cock. Our leghorns, being of comparatively ordinary looks, roused little enthusiasm except among some older boys who had keener eyes on business. Our next step was to insure a steady income for the boys from their stock. That kept them going in good humour. We were convinced that any failure in the initial stage would ruin the reputation of our business and create deserters in the ranks.

Poultry and Science. In spite of expensive science-laboratories and up-to-date newspaper rooms, we found our boys always to fall short of practice. It was thus impossible to teach the boys the value of scientific diet for poultry and the careful medical treatment of sick chickens. Fish-meal, buttermilk and lucerne fed to the chickens evoked most stupid remarks from them while a dose of ipecacuanha or an operation of the food-crop of the bird resulted in establishing our insanity. Still our signal successes in this direction soon removed their incredulity. Great harm, however, may be done by those clumsy enthusiasts whose excessive medical zeal and slovenly surgery often result in the massacre of the whole flock. After all, prevention is better than cure.

Every year a huge outturn of University men gluts the service-market only to find that the purely academic education which they have received has no job value. Our education is one-sided, and it fails to exploit our man-power to any varied or full extent. Utility and job value are two distinct factors in American education. Thus cattle-breeding, poultry-culture, bee-keeping, and innumerable other industries form the basis of scientific research in most American Universities. The secret of American prosperity lies not in abundance of resources but in their scientific exploitation. It is time, therefore, that we shaped our educational policy to supply the practical needs of life. To those flag-bearers among us who still desire to keep intellectualism above mundane affairs we plead that there is plenty of room to accommodate the commercially-minded among us.

Creating an aptitude. Educational theories so patent and established in America and Europe, however, do not find ready acceptance in our country. There are three great obstacles in the way. In the first place, there is a traditional dislike among us towards all manual labour. The educated Indian feels it beneath his dignity to put his hand to what he calls 'low jobs'. Then there is lack of initiative and enterprise among all classes of Indians preventing them from taking up anything new and venturesome. We also suffer from inertia and the emasculating habit of resignation and are loath to enter into a fight or competition. Vocational education, therefore, requires much pioneer work before we can hope to accomplish anything. Our first effort should be to create an aptitude in the boys for careers of this kind. In our experiments in the Methodist Boys' High School, Hyderabad, we were struck with the bourgeoisie mentality of the boys. And yet our boys are drawn from the poorer classes. The little education which they have received has merely served to aggravate their vanity. We, however, worked with persistent optimism and

dangers—so has every method. But to the writer at any rate, this seems to be a much truer sort of education than that which goes under that name in many schools. An education such as this is a training for life. But here is the crux—*everything depends upon the teacher.* Obviously he must be well-informed to carry out such a method, and what is even more important, he must be *keen.* But surely it is not too much to expect that teachers shall be both well-informed and keen. So often, one hears people say about this method, " Yes, very nice in theory, but is it a practical proposition ?" The experiment I have described, is an answer to that. Less of the text-book and more of life is what we want. Not to cram boys for examinations but to teach them to face life and to think for themselves, is the teacher's true aim and goal.

Poultry Culture in Schools

BY

N. SHAW, B.A.,

Assistant, Methodist Boys' High School, Hyderabad Deccan.

THE struggle for existence is becoming acuter every day. All the vocations are over-crowded with scarcely any elbowroom. To secure a living, therefore, one has to leave the beaten roads and strike out new lines. One must have pluck and enterprise to lead one to most unlikely ventures that may reveal to him new and strange avenues of livelihood. India offers splendid possibilities for such venturesome careers.

The plea for poultry culture in schools is not far to seek. The problem of unemployment among the educated classes in India is becoming more and more accute.

in order to drive the lesson home he suggested that the boys should find verses in the Bible dealing with the subject of honesty. These verses were afterwards drawn on cards which were hung round the room. (The Qu'ran or Hindu religious books could of course be used in a similar way).

The teacher can do, within reason, what he likes with his boys. Occasionaly they will go to a friendly Komati, see what he has got in his shop, find out where it came from, how it came, why it had to be imported, why other things from the neighbourhood are exported etc. Or they may go to the railway yard and see what sort of goods are being brought into the town, and what sort of goods are being sent away. This opens up endless opportunities for instruction about railways, distribution of commodities, and economic geography.

The teacher soon has the boys making a map, showing the places concerned and how to get there. But since local trade is necessarily very limited, the teacher had to lead the boys into wider fields. With a stroke of genius he got the boys to bring him advertisement pictures from local papers-lamps, ploughs, mouthorgans, anything. These he pasted on cards and made the subjects of talks which soon took the class round the world. Atlases were out again ; the boys wrote notes of the pictures including not only geography but processes of manufacture etc. This naturally led on to world trade, to the East India Company and without knowing it, the boys were having a history lesson.

The boys were also asked to collect any reading matter bearing on trade. Lessons on the subjects were taken from the school reading books and these extracts, along with other suitable ones, were bound together into a little book which summarised most of what had been learned during the year.

This in brief was the way in which this particular project was carried out. Such a method as this has its

alloted to the project, the other half to the ordinary school subjects.

In the first *panchayat* they soon discovered that they could not carry out the practical part of the project without money. So they composed a letter to the Management asking for the loan of a few rupees as capital. This was a splendid exercise in composition and practical letter writing. The Management readily acceded to the request.

Then followed a visit to the bazaar to buy some suitable wood with which to make a shop. The boys went in a body, chose their wood and paid for it themselves. After careful measurements and calculation in order to avoid waste, a saw, hammer and plane were requisitioned and the little shop was put together. Industries are carried on in the school, so tools were easily procured. Then came the question what should be put in it. A Trading Company was floated on a capital of Rs. 5 and it was decided to buy in school supplies wholesale, and retail them to other boys. Each boy in the class was provided with an account book in which every transaction was entered. The business once started went on throughout the year. The boys became extra-ordinarily proficient in simple bazaar transactions and I have never seen such smart mental arithmetic as I saw in this class.

One day after making their purchases and writing out their accounts, they discovered that they had two annas in excess. What were they to do with it? Some said, "Let us put it to the credit of the class." Others said, "No, it isn't ours; the Komati has made a mistake, we must give it back to him." The question was put to the vote and it was agreed that they must give the two annas back. The Komati was very delighted at the boys' honesty and forthwith promised that thereafter he would give them special terms. Immediately on returning to the school the teacher wrote on the black-board "Honesty is the best policy", and

An Experiment in the Project Method of Teaching

BY

REV. L. SIMPSON, M.A.,

Principal, Wesleyan Mission High School, Secunderabad.

READERS of this journal are familiar with the Project Method. The following is an account of a concrete example, which may help us to see how the method works out in practice. It may be well at the outset to remember the three main ideas of this method.

1. Education should be related to the things of every-day life.
2. Education is purposeful activity motived by the interest of the boy.
3. We learn by doing. There can be no impression without expression.

I hope it will be seen that these three leading ideas have full scope in the particular illustration given here. The school in which this experiment took place was a Vernacular Middle School at Erode. The class was Standard V. I write only the details that I can remember.

This class was given as a project "A shop". That is to say, the greater part of the work for the year centred round the idea of a shop; this naturally developed into the idea of trade and even led the boys into elementary economics. The boys and teacher worked out everything together in a class *panchayat*, the teacher of course quietly directing it. But the boys themselves were asked to make suggestions and the course which they decided on, was followed. In this way the work they did was mainly a self-imposed task and was therefore undertaken with enthusiasm and interest. If I remember rightly, half of each day was

socially acceptable response by the respondent in any given social situation, which calls for judgment or action. "Playing Cricket" connotes the same idea, incidentally reflecting the long recognised inherent possibilities of the team game for developing right behaviour in social life.

30. Leadership essential to insure socially useful values resulting from play and games. Not all instincts or inner urges, as such, are wholesome. For that reason the question of capable leadership for boys is imperative. The leader is responsible for the satisfaction and annoyance that result from the programme of physical activities. All socially useful values should be conserved. "Games without capable leadership can be socially destructive; games with capable leadership are socially constructive." The principle here is that, capable leadership is essential.

counteract an artificial situation, or condition of life, a sedentary type of living with but a minimum degree of vigorous physical activity, such as was essential with our primitive ancestry.

26. Body-mind relationship factor. The brain, a physical organ, part and parcel of the physical body, is the instrument of the mind. When the brain is in good order the mind is good, intelligent, efficient. The brain depends for its best functioning upon the general condition and tone of the physical body.

27. Educational factor. Scientific education of the mentally retarded children proceeds through the muscular-nervous channel. Doing things physically is the basis of mental education.

28. "Morals are caught, not taught". Physical Educators, as a body, are agreed that there is nothing more significant for the development of sound morals in a boy than the life of a good man, as an example or model, much of whose life is lived before the boy. For that reason, Physical Education as a profession looks to the man's morals, who is to stand before impressionistic young lives, as the first requisite of fitness for the teacher in this calling.

29. Character values from the team games. The opportunities provided by the team game, where judgment and activity responses have to be made to a variety of quickly arising situations of importance, afford a most fertile sphere of character development under proper leadership. "Playing the Game" has become an adage in the English vocabulary of everyday usage and conveys the specific idea of right conduct, or,

and games will carry on throughout life, and not cease with the end of school days. The development of a high degree of skill in any physical activity tends to perpetuate that activity in the life of the individual. Therefore encourage the development of increased skill in all physical activities.

24. Forms of physical activity having a natural foundation (evolutionary basis) prove to contribute the most value, psychologically as well as physiologically, to the normal individual. Running, leaping, throwing, striking, kicking, hanging, are such forms. In man's primitive life of "eat or be eaten", these forms of physical activity provided the means of his escape from the enemy as well as brought him his food. Because his very life was dependent upon his success or failure in these activities, they and he developed or evolved concurrently; because of their high utilitarian value their use was required more and more and he became increasingly expert in their usefulness. With each succeeding success it is safe to assume that he derived great satisfaction from their use. Hence the philosophical explanation, or speculation, for the reason of the mental satisfaction and physiological benefit from such activities among us in this day. "The ancestral influence is engraven upon our nervous system."

25. Corrective and Preventive forms of exercise, in the form of calisthenic or posture exercises, are "artificial", in the light of the substance given in the explanation of the previous principle. The principle established under this head, however, is that an "artificial" means is utilised to

cramped thorax (neck to diaphragm). "Physical straining is not physical training."

19. Avoid exclusive specialisation for the purpose of building up bulky muscles. "All muscle and no heart and lungs" supplies quantity but not quality. Life is quality, and arises out of organic functioning. Vital capacity, or health, is not mass but function.

20. Exercises should not violate the basic organic functions of the Respiratory, Circulatory, Nervous, or Nutritional systems.

21. Principle of Progression. Exercises should be arranged, whether in a drill, class period or season's programme, according to the principle of progression. That is from the simple to the complex; from little energy requirement to greater energy requirement; from less skill requirement to increased skill requirement.

22. Order of exercises in the calisthenic drill. From arms to legs, to trunk, to combination exercises. That is, arms are exercised first, then the legs, and then the trunk, and finally combination exercises of arms and legs, arms and trunk, legs and trunk, or all three (arms, legs, trunk) exercised simultaneously. This arrangement builds up a graduated dosage. The arrangement is sometimes referred to as the Concentric system.

23. Teach such exercises and forms of recreation as can be conveniently carried on, and spontaneously entered into, after school hours, and after school days are ended. Emphasis on exercises which can be done independent of gymnastic apparatus and equipment. Build play and games' habits and attitudes in such way that those habits and attitudes in and toward play

13. Exercises should be *sane* (appealing to common sense), *safe* (within limits of undue strain), *vigorous* (large energy requirement), *beneficial* (tending toward some specifically set objective).

14. To relieve blood congestion of the brain as a result of concentrated mental app lication (" student fog "), encourage such forms of activity as vigorously exercise the extremities and trunk (neck to hips). The groups of muscles of large dimension being located in these parts, will, by being exercised, demand an increased supply of blood and a great deal of it from the vascular system, this re-establishing balance and thereby obviating the congestion of the brain.

15. Directed physical exercises should produce one or more of the following effects: Correction or Prevention of structural and functional defects; Acceleration of the activity of the Respiratory-Circulatory system; Recreational values (sheer enjoyment and good fun as expressed by pupil and child nature); Educational values (revealed by noted changes effected, physical and mental).

16. Everything considered, free-hand exercises of the calisthenic group are to be preferred to the use of dumbells and clubs. "Your body your own gymnasium".

17. If stationary gymnastic apparatus is to be used, it should be used as an object to get over and around rather than on which to perform sustained and prolonged exercises.

18. Avoid exercises which give undue strain. Pain and strain are not necessary concomitants to sound Physical Education. Especially to be avoided in exercises are static positions of the

9. Posture education for every pupil. We say, education, advisedly here, for posture is the result of mental influence just as much as it is the result of physical influence, except in the cases of the structurally deformed or the pathalogically weak. A leading Educator said "If we could teach our children to stand straight, sit straight, and walk straight, more than half the problem in Physical Education would be solved." But of paramount significance is this fact: child or adult will not be able to hold a good posture if the posture muscles are insufficiently developed. The basic need in such cases to rectify the condition obviously is the application of postural physical exercises. As an antidote and remedial measure for mal-posture, every growing child should spend a portion of every 24 hours in some form of exercise, either specific postural (as the specially prescribed) or general postural (as in certain types of games, volley ball, for instance.)

10. Regularity. A devout man will tell you, Make your religious devotions as regular a feauture in your life as the taking of food. So a Physical Educationist will tell you, Make the taking of exercise as regular a feature in your life as is your breathing.

11. Exercise for general effects. Exercise should result in general or all-round development and benefit rather than local, except as in special cases of prescribed exercises for the purpose of remedying a local structural or functional defect.

12. Teach such exercises as are interesting and within the capacity of every pupil in the class.

members; the streets, playmates, society; school, associates, *teachers.* The implied principle here is, of the 50 p. c. nurture influence, the school gets but a small portion of the child's time and the Physical Educationist but a fraction of that, so that every minute of his time must be made most of to make his influence count.

5. Individual Differences. Each child an entity in itself. Treat it psychologically as well as physically as best suits its progress.

6. Provide ample opportunity for expression of child nature, in a properly created atmosphere. The game, rightly directed, is the medium par excellence.

7. Respect the child's personality. Treat it as one having feelings, intellect, will. This attitude will result in building up rapport (harmony relation) between pupil and teacher like nothing else can. The teacher's attitude more than any other single factor determines what the child gets out of his class period.

8. Diagnosis and prescription of exercise. A cardinal principle in the teaching profession is "Explore before you teach." You cannot build properly until you have first determined the foundation. Likewise the medical practitioner explores or diagnoses his case before he prescribes the medicine for the remedy. Case diognosis and the prescription of exercise in Physical Education, variously referred to as Medical Gymnastics, Individual Gymnastics, Corrective or Remedial Gymnastics, stand as a special category. It is a sound principle to diagnose every pupil before he is exercised.

Some Important Principles of Physical Education

BY

F. WEBER, M.A., B.P.E.,
Director of Physical Education for India, Y.M.C.A.

PHYSICAL Education, like every well-established science or art, has certain more or less well-defined laws of procedure, or principles. These are the rules of guidance for the Physical Educator. They keep him steered in his rightful course. They serve him as the compass serves the mariner.

In the brief intensive course of Physical Education for teachers recently held in Hyderabad, the principles under review were brought into focus for particular emphasis. Some of these principles are allowed to stand on their own face value, *i.e.*, without any explanation; others are given some explanation; and others still are somewhat elaborated. They are offered below because it is hoped that they will be of some value to all and of considerable value to some.

1. The New Physical Education must fit the individual to the new age. Not muscular energy is needed but nervous energy; not muscular power but organic vigour.

2. The basic principle of life is movement. The complete cessation of movement is death. "Nature has no loaves for the loafers."

3. Function makes structure. Do, and you become.

4. Nature—Nurture. The seed and the soil. A 50-50 influence. The Eugenist for Nature; the Educationist for Nurture. The nature of the child is its total environment-home, parents, family

ERRATA.

Page 176 last line " accute " read " acute "
„ 178 from top line 17 " insure " read " ensure "
„ 181 „ bottom 4th line " an " read " the "
„ 186 „ „ 8th line " enducated " read " educated "
„ 193 last line " graded " read " gradual "
„ 194 from top 7th line " seems " read " serves "

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

PAGE

SOME IMPORTANT PRINCIPLES OF PHYSICAL EDUCATION BY F. WEBER, M.A., B.P.E., DIRECTOR OF PHYSICAL EDUCATION FOR INDIA, Y. M. C. A. 165

AN EXPERIMENT IN THE PROJECT METHOD OF TEACHING BY REV. L. SIMPSON, M.A., PRINCIPAL, WESLEYAN MISSION HIGH SCHOOL, SECUNDERABAD.... 173

POULTRY CULTURE IN SCHOOLS BY N. SHAW, B.A., ASSISTANT, METHODIST BOYS' HIGH SCHOOL, HYDERABAD-DECCAN 176

THE TEACHING OF ARITHMETIC AS A LOGICAL EXERCISE BY D. C. BHOGLE, B. A., B. T., ASSISTANT, MAHRATTI NORMAL SCHOOL, AURANGABAD 180

DENTAL HYGIENE IN SCHOOLS BY DR. B. G. BORGAONKAR, DENTAL SURGEON, SECUNDERABAD 185

ANOMALIES OF THE SCHOOL SYSTEM II BY K. NARAYAN RAO, B.A., L.T., ASSISTANT, GOVERNMENT HIGH SCHOOL, MEDAK 188

FINDINGS OF THE SUB-COMMITTEE ON PHYSICAL EDUCATION APPOINTED BY THE HYDERABAD TEACHERS' ASSOCIATION 190

THE FOURTH ANNUAL CONFERENCE OF THE ALL-INDIA FEDERATION OF TEACHERS' ASSOCIATIONS BY V. V. HARDIKAR, HEAD MASTER, VIVEK VARDHINI HIGH SCHOOL- HYDERABAD DECCAN 196

NOTES AND NEWS 205

REVIEW—"THE SOUTH INDIAN TEACHER".... 211

EDITORIAL 213

REGISTERED ASAFIA NO. 47.

Vol. III.] April, 1929 A. D. Khurdad, 1338 Fasli. [No. 4.

Under the Patronage of

Khan Fazl Mohamed Khan, Esq., M. A.,

Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab).

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1929.

Single Copy Annas 12. (Postage Extra)